مٹی کی خوشبو میں رچی بسی، زندگی کی بھٹی میں پکی تحریریں
دیہاتی بابو
اسد طاہر جپّہ

تخلیق کا ہنر کسی کی عطا ہے۔ اس حوالے سے اسد طاہر خوش قسمت ہیں کہ انھیں یہ ہنر عطا ہوا، وہ مثبت سوچ کے حامل ہیں۔ اپنی مٹی سے محبت اور وطنِ عزیز کے لیے کچھ کرنے کی دُھن۔ اسد طاہر ہمیشہ ہر اس قافلے میں شریک ہوجاتے ہیں جس کا مقصد خیر، نیکی اور بھلائی ہو۔ یہ ہمارا اعزاز ہے کہ انھوں نے اخوت کی رفاقت کا بھی حق ادا کیا۔ اپنی سرکاری مصروفیات اور سماجی خدمات کے ساتھ ساتھ اسد طاہر اپنی تحریروں کے ذریعے پاکستان کی مضبوطی و استحکام کے خواب دیکھتے ہیں۔ مختلف قومی و بین الاقوامی موضوعات پر ان کے مضامین انگریزی و اُردو اخبارات میں باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ آپ روایتی سرکاری بابُو کی بجائے قائداعظم کے فرمان کے مطابق امانت اور دیانت کے ساتھ کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمہ وقت، شب و روز اور موسموں کے سرد و گرم سے بے نیاز۔ چند روز ہوئے ان کے مضامین پر مشتمل ان کی پہلی کتاب ''دیہاتی بابُو'' کا مسودہ پڑھنے کو ملا۔ جب بھی کبھی چند لمحے میسر آئے میں ان کا مسودہ کھول کے بیٹھ گیا اور جو مضمون پڑھنا شروع کیا اسے ختم کر کے دم لیا۔ حُسنِ نظر، حُسنِ فکر اور پھر دُور اندیشی اور دردمندی۔ اس کتاب میں آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ معیشت کے اسرار و رموز، معاشرتی رویوں کے نشیب و فراز، دیہات کی سادہ و خوبصورت زندگی، شہروں کی چمک دمک اور ایک خوبصورت سماج کا طلوع ہوتا ہوا اُفق۔ اسد طاہر کے پاس ہر رنگ کا ہنر موجود ہے۔ تحریر کی چاشنی اور قاری کو ہم سفر اور ہم نوا بنانے کا انوکھا فن۔ ان کی ہمہ صفت شخصیت سے ابھی بہت کچھ متوقع ہے۔ خیر، نیکی اور بھلائی۔ ایسی ہی پُرتاثیر باتیں جو دل میں گھر کر جائیں اور ایک نئی صبح کی نوید بن کر دل پر دستک دیتی رہیں۔

ڈاکٹر محمد امجد ثاقب
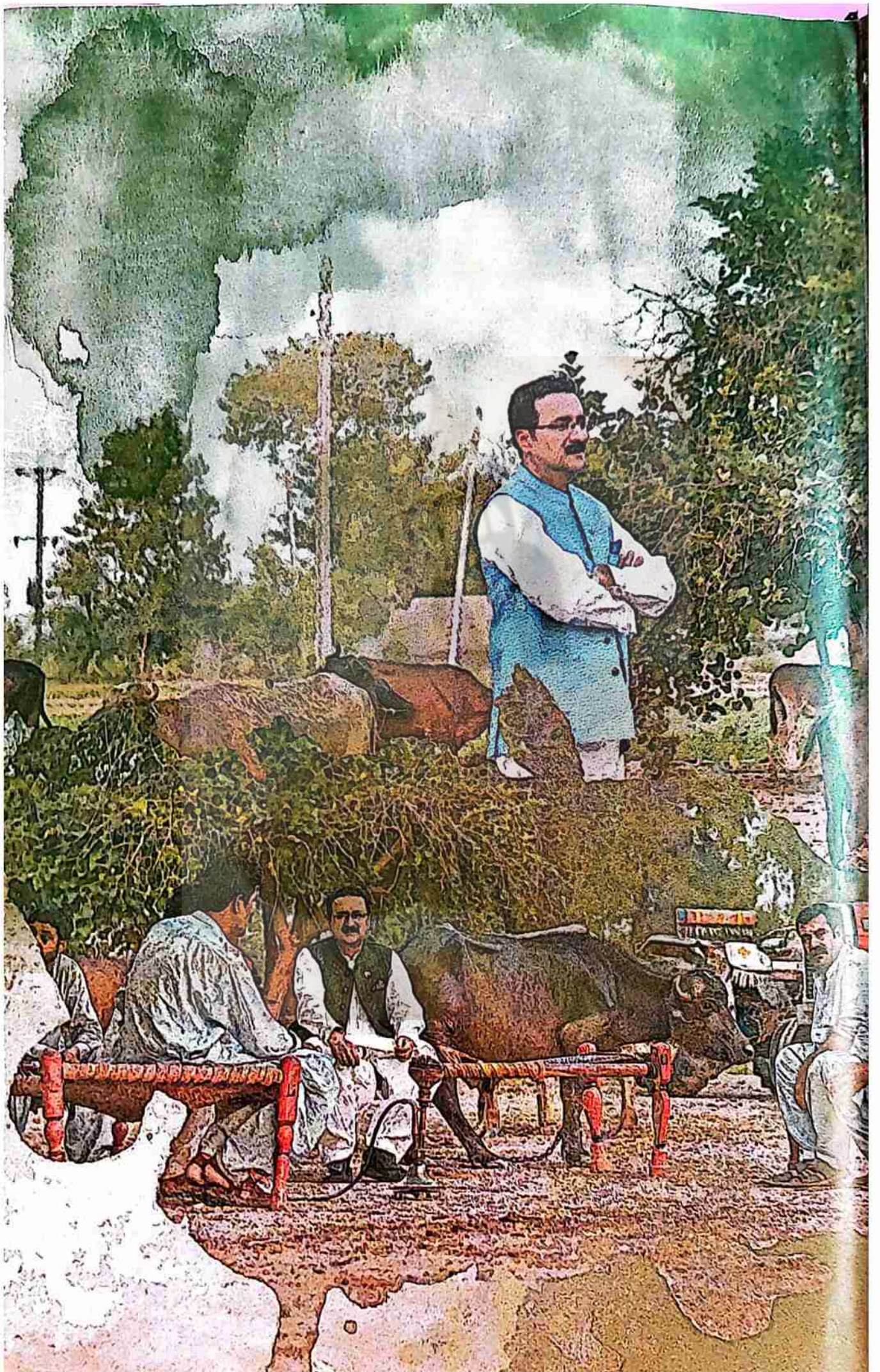
دیہاتی بابو
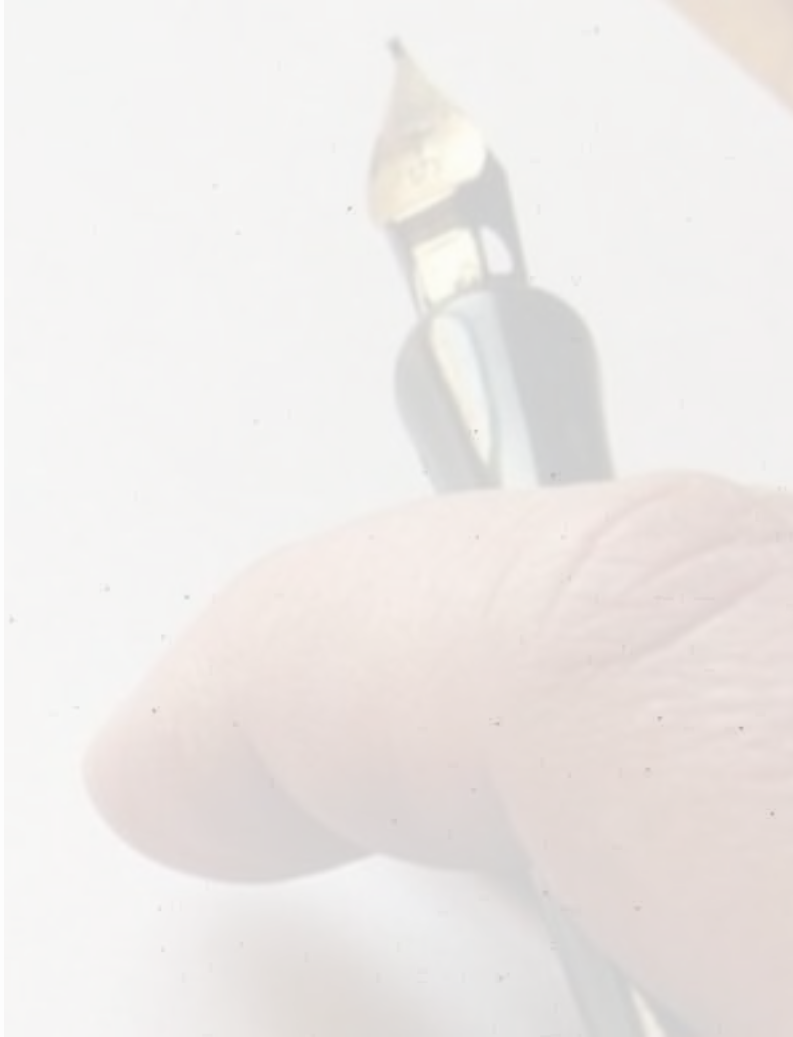
اسد طاہر جپّہ

مصنف کا سفر چنیوٹ کی مردم خیز دھرتی سے شروع ہوا۔ وہ اپنے علاقے کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کے سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بچپن سے ہی اپنی علمی وادبی صلاحیتوں سے آس پاس کے لوگوں کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ چنیوٹ سے شروع ہونے والا یہ سفر گورنمنٹ کالج لاہور کی عظیم درسگاہ سے فیض یاب ہوتا ہوا سول سروسز اکیڈمی تک جا پہنچا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں پوسٹ گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی اور فنِ تحریر و بیاں پر وہ ملکہ حاصل کیا کہ مدلل گفتگو اور مخصوص لہجہ ہی ان کا تعارف ٹھہرا۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز اپنے والدِ محترم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بطور لیکچرر کیا اور بعد از اں 1998ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے پولیس انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہو کر تربیت کے دوران ہی اپنے کورس کے سرخیل ٹھہرے۔ سی ایس ایس کر کے افسر شاہی کا حصہ بنے تو روایتی ''بابُو'' بننے کے بجائے مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ بھوانہ کے نواحی گاؤں سے تعلق رکھنے والا یہ خوش لباس اور خوش گفتار لڑکا ایک مختلف ''بابُو'' بن کر دنیا کے سامنے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منواتا چلا گیا۔ اسی دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی تو گویا قانون ان کے گھر کی باندی بن گیا۔ یورپ اور برطانیہ میں ذاتی اور سرکاری حیثیت سے پہنچے تو پاکستانی ہم وطنوں کے ساتھ ساتھ گوروں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ نائیجیریا میں مسلسل دو سال بین المذاہب کانفرنس میں بطور مقرر ایسی دلپذیر گفتگو کی کہ افریقہ کے تمام ممالک سے آئے ہوئے نوجوان انھیں اپنا روحانی گرو ماننے لگے۔ آدھی دنیا گھومنے اور متعدد بین الاقوامی اداروں سے ملازمت کی پُرکشش پیشکش کے باوجود وہ اپنی مٹی سے آج بھی عہدِ وفا کی پاسداری کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ اب یہی ''دیہاتی بابُو'' فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) کا ترجمان بن کر ادارے کا ''پوسٹر بوائے'' بن چکا ہے۔ ''اسد طاہر'' نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو حرمتِ قلم اور خیالات کی طہارت کا مکمل پاس رکھا۔ لوگوں کو گرویدہ کرنے کا فن اور پھر ان کا زاویۂ نگاہ بدلنے کا ہنر کوئی مصنف سے سیکھے۔ اپنے پُرتاثیر انداز سے گزشتہ بیس سال میں اب تک ہزاروں زندگیاں بدل چکے ہیں۔ ان کے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین اور سامعین ان کی گفتگو کے سحر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بے پناہ سرکاری ذمہ داریوں اور تخلیقی مصروفیات کے باوجود اپنے آبائی علاقہ میں تعمیری اور فلاحی کاموں کے لیے وہ عبادت کی طرح وقت نکالتے ہیں۔ وطنِ عزیز سے محبت کا یہ عالم کہ ان کے لباس پر سبز ہلالی پرچم ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ اس کتاب میں ان کے احساسات، جذبات اور ارادوں سے ملیں گے اور محسوس کریں گے کہ مصنف ایک ''دیہاتی'' لڑکے اور افسر شاہی کے ''بابُو'' کا حسین امتزاج ہیں۔

دیہاتی بابُو

مٹی کی خوشبو میں رچی بسی، زندگی کی بھٹی میں پکی تحریریں

اسد طاہر جپّہ

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

Dehaati Babu
by Asad Tahir Jappa
Jhelum: Book Corner. 2022
366p.
1. Essays - Urdu
ISBN: 978-969-662-446-2

بانی مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید
ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعت: جولائی 2022ء
کتاب: دیہاتی بابُو
مصنف: اسد طاہر جپہ
سرورق: محمد شکیل طلعت
تزئین و زیبائش: ابوامامہ
خطاط: احمد علی بھٹہ
کمپوزنگ وصفحہ سازی: عمر فاروقی
کتابت: نُوری نستعلیق، علوی نستعلیق
مطبع: مکتبۂ جدید پریس، لاہور
ناشر: بک کارنر
ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شورُوم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 · 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm · /bookcornershowroom · /bookcorner
bookcornerjhelum · info@bookcorner.com.pk

والدین کے نام

والدِ گرامی پروفیسر محمد انور خان چیمہ

جن کے افکار و اوصاف میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

والدہ ماجدہ جنّت انور چیمہ

جنھوں نے ہمیشہ خزاں رُت کے سارے دُکھ خود جھیلے

اور مجھے بہاروں کے حصار میں رکھا۔
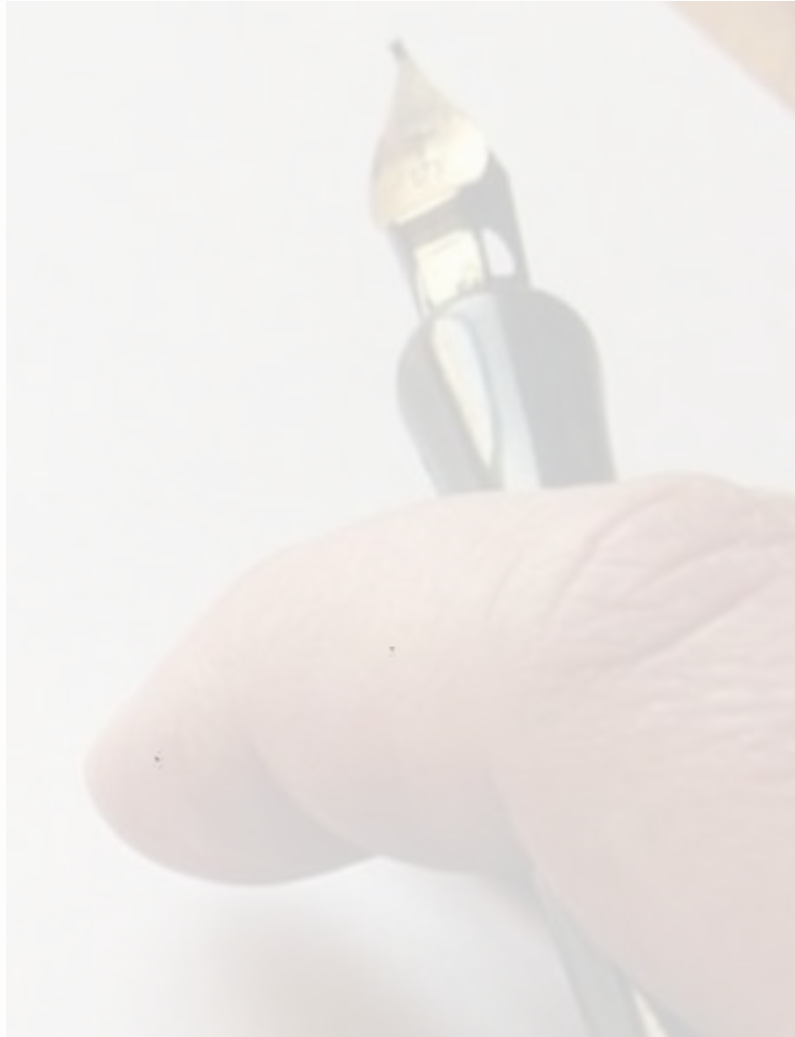
(اس کتاب سے حاصل ہونے والی آمدنی مستحق اور ذہین بچوں کی تعلیم پر خرچ کی جائے گی۔)

ترتیب

اسد طاہر جپہ کی تاثیر بھری نثر

صاحبِ تحریر ہنر مند ہو تو تحریر کمال ہو جاتی ہے ورنہ محض زوال کی تصویر۔ ہمارے بڑے بھائی اور سینئر اسد طاہر جپہ نثر میں اثر پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ نثر پارہ رواروی میں لکھا جائے تو روانی ناپید اور محبت سے لکھا جائے تو مطالعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مطالعیت کسی بھی نثر پارے کی رُوح سے کم نہیں۔ چاہے وہ ناول ہو یا افسانہ، کالم ہو یا خاکہ، مضمون ہو یا مکتوب، مطالعیت نہیں تو نثر پر نثار ہونے کو کچھ نہیں بچتا۔ اسد طاہر کے ہاں یہ عنصر جملوں میں گھلا ملا اور فقروں میں گندھا ہے۔ تاثیر انگیزی کی یہ صلاحیت خداداد ہے۔ کوشش نہیں عطا ہے، کاوش نہیں رضا ہے، خواہش نہیں دُعا ہے۔ عامیانہ تخلیقات کی اس تاریک رات میں روشنی بھری نثر کی سحر نمودار ہو تو آنکھیں خود بخود سکون پاتی ہیں۔

اسد طاہر کا موضوع معیشت ہو یا مُعاشرہ، اُنھیں مُشت بھر لفظوں سے مشامِ جاں کو مہکانا آتا ہے۔ شُماریات کے حوالے سے اعداد پر لکھنے والا بندہ تعداد کا گورکھ دھندا پیش کرے اور قاری تب بھی پڑھتا چلا جائے تو تحسین تو بنتی ہے۔ تحصیلِ محصولات کے مصروف شعبے سے جُڑے سرکاری افسر ہو کر بھی اس قدر باقاعدگی سے نثر نگاری بھی بڑا کام ہے۔

یہ تحریریں ایسی ہیں کہ آپ انھیں ان کے سیاق وسباق کے علاوہ بھی پڑھیے تو لطف دیں گی۔ان میں خشکی نام کو نہیں۔تر وتازہ لہجے میں بات سے بات نکلتی ہے اور موجوں کی روانی کے مانند بہتی چلی جاتی ہے۔کہیں کسی موڑ پر صاحبِ تحریر اصلاحِ معاشرہ کی تجویز بھی دینا چاہیں تو نصیحت کے طور پر نہیں، مشورے کے طور پر دیتے ہیں جو کہ اچھے نثر نگاروں کا خاصہ ہے۔اس خاصیت کے لیے اسد طاہر خصوصی مبارک کے مستحق ہیں۔

حالاتِ حاضرہ پر اُن کی نظر گہری ہے۔تبھی تجزیے میں تجربے کی آمیزش کر کے پیش کرتے ہیں۔صاحبِ مطالعہ شخص ہی اپنی عمیق اور وسیع سوچ سے ایسے گوہر پارے برآمد کر سکتا ہے۔بات میں ذات کا عنصر نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔اسد طاہر کے ہاں بات بنتی ہے اور خوب بنتی ہے۔مَیں اس کتاب کی اشاعت پر انھیں دِلی مبارک پیش کرتا ہوں اور دُعا گو ہوں کہ تخلیق کا جوہر اُن پر مہربان رہے اور وہ یونہی اپنی ذات کی تہہ میں چھپے تمام امکانات کو بروئے کار لاتے رہیں۔

رحمٰن فارس

پیش لفظ

آج سے چار دہائیاں قبل ہمارے گاؤں کے پرائمری سکول میں پلے گروپ اور نرسری کی بجائے ''کچی پہلی'' اور ''پکی پہلی'' دراصل جماعت اوّل سے قبل دو سال ''پری سکول'' کا زمانہ تھا۔ صبح سویرے کھاد کی بوری اور اس کے اندر پلاسٹک شیٹ، سکول کے بستے میں ڈال کر سکول جایا کرتے اور زمین پر موجود اپنی مخصوص جگہ پر قبضہ جمانا اولین ترجیح ہوتی تھی۔ فرنیچر کی عدم دستیابی کے سبب کھاد کی بوری اور اس کے نیچے بچھی ہوئی پلاسٹک شیٹ، سردی کے موسم میں زمین کی ٹھنڈک سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ زمین پر ہی املا لکھوائی جاتی۔ ایک روز میں اپنی ''پکی پہلی'' جماعت سے نکل کر اوّل کلاس کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ساری کلاس استادِ گرامی رانا غلام محمد مرحوم کی ہیبت ناک سرزنش کے سامنے سہمی کھڑی تھی۔ وہ پوری جماعت کی اردو املا کی غلطیوں پر سخت نالاں تھے۔ میں نے بڑے ادب سے انھیں پیشکش کی کہ میں املا کے وہ الفاظ لکھ کر دکھا سکتا ہوں۔ استادِ گرامی بہت حیران ہوئے اور مجھے زمین پر یہ تین الفاظ لکھنے کا حکم دیا۔ میں نے فوراً (نگہبان، مہربانی اور حفاظت) لکھ کر ان سے دادِ تحسین وصول کی جس پر انھوں نے مجھے پکی پہلی سے اوّل جماعت میں ترقی دے دی اور حکم صادر فرمایا کہ میں اپنا بستہ بوری لے کر اوّل جماعت

میں شامل ہو جاؤں ۔ زمانہ طالب علمی کے ابتدائی ایام کی یہ پہلی ''بڑی'' کامیابی مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یقیناً اس سے میرے حوصلے بلند ہوئے اور خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا۔

چونکہ والد محترم پروفیسر محمد انور خان کو اردو اور فارسی کے مضامین پر دسترس کے سبب مرزا غالب اور علامہ اقبال کے شعر و سخن پر کمال ملکہ حاصل تھا۔ علم و ادب سے ان کی گہری وابستگی مجھے بھی ورثے میں مل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جماعت پنجم کی الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تو چوتھی جماعت کی طرف سے نمائندہ تقریر کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔ ابا جان نے مجھے ایک جاندار تقریر لکھ کر دی جس کے جذباتی اشعار اور طلسماتی الفاظ نے واقعی اک سماں باندھ دیا اور یوں لوگوں کے سامنے خود اعتمادی سے گفتگو کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہ رہا۔

ہمارے گاؤں سے مڈل سکول سات کلومیٹر کے فاصلے پہ واقع تھا، جس کے لیے روزانہ چودہ کلومیٹر پیدل سفر کرنا معمول تھا۔ موسم کی شدّت، گرمی سردی، بادوباراں اور آندھی وطوفان کے امکاں سے بے نیاز، سیف انور بھائی اور میں گاؤں کے دیگر طلبہ کے ساتھ پگڈنڈیوں پہ بھاگتے ہوئے سکول پہنچ جاتے۔ اس زمانے میں جمعہ کو تعطیل ہوتی اور جمعرات کو آدھی چھٹی ہوتی تھی۔ اسمبلی کے فوری بعد بزمِ ادب کا پروگرام شروع ہو جاتا تھا جس میں تقریری مقابلہ، حُسنِ نعت و قرأت، بیت بازی، اقبالیات اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کے خوب مقابلے ہوتے تھے۔ سب سے دلچسپ مقابلہ بیت بازی کا ہوا کرتا تھا جس میں ''کچی پہلی'' اور ''پکی پہلی'' والے ننھے منے طلبہ بھی حمد اور نعت کے اشعار سنا کر اس کی خوبصورتی میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔ انہی ہفتہ وار ہونے والے بزمِ ادب کے بیت بازی کے مقابلوں میں سے ایک مقابلے میں مَیں پورے مڈل سکول میں اوّل آیا اور اس زمانے میں 70 روپے سے زائد رقم کے انعامات جیتنے میں کامیاب ہوا۔ مرزا غالب کی اک غزل کے اشعار ''ط'' پہ ختم ہوتے تھے جنھیں پڑھ کر میں نے مخالف ٹیم کو بے بس کر دیا اور یوں میں نے 160 سے زائد اشعار سنا کر وہ مقابلہ جیت لیا۔ اس منفرد بیت بازی کے اعصاب شکن مقابلے کی تیاری میں ابا جان نے مجھے مرزا غالب، علامہ اقبال، ساغر صدیقی اور

احمد ندیم قاسمی کے کلام سے بھرپور آشنا کروا دیا اور مشکل حروفِ تہجی پر مبنی اشعار اور تلفظ پر خصوصی توجہ دینے کی ہدایات دیں۔ میرے مقابلہ جیتنے پر وہ بہت خوش ہوتے اور انھوں نے برملا کہا کہ میں ہی ان کے علمی و ادبی ورثے کا وارث بنوں گا۔

اسی نسبت سے مجھے اپنے والدِ گرامی سے بے پناہ محبت تھی اور وہ میری آئیڈیل شخصیت تھے۔ وہ ہمیشہ ہمارے لیے بڑے خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں کی تعبیریں اور ان سے جڑی ہوئی کامیابیاں ہمارے ساتھ شیئر بھی کرتے رہتے۔ ان کے تین بڑے خوابوں میں پہلا خواب یہ تھا کہ ہم ساتوں بھائی گورنمنٹ کالج لاہور جیسی عظیم مادرِ علمی سے تعلیم پائیں۔ دوسرا خواب ہم بھائیوں کا سول سروس جوائن کرنا تھا۔ چونکہ اپنے علاقے سے انھیں بے پناہ پیار تھا اس لیے دھرتی ماں سے سچا عشق رکھنے کے سبب وہ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر اپنے مقامی لوگوں کی غربت اور پسماندگی کے خاتمے کے لیے ایک بہترین تعلیمی ادارہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ مگر ربّ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا جب ستمبر کی ایک شام انھیں دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے، یوں وہ اپنے خوابوں سمیت منوں مٹی تلے جا سوئے۔ اس طرح میں بہت ہی کم عمری میں اپنے والدِ گرامی کے سایۂ الفت سے محروم ہو گیا مگر ان کے بلند پایہ خوابوں کو مشعلِ راہ بنا کر زندگی کے پُرپیچ راستوں کی خاک چھاننے لگا۔ سفر لمبا، صبر آزما اور انتہائی کٹھن تھا۔ ان خوابوں کی تعبیریں کہیں دور محض چشمِ تصور میں دکھائی دیتیں۔ کبھی ایک دھندلی سی تصویر بنتی اور پھر فوراً آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ مگر کارِ جہاں میں جہدِ مسلسل، عملِ پیہم اور صدقِ دل کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کامیابی کی طرف سفر جاری رکھا اور یوں چنیوٹ کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولنے والا دیہاتی لڑکا اپنے مرحوم باپ کے بڑے خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈتا سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے بالآخر بابُو بن گیا۔ مگر روایتی بابُوؤں کے برعکس میں نے دھرتی ماں سے اپنا گہرا تعلق ختم نہیں کیا۔ اپنی جڑوں کو کمزور نہیں ہونے دیا بلکہ ان سے نمو پائی۔ اپنے گاؤں اور اس کے باسیوں سے تعلق کو مزید مضبوط بنایا اور کبھی بابُو پن کو اپنے لوگوں سے

گہری وابستگی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ زمین سے اس گہرے اور مضبوط رشتے نے نہ صرف مجھے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے بلکہ پورے انہماک اور بے مثال جذبے سے سرشار ہو کر ملکِ پاکستان کے لیے کچھ بڑا اور منفرد کر دکھانے کے لیے طاقت بخشی۔ یہی رشتہ میری تحریروں میں ارضِ پاک سے بے پناہ محبت اور غیر مشروط وفا کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔ چند احباب مجھ سے میری تحریروں میں معاشرے سے شکایتی رویہ نہ اپنانے پر شکایت کرتے ہیں۔ انھیں اعتراض ہے کہ میری تحریروں میں باغِ تمنا کے خوش رنگ پھول کیوں کھلتے ہیں۔ امید و آرزو کی بلبلیں نغمہ سرا کیوں ہیں۔ حسرت و یاس کی بجائے زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کیوں مچلتی نظر آتی ہے؟ میں ہمیشہ مسکرا کر کہا کرتا ہوں کہ میں ربّ کی رحمت سے مایوس ہونے والوں میں سے نہیں۔ میں دھیمی طبیعت کا انسان ہوں اور غور و فکر کر کے منطق کی رو سے نتائج نکالنا، مسائل سے زیادہ حل پر توجہ دینا میری پرانی عادت ہے۔ لہٰذا محض مرچ مسالہ کے لیے تند و تیز لہجہ اپنانا میری فکری تربیت کے منافی ہے۔

گزشتہ پچیّس سال میں کارِ سرکار کی انجام دہی کے دوران تجربات اور مشاہدات نے جہاں میری تحریروں میں عملی زندگی کی تمام سچائیوں کا احاطہ کیا ہے، دوسری جانب میرے روحانی پیشوا پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی اور ان کے چہیتے شاگردِ خاص جیدی میاں کے تند و تیز مگر فکر انگیز مکالموں نے مجھے ہمیشہ مشکل موضوعات کے ساتھ انصاف برتنے میں آسانی فراہم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری تحریروں میں آپ کو کہیں عالمی و علاقائی امور کا منظرنامہ نظر آتا ہے تو کہیں روحانیت کے کٹھن مراحل کا پتہ ملتا ہے۔ کہیں معاملات ہیں تو کہیں سماجی کج رویوں کے نشانات۔ کہیں ایف بی آر کے ٹیکس کلچر کی باتیں ہیں تو کہیں گہرے فکری مسائل پر ''بابا جی'' کی مدلل گفتگو۔ جہاں میں ہر تحریر میں منفرد موضوع کا جہان آباد کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہیں اپنے قاری کے لیے کچھ خاص پیغام کا اہتمام بھی کرتا ہوں۔ ہر پاکستانی کے لیے ان تحریروں میں کچھ نہ کچھ زادِ راہ ضرور ہے، شرط بس ذہن کے در وا کرنے کی ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ بصارت سے بصیرت تک کے سفر میں کئی ماہ وسال گزرتے ہیں۔ لوحِ خیال پر کئی امکان مچلتے ہیں، چشمِ تصور میں اَن گنت نقش ابھرتے ہیں، مٹتے ہیں۔ بے شمار تحریروں کی کلیاں کھلتی ہیں، مرجھا جاتی ہیں۔ جنھیں تخلیقی صلاحیتوں کے بے پایاں خزانوں سے مالا مال کیا جاتا ہے، الفاظ کے چناؤ اور خیال کے رچاؤ کی نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے ان پر ان انعامات خداوندی کا قرض واجب الادا رہتا ہے۔ انہی خوش نصیبوں کے کاسۂ سر میں کائنات سے کائنات تک کے سفر کی سہولت فراہم کر دی جائے تو پھر اس کا حساب لیا جاتا ہے کہ صاحب! تمھیں جو عطا کیا گیا اس میں سے تم نے کتنا بانٹا، کہاں خرچ کیا اور کیسے تقسیم کیا۔ ہر قدم اک امتحان، اور ہر لحظہ اک آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ جنھیں الفاظ کی تاثیر اور خیالات کی تصویر کے سبب مسندِ توقیر ملی ہو، انھیں نہ صرف اپنے الفاظ کی حرمت کا تحفظ یقینی بنانا پڑتا ہے بلکہ فکری طہارت کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے تا کہ اپنے قاری تک اس عطائے خداوندی کی امانت کو پوری دیانت سے پہنچایا جا سکے۔ یہی خیال تو میرے درِ دل پر بھی مستقل دستک دیئے جاتا ہے کہ اگر مجھے پنجاب کے ایک پسماندہ علاقے سے اٹھا کر ملکی سطح کے بڑے وفاقی ادارے میں اہم عہدے سے نوازا گیا ہے تو یقیناً یہ عطائے ربِ کریم بے سبب نہیں۔ کچھ بڑا مقصد ہے، کوئی عظیم منصوبہ بندی ہے جس کی تکمیل کے لیے میرے ٹوٹے ہوئے الفاظ قومی سطح پر میڈیا کی زینت بنتے ہیں اور جن میں موجود میرے افکار اگر قارئین و ناظرین کے لیے کوئی امید کا پہلو چھوڑ جاتے ہیں تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو فکر و استدلال کی ہلکی آنچ پہ رکھ کر قومی و بین الاقوامی معیشت و معاشرت کا عمیق جائزہ لے کر ناممکنات کی کوکھ سے امکانات پیدا کرنے کی تدبیریں کشید کی ہیں۔ فکر و فن کی یہی ریاضت میرا سرمایۂ حیات بھی ہے اور اس دیہاتی بابو کی بے ساختگی، سادگی اور فطری حُسن کی ضامن بھی۔

قارئین کرام، میری یہ تحریریں اپنی دھرتی ماں کی مٹی کی خوشبو میں رچی بسی ہیں اور عملی زندگی کی بھٹی میں پک کر صفحۂ قرطاس پر الفاظ کی چادر اوڑھے منتقل ہوئی ہیں۔ یہ الفاظ خیالات بن کر

میرے ذہن میں رہتے تو خام تھے مگر میں نے خام کو کام میں لانے کے لیے یہ امانت پوری دیانت سے آپ کے سپرد کر دی ہے اور اب میں ایسے مطمئن ہوں جیسے کوئی قرض چکا کر راحتِ قلبی سے سرشار ہوتا ہے۔ آپ کی قیمتی آرا اور بے لاگ تبصرے یقیناً میرے اطمینان کے دائرے کو مزید وسعت عطا کریں گے۔

آپ کی بے پناہ محبتوں کا طلبگار!

اسد طاہر جپّہ

ڈائریکٹر میڈیا/ترجمان ایف بی آر

اسلام آباد

ای میل: asadjaps@gmail.com

واٹس ایپ: 0300-4634633

اظہارِ تشکر

اس وقت دیہاتی بابُو اشاعت کے مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بلاشبہ اس کتاب کو حرف حرف سوچا گیا اور کئی ماہ وسال کی جہدِ مسلسل کے بعد یہ خواب حقیقت بن سکا۔ لیکن اسے ممکن بنانے میں بہت سے محبت کرنے والوں کی دعائیں، حوصلہ افزائی اور لطیف جذبے شامل ہیں۔ سب سے پہلے میں ثمینِ قلب سے رب ذوالجلال کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے لکھنا سکھایا اور اپنی بے پایاں عنایات کی بدولت بندگی اور سکون وعافیت کا احساس بخشا۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے خاص فضل وکرم کے سبب میرے الفاظ میں تاثیر کے امکانات روشن ہوئے۔ یہ بات سچ ہے کہ اظہارِ تشکر کے لیے سب کے نام لکھنا چاہوں تو صفحات کم پڑ جائیں لیکن چند اہم شخصیات کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔

بیوروکریسی کی مصروف زندگی کے ساتھ فکری ریاضت کی اس مشقت میں میری شریکِ حیات نے اپنے حصے کا وقت بھی میری تخلیقی کاوشوں کی جھولی میں ڈال کر مجھے آزمائش سے بچائے رکھا اور ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ ان عنایات کے لیے شمائلہ وحید آپ کا بے حد شکریہ۔ میں اپنے جگر گوشوں ایمان انور، شایان انور اور ریان انور کی آنکھوں میں اس چمک کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا

جس سے میری زندگی میں چہار سو روشنی پھیلی ہے۔ میں تہہ دل سے ممنون ہوں اپنے بھائیوں اور بالخصوص بڑے بھائی سیف انور جپہ کا جو زندگی کی کڑی دھوپ میں میرے لیے گھنے سایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بچپن سے لے کر اب تک زندگی کا حصہ بننے والے ان تمام دوستوں اور رفقائے کار کا شکریہ جو میری خوشی میں مجھ سے بڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس معاملے میں بے حد خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ میرے قارئین نہ صرف میری تحریروں کو پورے انہماک سے پڑھتے ہیں بلکہ مجھے اپنی قیمتی آرا سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔

آخر میں بصد احترام شکر گزار ہوں بُک کارنر جہلم کے روحِ رواں امر شاہد اور گگن شاہد کا جنھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے میری تحریروں کو ''دیہاتی بابُو'' کی صورت میں شائع کر کے آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ دونوں بھائی یقیناً اس شاندار کارکردگی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اسد طاہر جپّہ

قرض چار پھولوں کا

مغربی معاشرہ خاندانی نظام کی دولت سے کب کا محروم ہو چکا اس لیے وہاں والدین اور اولاد کا ایک واجبی سا تعلق اور رسمی سا اہتمام موجود ہے۔ بلوغت کے ساتھ ہی بچے والدین سے مکمل آزاد ہو جاتے ہیں اور بڑھاپے میں وہ اپنے والدین کو اولڈ ہومز کے سپرد کر دیتے ہیں جہاں وہ اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دیتے ہیں۔ عام طور پر بچے اپنے والدین کو سال میں ایک آدھ بار ملنے جاتے ہیں، اُن کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لے جاتے ہیں اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کر واپس آجاتے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ مدرز ڈے اور فادرز ڈے مناتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے معاشرے میں خاندانی نظام آج بھی ہماری طاقت ہے جہاں کم از کم تین نسلیں اکٹھی رہتی ہیں، لہٰذا ہم اپنے غم اور خوشیاں بانٹ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر دن، ہر لمحہ، ہر گھڑی ماں باپ کی خدمت، اطاعت اور تابعداری میں گزرتی ہے تو ہمارے لیے ہر ایک دن مدرز ڈے بھی ہوتا ہے اور فادرز ڈے بھی۔ اس کے باوجود باقی دُنیا کی طرح ہمارے ہاں بھی مئی میں مدرز ڈے تو جون میں فادرز ڈے منایا جاتا ہے۔

ہر سال کی طرح گزشتہ دنوں فادرز ڈے آیا تو ایک روز قبل ہی میرے تینوں بچوں نے

ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسر شروع کر دی اور اُن کی سرگوشیاں بتدریج بڑھنے لگیں۔ وہ اپنے انداز میں چھوٹے چھوٹے کارڈ ڈیزائن کرتے ہیں اور اُن پر مجھ سے محبت کے بڑے بڑے دعوے اور وعدے رقم کرتے ہیں، میری تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے اپنے دستخط کر کے رات بارہ بجے مجھے پیش کرتے ہیں۔ بات صرف یہاں پہ ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ رقم اکٹھی کرتے ہیں اور میرے لیے تحائف کے علاوہ ایک عدد کیک بھی لاتے ہیں۔ کیک کاٹا جاتا ہے تو میں صرف کاٹتا ہوں، کھاتے وہی ہیں اور شوق سے کھاتے ہیں۔ تینوں بچوں میں بڑی بیٹی اپنے کارڈ پر بڑی سنجیدہ عبارت لکھتی ہے اور پینٹنگ میں اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ سرگوشیاں اس لیے کرتے ہیں کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو اور وہ سارا اہتمام کر کے مجھے سرپرائز دیں۔ میں بھی انھیں یہی محسوس کرواتا ہوں کہ جیسے میں واقعی اُن کے جملہ انتظامات سے بالکل بے خبر ہوں تاکہ وہ اپنے سرپرائز کو مکمل طور پر انجوائے کر سکیں۔ مگر اس بار فادرز ڈے پر میں نے انھیں سرپرائز دیا۔ رات کیک کاٹنے اور تحائف کی وصولی کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ اگلی صبح ہم سب گاؤں روانہ ہوں گے اور وہاں ان کے دادا کی قبر پر حاضری دیں گے، پھول چڑھائیں گے، دعا کریں گے اور کچھ وقت قبرستان میں ابا جان کے ساتھ گزاریں گے۔ سب حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی مگر میرے فیصلے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے آیا تو پینتیس سالہ یتیمی کا گھاؤ جیسے اک بار پھر دل میں باپ کی محرومی کے الاؤ بھڑکانے لگا۔ ستمبر 1986ء کی وہ خوفناک رات اور اُس کے دردناک لمحات جس میں ہمارا باپ ہمیشہ کے لیے دارِ فانی سے چلا گیا اور محض چند لمحات میں ہماری جنت نظیر دُنیا اجڑ کر رہ گئی اور باغِ تمنا کا پُر بہار موسم یکسر خزاں میں بدل گیا۔ اپنے عہد کے معتبر ناموں میں سے ایک بڑا نام اور اُردو، فارسی پڑھانے میں پنجاب کے پروفیسرز میں یکتا مقام رکھنے والے والدِ گرامی صرف اکاون برس کی عمر میں اپنے سارے خواب ہمارے حوالے کر کے ربِ کریم کے حکم کے سامنے جبینِ نیاز جھکائے عالمِ ارواح جا پہنچے۔

ہماری لاڈ پیار سے بھری زندگی لمحات میں غم اور بے بسی کی تصویر بن گئی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے، وضو کیا، نوافل ادا کیے اور اپنے والد کی پسندیدہ سورہ مزمل کی تلاوت کی اور اُن کی مغفرت کی دُعا کر کے سو گیا۔

اگلی صبح ہم سب تیار ہو کر تقریباً نو بجے گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھر سے نکلتے ہی ڈھیر سارے پھول خریدے اور براستہ موٹروے پینسرہ انٹرچینج جا اُترے۔ اس کے بعد جھنگ فیصل آباد روڈ پر لگ بھگ پندرہ کلومیٹر کی مسافت کے بعد بھوانہ کی طرف مڑ گئے اور وہاں سے ٹھیک بیس کلومیٹر کے بعد ہمارے آبائی گاؤں سے پانچ سو گز پہلے قبرستان آتا ہے جو ہم سب کی آخری آرام گاہ ہے اور وہیں ہمارے والدِ گرامی کی قبر ہے۔ راستے میں تینوں بچوں نے کافی سوالات پوچھے اور اُن میں سے چند اہم سوالوں کے جواب بھی مانگے۔ بیٹی نے دریافت کیا ''آپ کی کامیابی میں دادا جان کا کیا کردار ہے کیونکہ وہ بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے؟'' میں نے اُسے وضاحت سے سمجھایا کہ کس طرح وہ ہمارے لیے ایک رول ماڈل تھے، کیسے انھوں نے سینکڑوں شاگردوں کو مالی معاونت کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دلوائی، کس طرح وہ ہمارے لیے بڑے بڑے خواب دیکھا کرتے اور ہمارے ساتھ اُن کا اظہار بھی فخر سے کیا کرتے تھے۔ بڑے خواب ہی دراصل بڑی کامیابی کا راستہ ہموار کرتے ہیں اور ہمیں جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کا پیکر بناتے ہیں۔ میں نے اسے ابّا جان کے تین بڑے خواب بتائے جنھیں ہم سب بھائیوں نے پورے خلوص اور سچائی سے پورا کیا اور آج وہ سارے خواب ہم جی رہے ہیں، تو ہمیں اپنے والد محترم کی بلند پایہ سوچ پر فخر ہے۔ اُن کا پہلا خواب ہمارا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ تھا تو ہم سات میں سے چھ بھائی راوین بنے اور لگ بھگ بیس سال مسلسل ہم گورنمنٹ کالج لاہور جیسی عظیم درسگاہ کے در و دیوار سے جڑے رہے۔ اُن کا دوسرا بڑا خواب ہمارا پاکستان کی اعلیٰ ترین سول سروس میں شمولیت تھا جسے ہم نے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے اور اپنی والدہ کی بے پناہ دعاؤں کے سبب پورا کیا۔ والدِ محترم کا سب سے بڑا خواب اپنے پسماندہ علاقہ بھوانہ کے ہونہار بچوں کے متعلق تھا اور

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر وہاں ایک شاندار تعلیمی ادارہ بنائیں گے اور اس مٹی کا قرض چکائیں گے۔ بچوں کو بین الاقوامی معیار کی تعلیم وتربیت دے کر انھیں ایک باوقار زندگی گزارنے کے لیے مواقع فراہم کریں گے۔ اُن کے نزدیک مقامی بچوں میں بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں، صرف مواقع نہیں تھے۔ اُن کے اس خواب کو بھی ہم نے مکمل کیا اور سات سال قبل والدین کے نام سے منسوب ادارہ قائم کیا گیا۔ اس طرح ہماری کامیابی میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اپنی والدہ کی دعاؤں کے بعد سب سے کلیدی کردار ہمارے مرحوم والد کے اُن بڑے خوابوں کا ہے جن کو عملی حقیقت بناتے بناتے ہم یہاں تک آن پہنچے ہیں۔ تینوں بچے میری باتیں غور سے سنتے رہے اور یوں ہمارا سفر بھی مکمل ہو گیا۔ اب ہم اپنے گاؤں کے قبرستان کے سامنے آن پہنچے، گاڑی سے اُترے اور پھول کی پتیاں لیے ابا جان کی آخری آرام گاہ پر حاضر ہو گئے۔

ہمیں دیکھتے ہی قبرستان کے مجاور بالٹیوں میں پانی بھر لائے۔ میں نے قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر بوسہ لیا، پانی سے قبر کی ٹائلز پر جمی مٹی کو صاف کیا اور مکمل صفائی کے بعد اپنے تینوں بچوں کے ساتھ گلاب کی پتیاں ڈال کر ساری قبر کو پھولوں سے لاد دیا۔ میں نے قرآنِ پاک سے تلاوت کی تو بچوں نے اپنے اپنے انداز میں دعائیں مانگیں۔ میں دعا مانگنے لگا تو میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں نے دیکھا تو تینوں بچے اپنے اپنے آنسو روکنے میں مصروف تھے۔ چھوٹے بیٹے نے اپنا سب سے اہم سوال محفوظ رکھا ہوا تھا، کہنے لگا ''مجھے پتہ ہے آپ پہلے بھی پھول لے کر دادا جان کے پاس آتے ہیں لیکن آج ہمیں کیوں ساتھ لے آئے؟'' میں نے ابا جان کے پہلو میں موجود خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ جب میں مر جاؤں گا تو اس جگہ میری قبر ہوگی، پھر آپ تینوں بہن بھائی اپنے دادا کی قبر کے ساتھ میری قبر پر بھی پھول ڈالنے آیا کرنا کیونکہ اولاد پر والدین کا آخری قرض دعائے مغفرت کے علاوہ چار پھول ہی تو ہوتے ہیں۔ وہ پریشان ہوا اور فوراً میرے ساتھ لپٹ کر کہنے لگا کہ ہم نے آپ کو مرنے ہی نہیں دینا۔ میں نے اُس کے ماتھے پر

بوسہ دیا اور کہا ''تم ابھی بہت چھوٹے ہو، زندگی اور موت کی آنکھ مچولی بھلا تمھاری سمجھ میں کہاں آئے گی، آؤ تمھاری دادی اماں گاؤں میں کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔'' شہرِ خموشاں کے مکینوں کو الوداعی سلام کیا تو ساغر صدیقی کا یہ شعر یاد آ گیا...

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

□□□
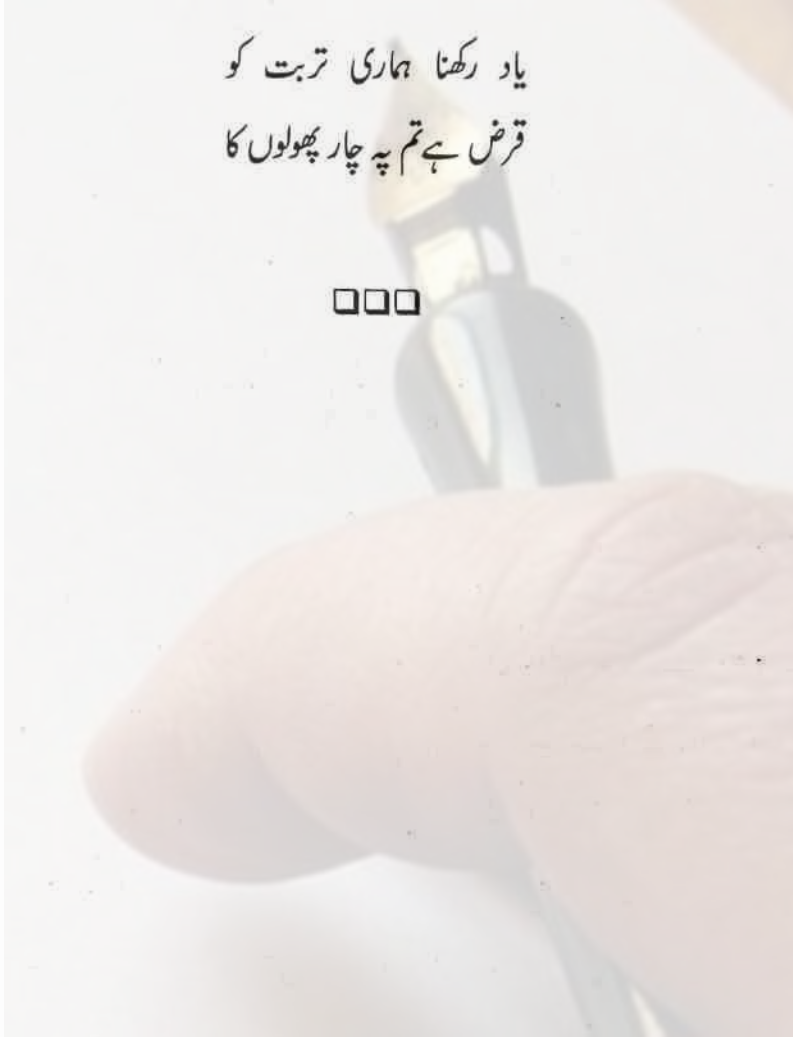
ہم ٹیکس کیوں دیں؟

یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے کہ افراد ہی اقوام کی تقدیر کے معمار ہوتے ہیں اور ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ بن کر عالمی افق پر پوری آب و تاب سے چمک کر اپنی روشنی سے نہ صرف اپنے ملک و قوم کی پہچان بنتا ہے بلکہ انسانی زندگیوں میں آسودگی اور خوشحالی کا باعث بھی بنتا ہے۔ جب قوم کا ہر شخص اپنے اندر احساسِ ذمہ داری اور قومی جذبہ اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ قوم عالمی برادری میں عزت اور افتخار کی دولت سے سرفراز ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو پہچانتے ہوئے امریکی تاریخ کے سب سے کم عمر منتخب ہونے والے صدر جان ایف کینیڈی نے اپنے پہلے صدارتی خطاب کے دوران اپنی قوم کو للکارتے ہوئے کہا تھا ''مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ یہ ملک آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے بلکہ یہ پوچھیں کہ آپ اس ملک کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' قومی ذمہ داری اور انفرادی شعور کا کلیدی کردار ہی دراصل کسی بھی قوم کو عظیم سے عظیم تر بنانے کا نسخۂ کیمیا ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی

کہ ہماری معیشت کی مضبوطی اور استحکام کے لیے محصولات کا بڑھنا اور ان میں مسلسل اضافہ لازمی امر ہے، ہم اپنے حصے کا ٹیکس ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں سجی محفلِ یاراں ہو یا کسی چوک چوراہے میں ہونے والی گفتگو، کوئی علمی مباحثہ ہو یا آپس کی غیر رسمی بات چیت، ہر موقع پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ہم ٹیکس کیوں دیں؟ آخر حکومت ہمارے لیے کرتی ہی کیا ہے اور کون سی سہولتیں وہ ہمیں فراہم کر رہی ہے کہ ہم قومی خزانے میں اپنا حصہ ڈالیں اور اپنی آمدنی سے ٹیکس ادا کریں؟ مجھے تعلیمی اداروں، تاجر تنظیموں اور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی مختلف تقریبات اور سیمینارز میں گفتگو کے لیے مدعو کیا جاتا ہے اور متذکرہ بالا سوال ہمیشہ میرے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ میں سرکاری حیثیت میں حکومتِ وقت کی نہ تو نمائندگی کر رہا ہوتا ہوں اور نہ ہی ترجمان کی ذمہ داری سرانجام دیتا ہوں بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں ان کے سامنے چند معروضات رکھ کر اس اہم سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے سرکاری سکولوں میں تعلیم بالکل مفت ہے اور انھی اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ و طالبات آج بھی سول سروس سے لے کر ڈاکٹرز، انجینئرز اور دیگر شعبہ جات میں پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں جبکہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں سکول لیول پر ہزاروں اور کالج و یونیورسٹی لیول پر لاکھوں روپے فیس ادا کرنا پڑتی ہے جبکہ عالمی رینکنگ میں آج بھی پاکستان کی صفِ اول کی درسگاہ قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد ہے جہاں درس و تدریس کے اعلیٰ معیار کے علاوہ سائنسی تحقیق پر قابلِ تحسین توجہ دی جاتی ہے۔ شعبۂ صحت میں دیکھیں تو ہمارے سرکاری ہسپتالوں میں روزانہ کی بنیاد پر ہزاروں مریضوں کے مفت علاج معالجہ کے علاوہ آپریشن اور قیام و طعام کی سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں جبکہ خدانخواستہ آپ یا آپ کے کسی عزیز کا واسطہ کسی بھی پرائیویٹ ہسپتال سے پڑ جائے تو چند ایام کے علاج کے بعد لاکھوں روپے کا بل آپ کے ہاتھ تھما دیا جاتا ہے۔ اگرچہ پولیس کی کارکردگی پر بے پناہ سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں مگر پھر بھی، کیا آپ رات کو موٹروے یا قومی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے گشت پر مامور پولیس کی گاڑی اور

اس پر جگمگاتی اور دور سے نظر آنے والی نیلی بتی دیکھ کر اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کرتے؟ کیا آپ کے بچے یہ دیکھ کر اطمینان کا اظہار نہیں کرتے؟ کیا یہ بھی درست نہیں کہ بے ہنگم ٹریفک کو منظم انداز میں رواں دواں رکھنے والا محض ایک کانسٹیبل اگر چوک میں موجود نہ ہو تو وہاں آناً فاناً طوفانِ بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ آپ کا بچہ محض چند ہزار خرچ کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج جیسے عالمی معیار کے ادارے سے ڈاکٹر بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ یہی ڈگری کسی بھی نجی میڈیکل کالج میں ایک کروڑ سے بھی زائد رقم خرچ کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی حال ڈینٹیسٹری، انجینئرنگ اور دوسری پیشہ ورانہ تعلیم کا ہے۔ ملک بھر میں موٹروے کی سہولت کے علاوہ قومی شاہراہیں، پبلک ٹرانسپورٹ، ہوائی اڈے، بندرگاہیں، پارکس، سیر و سیاحت کے مقامات، سٹیڈیم اور دیگر سرکاری املاک اور ان پر اٹھنے والے اخراجات، یہ سب کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟ یہ سب آپ کے ادا کردہ ٹیکسز سے ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ اس کے علاوہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے پناہ گاہیں، لنگر خانے، بیت المال اور زکوٰۃ کے نظام سے بھی لاکھوں افراد مستفید ہوتے ہیں۔ ہاں! یہ بھی حقیقت ہے کہ ان جملہ سہولتوں میں اضافے اور بہتری کی گنجائش ہمیشہ سے موجود رہی ہے اور آج بھی ہے مگر اس کے لیے زیادہ رقوم درکار ہیں اور ہمیں قومی تعمیر و ترقی کے عمل میں تیزی اور بہتری لانے کے لیے اپنے وسائل اور آمدن کے مطابق ٹیکس ادا کرنا ہے، تبھی ہم وطنِ عزیز کو خوشحال، خودمختار اور خوددار بنا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری مشرقی اور مغربی سرحدیں ہمیشہ سے ہی ہماری قومی سلامتی اور داخلی استحکام کے لیے خطرات کا باعث بنتی رہی ہیں اور مسئلہ کشمیر کے پُرامن حل تک ہم کبھی بھی اپنی دفاعی طاقت اور حکمتِ عملی پر سمجھوتا نہیں کر سکتے اور نہ ہی قومی ترجیحات میں دفاعِ پاکستان کی بنیادی حیثیت کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ آبادی اور عسکری طاقت میں ہم سے کئی گنا بڑا دشمن ملک اپنے تمام تر مذموم ارادوں اور ناپاک سازشوں کے باوجود ہماری جغرافیائی اور نظریاتی

سرحدوں کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکا اور آج الحمدللہ پاکستان ایک ایٹمی قوت کی حیثیت سے پوری مسلم امہ میں عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ اندرونی خطرات اور ملک دشمن عناصر سے نمٹنے کے لیے ہماری مسلح افواج، پاکستان رینجرز اور پولیس کے جوانوں اور افسران نے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے ہیں تا کہ ہم پاک سرزمین پر آزادی کے ساتھ پُرامن زندگیاں گزار سکیں۔ ان شیر جوانوں نے ہمارا کل محفوظ بنانے کے لیے اپنا آج قربان کر دیا اور عظیم ماؤں کے سجیلے جوانوں نے اپنے خونِ جگر سے ہمارے پیارے وطن کی آبیاری کی۔ یہ جذبہ ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے اور ان شہیدوں کی امانت بھی۔ لہٰذا اپنے قومی پرچم کو ہمیشہ سربلند رکھنا ہماری اجتماعی قومی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے ہمیں آگے بڑھنا ہے اور قومی معیشت کو اندرونی اور بیرونی قرضوں کے بوجھ سے نکالنے کے لیے اور معاشی خودانحصاری حاصل کر کے کشکولِ گدائی توڑنے کے لیے قومی خزانے میں اپنے حصے کا ٹیکس جمع کرانا ہے۔ وطنِ عزیز کی اس سے بڑی خدمت کوئی اور نہیں ہوسکتی اور نہ ہی حب الوطنی کے اظہار کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے۔

اس ساری گفتگو کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس ملک میں ٹیکس ادا کرنے والے لوگ موجود نہیں، ایسا نہیں ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ملک میں ٹیکس فائلرز کی تعداد 15 لاکھ سے بڑھ کر 29 لاکھ ہوگئی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ جاری ہے۔ ایف بی آر نے گزشتہ مالی سال میں ریکارڈ ٹیکس جمع کیا اور ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ 4 ہزار ارب کی نفسیاتی حد عبور کر کے 47 سو ارب سے زائد محصولات اکٹھے کیے۔ مالی سال 22-2021ء کے پہلے دو ماہ میں 850 ارب سے زائد ٹیکس وصول کیا گیا اور اس سال کے لیے مقرر کیے گئے 5029 ارب روپے کے محصولات کے ہدف کو یقینی بنانے کے لیے شاندار آغاز کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک پاکستانی بھی بڑھ چڑھ کر رقوم پاکستان میں منتقل کر رہے ہیں جبکہ روشن ڈیجیٹل اکاؤنٹ میں جمع کروائی گئی رقم 2 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھی بیرونِ ملک پاکستانیوں کی تقلید کرتے ہوئے قومی معیشت کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کریں اور اپنے اپنے حصے کا

ٹیکس ادا کریں۔ یہ پوچھنے کے بجائے کہ یہ ملک ہمارے لیے کیا کر سکتا ہے؟ یہ پوچھیں کہ ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اقوامِ عالم میں وطنِ عزیز پاکستان کو باعزت مقام دلوانے کا راز اسی بات میں مضمر ہے۔
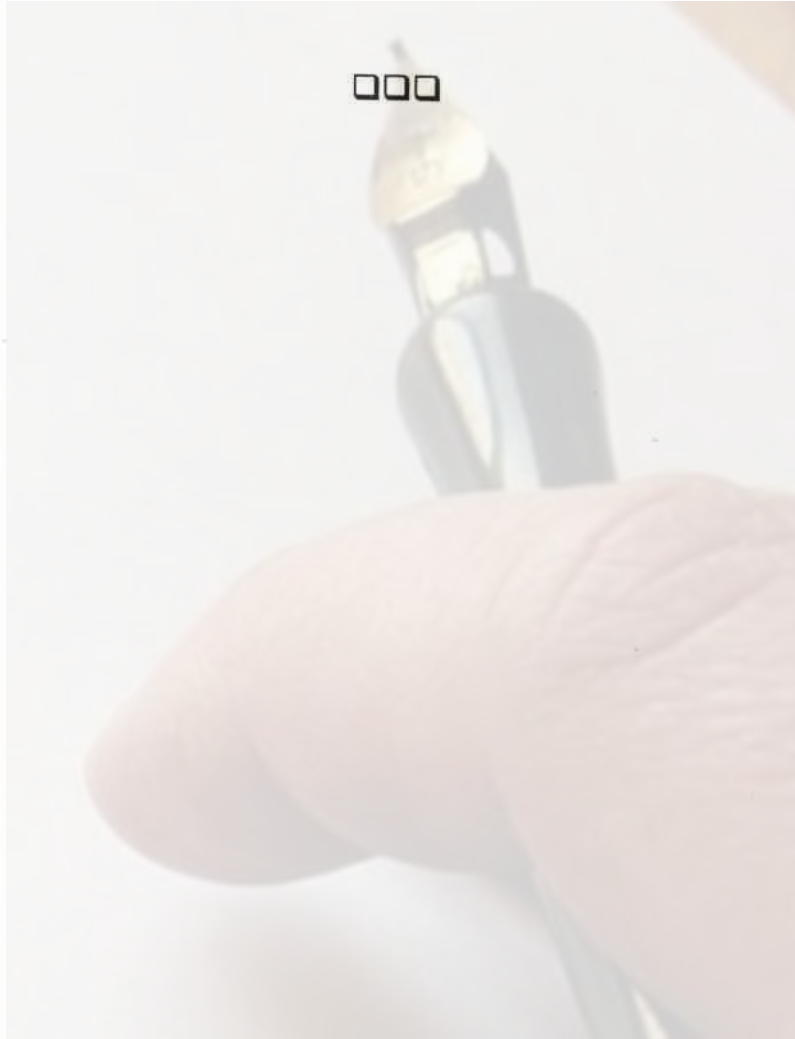
کیا قائداعظم کے بغیر قیامِ پاکستان ممکن تھا؟

''اگر سہنا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی دوسرا کیوں نہیں بن سکتا؟ اگر سہنا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کسی اور کو کیوں نہیں مل سکتا؟'' برطانوی وزیراعظم لارڈ ریمزے میکڈونلڈ کے اس جملے کو گالی کے مترادف گردانتے ہوئے قائداعظم یہ کہتے ہوئے فوراً کمرے سے باہر نکل آئے ''آئندہ میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؛ میں کوئی بکاؤ مال ہوں؟'' برطانوی وزیراعظم کا ان سے الوداعی مصافحے کی غرض سے بڑھایا جانے والا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ ''محمد علی جناح!'' (اس نے زیرِلب دہرایا) وزیراعظم کے چہرے پر ابھرنے والے پسینے کے ننھے قطرے اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ سخت سبکی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے لگا کہ وہ محمد علی جناح کو صوبائی گورنر کے عہدے اور لارڈ کے خطاب کے عوض خرید لے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اِس بار اس کا پالا ایک غیور، باضمیر اور اصول پرست انسان سے پڑا تھا جو اس کی طاقت کا نشہ ہوا میں اڑا کے جا چکا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند برطانوی سامراج سے آزادی کے حصول کے لیے سیاسی طور پر بہت متحرک ہو چکا تھا۔ کبھی گاندھی جی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کا آغاز

کر کے اپنی آواز بلند کرتے تو کبھی کوئی مسلمان مقرر اپنے جوشِ خطابت سے پنڈال پر وجد طاری کر کے مسلمان قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کہتا کہ اگر جنگِ عظیم دوم کے دوران خلافتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھرا تو برطانوی حکومت کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لیں گے۔ اسی طرح جواہر لعل نہرو اور پٹیل جی انگریز سرکار کو اپنے مطالبات نہ ماننے کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیا کرتے تھے لیکن انگریز سرکار کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور جب اسے لگتا کہ چیونٹیوں کے پر نکل رہے ہیں تو عوامی جلسے میں نہتے عوام پر فائر کھول کر یہ آوازیں بند کرا دی جاتیں۔ پھر ایک منفرد لہجے نے انگریز سرکار کو چونکا دیا۔ غیر جذباتی منطقی انداز، پُروقار لہجہ، آنکھوں سے جھلکتی ذہانت، یہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ جو بات پر زور دینے کے لیے اونچی آواز کی بجائے دلائل کا سہارا لیتے، جذباتی بیانات کے بجائے مضبوط اِستدلال پیش کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ جس انگریز سرکار کو گاندھی جی کی بھوک ہڑتال اور سول نافرمانی کی تحریک پریشان نہ کر سکی، وہ حکومت ایک فردِ واحد کی ذہانت، متانت، دیانت اور فطانت کے سامنے بےبس دکھائی دی۔ اس کا اعتراف برصغیر میں آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی نشریاتی ادارے کو دیئے جانے والے ایک انٹرویو میں کچھ ان الفاظ میں کیا ''مجھے صرف اس مقصد کے لیے ہندوستان بھیجا گیا کہ اقتدار متحدہ ہندوستان کو ہی منتقل کروں۔ میں نے اس مقصد کے لیے راتوں کی نیندیں حرام کیں لیکن میرے مقصد کی راہ میں ایک شخص رکاوٹ بنا رہا اور وہ تھا محمد علی جناح۔'' جواہر لعل نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت نے تو قائداعظم کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''اگر مسلم لیگ کے پاس ایک سو نہرو اور دو سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور کانگریس کے پاس صرف محمد علی جناح ہوتا تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔'' برطانوی وائسرائے نے قائداعظم کو نہ صرف مسلم قوم کا عظیم رہنما بلکہ ایک سچا وکیل بھی کہا جنھوں نے پاکستان کا کیس ایک ایسی عدالت میں لڑا جہاں منصف کا جھکاؤ دوسرے فریق کی طرف واضح تھا، جہاں سے انصاف حاصل کرنا پتھر میں درخت بونے کے مترادف تھا اور جہاں عدل کا چشمہ خشک ہو چکا تھا۔ یقیناً دوسرا فریق ہر لحاظ سے مضبوط

پوزیشن میں تھا۔

جب کانگریسی قیادت نے مسلم بغض اور تعصب پر مبنی نہرو رپورٹ پیش کر کے تنگ نظری اور گھمنڈ کے نئے ریکارڈ قائم کیے تو قائداعظم اس بے اصولی پر سخت برہم ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب قائداعظم کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ان کی ایک کال پر لاکھوں کا مجمع اکٹھا ہو کر کانگریسی قیادت کی تنگ نظری کا بدلہ لے سکتا تھا لیکن قائداعظم آئین اور قانون کی بالا دستی کا علم تھامے ایک تعمیری سوچ کے ساتھ قیامِ پاکستان کے لیے اپنی جدوجہد کرتے رہے۔ جس کا اظہار انھوں نے ایک جلسے میں ان الفاظ میں کیا کہ ''آزادی حاصل کرنے کے لیے جنگجویانہ جذبات اور جوش وخروش کا مظاہرہ آسان ہے اور ملک وملت کی تعمیر کہیں زیادہ مشکل!'' یہی وہ جذبۂ تعمیر تھا جس کی بدولت قائداعظم نے نہ صرف مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ مملکت کے خواب کو عملی تعبیر دی بلکہ مسلمان قوم کا الگ تشخص منوانے کے لیے دوقومی نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے تاریخی چودہ نکات پیش کر کے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدو جہد کی حکمتِ عملی وضع کی اور یہ ثابت کیا کہ تعمیری سوچ کے ساتھ بڑے سے بڑے مقصد میں بھی کامیابی پُرامن انداز میں یقینی بنائی جاسکتی ہے۔

جب انگریز سرکار اور ہندو قیادت کو یقین ہو چلا کہ وہ دلائل میں اس ذہین اور حاضر جواب شخص سے کبھی نہیں جیت سکیں گے تو انھوں نے نہایت چالاکی کے ساتھ آخری چال چلی اور کیبنٹ مشن پلان پیش کر دیا۔ جس کے مطابق ''ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوگا لیکن اس کے تین زون ہوں گے اور دس سال بعد اگر کوئی زون چاہے تو آزاد مملکت قائم کر سکتا ہے۔'' اس منصوبے کے روحِ رواں متحدہ ہندوستان کے سب سے بڑے حامی ابوالکلام آزاد تھے۔ کانگریسی قیادت کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کیبنٹ مشن پلان کسی صورت بھی قبول نہیں کریں گے اور یوں تاجِ برطانیہ اقتدار کانگریس کو منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن قائداعظم نے حیرت انگیز طور پر یہ منصوبہ قبول کر کے نہ صرف کانگریس کے اس مذموم منصوبے کو

خاک میں ملا دیا بلکہ اُسے اس قدر حواس باختہ کر دیا کہ جواہر لعل نہرو کے منہ سے وہ جملہ نکل گیا جس کا خمیازہ اسے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ ''ایک بار متحدہ ہندوستان کو اقتدار منتقل ہو جائے تو پھر کون کسے الگ ہونے دے گا۔'' قائداعظم محمد علی جناح نے ہمیشہ کی طرح کمال حاضر دماغی کی بدولت اسی جملے پر اپنا مؤقف قائم کر لیا اور پھر اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک تقسیمِ ہند کا اعلان نہیں کر دیا گیا۔

قائداعظم کی شخصیت و کردار کی بے پناہ منفرد خوبیوں میں سے ایک خوبی مضبوط قوتِ فیصلہ بھی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتے اور پھر اپنے مؤقف پر سختی سے ڈٹے رہتے، یہاں تک کہ لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے۔ اس ضمن میں گاندھی جی اور بانیٔ پاکستان کے مابین ہونے والا ایک مکالمہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ گاندھی جی جو قائداعظم کی ذہانت اور سیاسی حکمتِ عملی سے شدید متاثر تھے، ایک بار قائداعظم سے دورانِ ملاقات یہ سوال پوچھ بیٹھے۔ ''مسٹر جناح! آپ اپنے سیاسی فیصلے کیسے کرتے ہیں؟'' قائداعظم ایک لمحے کے توقف کے بغیر پُراعتماد لہجے میں گویا ہوئے ''میں اپنے سیاسی فیصلوں کا فارمولا بتانے سے پہلے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے سیاسی فیصلے کیسے کرتے ہیں؟'' ''جی بتایئے!'' گاندھی جی نے متجسس لہجے میں کہا۔ ''آپ سیاسی میدان میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ لوگوں کا مزاج، موڈ اور رائے کیا ہے اور جب آپ کو لوگوں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے تو آپ ان کو خوش کرنے کے لیے اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ لیکن میں ہمیشہ اس کے برعکس کرتا ہوں۔ میں صرف یہ دیکھتا ہوں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ اس کے بعد جو صحیح ہوتا ہے میں وہ کرتا ہوں کیونکہ ایک صحیح فیصلہ ایسے ہزار فیصلوں سے بہتر ہوتا ہے جو صرف لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کیے جائیں۔''

اگر قائداعظم محمد علی جناح دو قومی نظریہ کی بنیاد پر قیامِ پاکستان کے مطالبے پر ذرا سی بھی لچک کا مظاہرہ کرتے تو آج ہم ایک آزاد مملکت میں مذہبی آزادی، تاریخی تشخص اور منفرد ثقافتی اقدار کی روشنی میں اپنی زندگیاں کبھی نہ گزار پاتے۔ جنھیں قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں، دو قومی

نظریہ کی سچائی اور قیامِ پاکستان کی ضرورت پہ ذرا سا بھی شک ہو، وہ ہمسایہ ملک بھارت میں مسلمانوں پر مودی سرکار کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم اور جنت نظیر وادی میں گزشتہ ایک برس سے جاری کرفیو سے پیدا ہونے والی انسانی حقوق کی تشویشناک صورتِ حال پر نظر ڈال لے۔ یقیناً اسے اپنے شکوک وشبہات پر مبنی کئی سوالات کے جواب مل جائیں گے۔

❑❑❑

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ
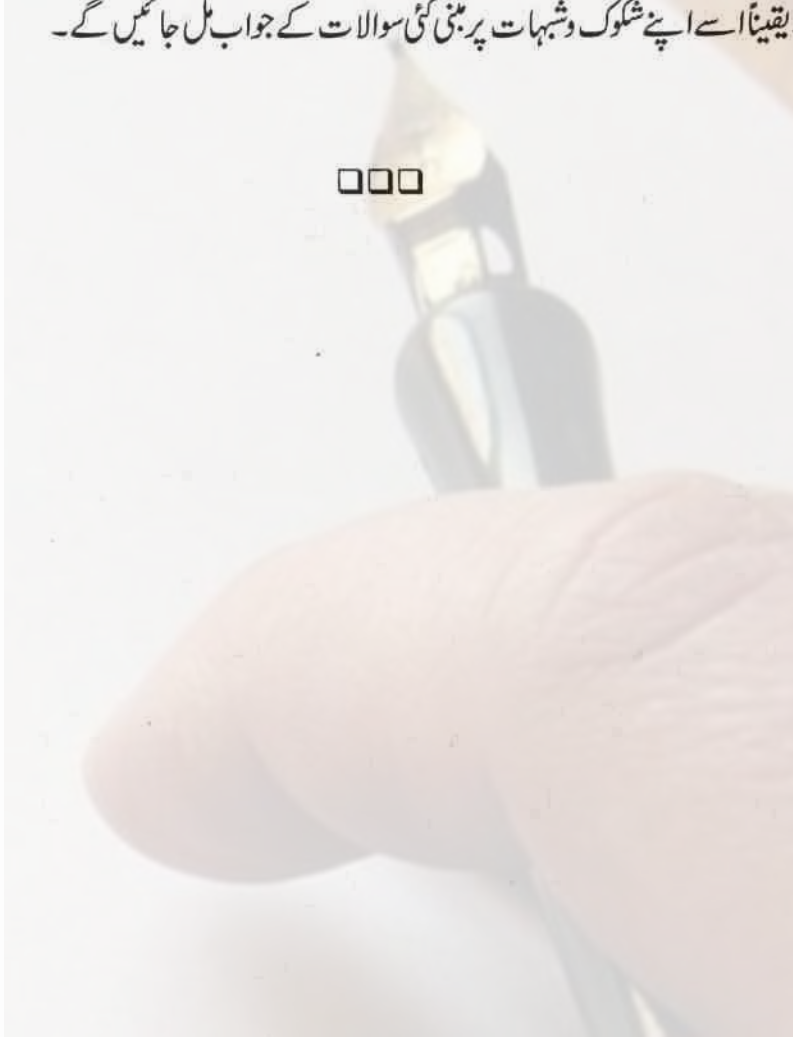
بلاشبہ حضرت محمد مصطفیٰ، محبوبِ خدا، سرورِ کونین، رحمۃ للعالمین ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ختمِ نبوت کے تمام دلائل میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ظہور سے متعلق گزشتہ انبیائے کرام نے اپنی اپنی امتوں کو بشارتیں دی ہیں کہ آخری زمانے میں ایک کامل نبی ملکِ عرب میں مبعوث ہونے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کتاب بڑی بے چینی سے آپ ﷺ کی بعثت کے منتظر تھے اور اسی لیے بہت سے علم وفضل اور اخلاص سے سرشار اہلِ کتاب جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی دعوتِ حق ملتے ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ البقرہ میں واضح الفاظ میں بیان کیا ہے''جن لوگوں کو ہم نے کتاب (یعنی تورات اور انجیل) دی وہ آپ کو خوب پہچانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی تورات اور انجیل میں بشارت دی گئی اور اہلِ کتاب آپ کی صورت وشکل کو دیکھ کر آپ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ اپنے بیٹوں کی شکل وصورت کو دیکھ کر پہچانتے ہیں۔'' سورۃ الاعراف میں ربِ کریم نے بڑی صراحت سے بیان کیا کہ ''میں وہی نبی ہوں جس کی خبر تورات اور انجیل میں دی گئی ہے۔''

حاکمِ یمن سیف بن ذی یزن نے آپ ﷺ کے دادا جنابِ عبدالمطلب کو آپ ﷺ کی پیدائش کے قریبی زمانہ میں خبر دی تھی کہ آپ کے خاندان میں نبی آخرالزماں پیدا ہونے والے ہیں۔ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک بارہ برس ہوئی اور اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ سفرِ شام کے لیے روانہ ہوئے، وہاں ایک نصرانی راہب بحیرا نے آپ ﷺ کو دیکھتے ہی جنابِ ابوطالب سے کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کی خبرداری رکھنا کہ یہی نبی آخرالزماں ہوں گے کیونکہ میں نے کتبِ سماویہ میں جتنی علامات آخری نبی کے بارے میں پڑھی ہیں، وہ سب کی سب ان میں موجود ہیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ ﷺ پچیس برس کی عمر میں ملکِ شام تشریف لے گئے تو وہاں نسطورا ناھی راہب نے آپ ﷺ کو بغور دیکھا اور قافلہ والوں کو بتایا کہ یہی ہیں وہ نبی آخرالزماں، ہمارے صحائف میں جن سے متعلق جملہ علامات درج ہیں۔ خاتم الانبیا کی تمام نشانیاں آپ ﷺ میں اعلانِ نبوت سے قبل ہی پائی گئیں۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہجرتِ مدینہ کے وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھتے ہی پہچان گئے کہ یہی نبی آخرالزماں ہیں جن کی پیش گوئیاں میں سن چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح حبشہ کا بادشاہ نجاشی انبیائے سابقین کی بشارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ﷺ کو نبی آخرالزماں تسلیم کرتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کا یہ نعتیہ شعر وجہ تخلیقِ کائنات، محسنِ انسانیت، امام الانبیاء، خاتم النّبیین حضورِ اکرم ﷺ کے ظہورِ پُرنور کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے...

جس بھی فن کار کا شاہکار ہو تم
اُس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک، ہر نبی، ہر مرسل نے نبی آخرالزماں کی دُنیا میں تشریف آوری کی بشارت دی اور اسی ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی عظیم خدمت بجا لانے کے بعد اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہمراہ دعا کی کہ یا ربِ کریم! اپنے

محبوب نبی آخر الزماں کو ہماری نسل میں سے ظاہر فرما اور یہ شرف ہمیں عنایت کر۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشا، اس دعا کو قرآن مجید میں سورۃ البقرہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ''اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک رسول انھی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انھیں خوب ستھرا فرماوے اور بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔'' نبی کریم ﷺ کی ایک حدیثِ مبارکہ بھی موجود ہے کہ میں اپنے جدِامجد ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ (مسند احمد)

ہمارے پیارے نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مشرق و مغرب، شمال و جنوب، گورے کالے، عرب و عجم، ترک و تاتار، امیر و غریب اور قیامت تک آنے والے ہر انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا اور قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت فرما دی تاکہ بات مکمل واضح ہو جائے۔ سورۃ الاعراف کی آیت 58 اور سورہ سبا کی آیت 28 میں فرما دیا کہ رسول ﷺ جمیع انسانیت کے لیے اللہ کے پیغمبر ہیں اور تمام انسانیت کے لیے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب کی آیت 40 میں صاف فرما دیا کہ ''محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔'' یعنی جس طرح وہ کسی مرد کے باپ نہیں، بعینہٖ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی بھی نہیں ہو سکتا اور نبوت اور رسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ارشادِ ربانی ہے ''اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔'' لہٰذا جب قرآنِ کریم ہی آپ ﷺ کی ہمہ گیری اور آخری رسالت و نبوت کا اظہار، دین کی تکمیل، نعمتوں کے اتمام، آپ کے رحمتِ جہاں ہونے کا اعلان کر دے اور آپ ﷺ کو رہتی دُنیا تک پوری انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کا منبع کہہ رہا ہے تو پھر بھلا ختمِ نبوت سے کس طور انحراف کیا جا سکتا ہے؟

قرآن کریم میں اللہ کے فیصلے اور اس کی رضا کے علم کا دوسرا بڑا ذریعہ ہمارے پاس

احادیث مبارکہ ہیں جس میں ختمِ نبوت و رسالت کے بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تصدیق کے سبب مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اعلان فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اللہ کے آخری نبی ہیں اور اب نبوت کا سلسلہ و دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور وحی کا امکان بھی ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا گیا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد اس طرح کی سب چیزیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئیں۔ ایک حدیث شریف میں اس ضمن میں ایک مثال سے وضاحت کی گئی ہے، فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے کوئی عمارت تعمیر کی اور اسے نہایت حسین و جمیل بنایا مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی، لوگ اس کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں۔'' صحیح بخاری میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد نام مذکور فرمائے جن میں ایک نام عاقب ہے، جس کا مطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہے۔ ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت ختم ہو چکی اور میرے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر وضاحت سے فرمایا کہ میں نے تم پر اللہ کا دین مکمل کر دیا۔ لہٰذا یہ ابدی حقیقت طے کر دی گئی کہ اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا، نہ کوئی اللہ کی کتاب نازل ہو گی، نہ کوئی دین آئے گا، نہ کوئی شریعت، نہ کوئی وحی آئے گی اور نہ ہی اللہ کا کوئی پیغام آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی آخری الہامی کتاب قرآنِ مجید جس صورت میں نازل ہوئی تھی، آج بھی بغیر کسی ترمیم و اضافے کے اسی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی کیونکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات کا احاطہ کر کے اُن سارے انسانوں اور زمانوں کو مخاطب کرتی ہے جو تا قیامت خلعتِ وجود سے آراستہ ہو کر دُنیا میں آتے رہیں گے۔ ختمِ نبوت کا ثبوت انبیائے سابقین کی پیش گوئیوں سے لے

کر قرآن و حدیث تک، بدرجہ اتم موجود ہے اور یہ ہمارے ایمان و اعتقاد کی عمارت کا بنیادی ستون ہے۔ معروف نعت گو شاعر مظفر وارثی کے یہ اشعار ختم نبوت کے موضوع پر خوبصورت گلہائے عقیدت ہیں...

خود میرے نبیؐ نے بات یہ بتا دی، لا نبی بعدی
ہر زمانہ سُن لے یہ نوائے ہادیؐ، لا نبی بعدی
ان کے بعد ان کا مرتبہ کوئی بھی پائے گا نہ لوگو!
ظلی یا بروزی اب کوئی نبی آئے گا نہ لوگو!
آپؐ نے یہ کہہ کر مہر ہی لگا دی، لا نبی بعدی

□□□

ہاؤس وائف

وہ کبھی سکول نہیں گئی، اس نے کسی کالج میں قدم نہیں رکھا اور نہ ہی کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل کی ہے۔ اسے علمِ معاشیات کا پتا ہے نہ علمِ سیاسیات سے کوئی شغف ہے، ریاضی کے گورکھ دھندے سے نا آشنا اور شماریات کے مضمون کی پیچیدگیوں سے مکمل بے خبر۔ نیوٹن کے قوانینِ حرکت کی کوئی خبر نہ لا آف اٹریکشن سے شناسائی۔ ڈینیل کارنیگی اور نپولین ہِل سے لے کر ٹونی بیوزن کے مائنڈ پاور کے فلسفہ اور رابن شرما کی کتاب ''فائیو اے ایم کلب'' سے مکمل بے بہرہ۔ دُنیاوی علوم، مفکرین، مقررین اور موٹیویشنل سپیکرز سے استفادہ سے بھی محروم، وہ سارے جہاں سے الگ تھلگ اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا میں وقت کے دائرُوں میں بٹی کٹی زندگی پوری سچائی اور دیانت داری سے جی رہی ہے۔ اس کی کل کائنات اس کے گھر کی چار دیواری، اس کا خاندان، اس سے جڑی ضرورتیں، پریشانیاں، صدمے اور خوشیاں ہیں۔ اس کا غم اور اس کی خوشی کو بانٹنے والوں کی تعداد بہت محدود ہے۔ اس کی سوچ کا محور اس کے بچے، ان کا مستقبل، اس کی بکریاں اور مرغیاں ہیں، ان سے حاصل ہونے والی کمائی اور اس میں بننے والا محدود سا بجٹ،

جس سے جملہ اخراجات اور حاجات کو پورا کرنا ہے۔ وہ رات گئے آرام کے لیے بستر پر دراز ہوتی ہے تو چاند تاروں سے باتیں کرتے، خواب دیکھتے سو جاتی ہے اور پھر صبحِ کاذب کے وقت مرغوں کی اذانیں اسے جگا دیتی ہیں اور اس کا ایک اور لمبا دن شروع ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے وہ اللہ اور رسول ﷺ کو یاد کرتی ہے اور بسم اللہ کے ورد کے ساتھ دودھ کی چاٹی میں مدھانی ڈالتی ہے جس سے دہی، مکھن اور لسی حاصل کر کے صبح کے ناشتے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ صبح صادق کے وقت بچوں کو جگا کر مسجد بھیجتی ہے اور خود اُن کی وردیاں استری اور جوتے پالش کر کے تازہ مکھن سے بنے پراٹھے، انڈے کے آملیٹ اور دہی پر مشتمل ناشتے کا بندوبست کرتی ہے جو مسجد سے واپسی پر بچوں کو پیش کرتی ہے اور انھیں سکول روانہ کر دیتی ہے۔ ہر صبح اسے اپنی بیٹی کے ماتھے پر قسمت کا ستارہ چمکتا دکھائی دیتا ہے تو وہ اس کی روشنی میں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھتی ہے۔ اپنے بیٹوں کی آنکھوں میں امید اور حوصلے کا ایک جہان اسے نظر آتا ہے اور اسے وہ مستقبل قریب میں اعلیٰ افسران اور کامیاب انسان بنتے نظر آتے ہیں تو اس کی خوابوں کی دُنیا میں رنگِ بہار نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی مشکلیں کٹتی اور فاصلے سمٹتے نظر آتے ہیں اور کارِ جہاں کے رنج و آلام سے جلد چھٹکارا ملنے کے امکانات روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے عزم و ولولہ میں نئی امنگ نمایاں ہونے لگتی ہے اور اس کے جذبے دوبارہ پوری طاقت سے ایک نیا صبر آزما دن شروع کرنے میں اس کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔

بچوں کو سکول روانہ کر کے رات کی باسی روٹی، مکھن، اچار اور لسی پر مشتمل ناشتہ لے کر وہ کھیتوں کا رخ کرتی ہے جہاں اس کا خاوند زمین سے سونا اگانے اور متاعِ زیست کی تلاش میں مصروفِ عمل ہے۔ کھیتوں میں ہل چلانے سے لے کر پانی لگانے اور مال مویشی کو چارہ ڈالنے، پانی پلانے اور نہلانے ٹہلانے کے مختلف امور سرانجام دینا اس اکیلے شخص کے بس کی بات نہیں لہٰذا اسے ناشتہ دے کر وہ اس کے ساتھ کام میں جت جاتی ہے اور برابر مشقت کرتی ہے۔ ان ساری مصروفیات کے ساتھ ساتھ، اگر ٹیوب ویل چل رہا ہو تو وہ گھر سے کپڑے لا کر وہیں دھوتی ہے اور

انھیں خشک کرنے کے لیے کھیتوں میں پھیلا دیتی ہے۔ اتنے میں اس کا شوہر دودھ دوہ کر اس کے حوالے کرتا ہے اور وہ اسے سر پہ اٹھائے دوپہر کو گھر واپس لوٹتی ہے اور سکول سے چھٹی کر کے گھر آنے والے بچوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگتی ہے۔ بچوں کو کھانا دے کر ایک بار پھر وہ کھیتوں کا رخ کرتی ہے جہاں موسم کے مطابق فصل کی کٹائی، بوائی اور چنائی میں لگ جاتی ہے اور شام تک اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے سامانِ رزق اکٹھا کرتی ہے۔ ٹیوب ویل کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کیاری میں اس نے موسمی سبزیاں بھی اگا رکھی ہیں جن میں سے وہ حسبِ ضرورت سبزیاں توڑ کر گھر لاتی ہے اور رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مغرب کے کچھ دیر بعد اس کا شوہر اور خاندان کے دوسرے مرد حضرات گھر پہنچ جاتے ہیں جن کی خدمت اور انھیں رات کا کھانا دینا اس اکلوتی جان کی ذمہ داری ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان سب امورِ خانہ داری اور کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ وہ گھر میں ایک کامیاب دستکاری سنٹر بھی چلاتی ہے جہاں وہ گاؤں کی چھوٹی بچیوں کو سلائی کڑھائی اور اون کی بُنائی سکھاتی ہے۔ روٹی والے رومال، تکیے، چادریں، میز کرسی کے کور، اون کی ٹوپیاں، جرسیاں اور دستانے، سب یہاں بنائے جاتے ہیں جنھیں نہ صرف اپنے بچوں کو سردی سے بچانے اور گھر کی سجاوٹ کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے بلکہ انھیں بیچ کر گھر کی ضروریات بھی پوری کی جاتی ہیں۔ اس کیش اکانومی کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اس نے کھیتوں میں جانوروں کے ساتھ ساتھ چند ایک بکریاں اور مرغیاں بھی پال رکھی ہیں جنھیں بوقتِ ضرورت بیچ کر نقد رقم وصول کی جاتی ہے اور اپنی حاجات کو عزتِ نفس مجروح کیے بغیر پورا کیا جاتا ہے۔ یوں وہ میکرو اور مائیکرو اکنامکس پڑھے بغیر ایک بہترین ماہرِ معاشیات بھی ہے اور اپنی مؤثر منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی سے وہ آمدن کے ایک سے زائد ذرائع بھی پیدا کر لیتی ہے۔ خود اپنی سبزیاں اگا کر وہ غیر ضروری اخراجات سے بھی گریز کرتی ہے اور بچت کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔

یوں بظاہر اس گھریلو اور ناخواندہ عورت کے کئی روپ ہیں۔ وہ ایک محبت کرنے والی

ماں ہے اور خدمت گزار بیوی بھی۔ وہ اپنے بھائیوں کی تابع فرمان بہن ہے تو اپنے خاندان کے بزرگوں کی عزت کرنے والی بیٹی اور بہو بھی۔ وہ اَن پڑھ ضرور ہے پر جاہل نہیں، وہ ایک بہترین منتظم، کامیاب ماں اور عملی زندگی کو خوبصورتی سے جینے کے فن سے بہرہ ور ایک عظیم عورت ہے۔ آج بھی ہمارے وطنِ عزیز کی تقریباً 65 فیصد آبادی دیہات میں آباد ہے اور یہ عظیم عورت اس دیہی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہ گھر گھر میں اپنے ٹھوس کردار سے نہ صرف کھیت کھلیان، امورِ خانہ داری اور دستکاری کے مختلف صبر آزما اور مشکل ترین کام کاج بطریقِ احسن سرانجام دیتی نظر آتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے اور ان کی بہترین تربیت اور اپنی محنت سے کمائے گئے رزقِ حلال سے انھیں ایک ذمہ دار اور کارآمد شہری بنانے میں بھی اپنا نمایاں کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ اس سے ملتا جلتا کام تعلیم یافتہ شہری خواتین بھی کرتی ہیں جنھیں شادی کے بعد تعلیم، صلاحیت اور ڈگری کے باوجود نوکری کی اجازت نہیں ملتی اور وہ محض امورِ خانہ داری، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اپنی تمام عمر گزار دیتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایم اے، ایم ایس سی، ایم بی اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، ڈاکٹریٹ اور انجینئرنگ کرنے والی خواتین گھر کی چار دیواری میں دھوبن، باورچن، آیا، خادمہ، استانی اور صفائی والی آنٹی کے مختلف روپ دھار کر عملی طور پر لگ بھگ سولہ گھنٹے مصروف رہتی ہیں۔ یوں اپنے شوہر کی آمدن پر کوئی اضافی بوجھ نہیں پڑنے دیتیں مگر ہم پھر بھی انھیں نکما، ناکارہ اور ہاؤس وائف کے القابات سے نوازتے ہیں اور ان کی بیش قیمت خدمات کے اعتراف کے بجائے انھیں ایک بوجھ تصور کرتے ہیں۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ ہم جب بھی ان عظیم خواتین کے بے بہا کارناموں پر بات چیت کرتے ہیں تو ان کے یہ تمام امور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں اور انھیں ہاؤس وائف کا ٹائٹل دے کر ان کے کٹھن طرزِ زندگی اور بے پناہ خدمات کو سراہنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہم

ورکنگ وومن صرف اسے قرار دیتے ہیں جو دفتری امور سرانجام دے اور ملازمت پیشہ ہو۔ اگر ہم اپنے گھروں میں موجود خواتین کے مختلف امور کی اکنامک ویلیو کا حساب کتاب کریں تو یا ہمیں ہاؤس وائف کے تصور کو بدلنا پڑے گا یا ورکنگ وومن کی تعریف تبدیل کرنا ہوگی۔

❑❑❑
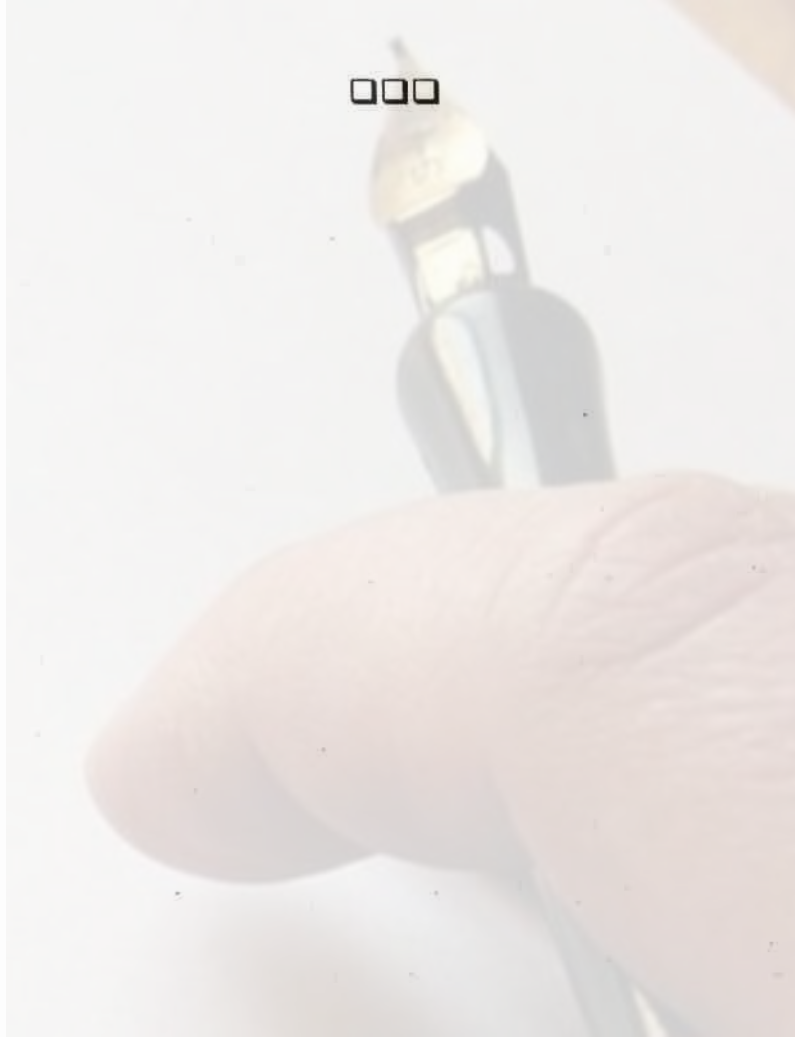
دلِ ماروشن، چشمِ ماشاد

جب خالقِ کائنات نے زمین پر اپنا نائب اتارنے کی منصوبہ بندی شروع کی اور عرشِ بریں پر اس سلسلے میں ملائکہ سے گفتگو ہوئی تو دل ہی دل میں سب سے مضبوط امیدوار ابلیس بن بیٹھا۔ کیونکہ اسے اپنی عبادت اور ریاضت کا گھمنڈ تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے مٹی کے بُت میں رُوح پھونکی اور یوں ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام تخلیق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سب ملائکہ کو انھیں سجدہ کرنے کا حکم سنایا تو عالمِ ارواح میں سب اکٹھے ہوئے اور ابلیس کے سوا تمام فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ اللہ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کیا، مگر ابلیس نے تکبر کیا اور ظالموں میں سے ہو گیا۔ تب سے وہ شیطان ٹھہرا اور روزِ قیامت تک مردود و مقہور قرار پایا۔ اس نے اپنے دل میں تکبّر کے ساتھ ساتھ انتقام کی آگ بھڑکائی اور آدم علیہ السلام کے پاس عرشِ بریں پر جا پہنچا۔ انھیں خوب بہکایا اور شجرِ ممنوعہ کی طرف راغب کرنے کے لیے اکسایا۔ یوں آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے اور زمین پر اُتار دیے گئے، مگر شیطان کے غصے اور انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہو سکی اور اس نے انسان کا ازلی دُشمن بننے کا فیصلہ کیا۔ شاید ربِ کائنات نے اپنی جامع منصوبہ بندی میں اس کا کردار ہی یہ لکھ دیا کہ جہاں اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں اپنے ذکر اور فکر کے کھیت اگائے گا تو شیطان کی طرف سے

بھیجے گئے حرص و ہوس اور لہو ولعب کے وحشی درندے اس فصل کو اجاڑ دیں گے۔حق و باطل اور خیر وشر کی معرکہ آرائی میں فیصلہ کن کردار انسان کے دل کو ٹھہرایا گیا اور قرآن مجید میں ربِ دو جہاں نے بہت واضح لکھ دیا کہ بے شک دلوں کا سکون ذکرِ الٰہی میں ہے۔ دوسری طرف شیطان مردود نے بھی انسانی دل کو اپنی تمام مذموم اور ناپاک ریشہ دوانیوں کا مرکز بنایا اور یوں اپنی انسان دشمنی کے لیے تیار کی گئی سب چالیں، سب وارداتیں انسان کے دل میں اتارنے کا عہد کیا۔

انسان کے تزکیۂ نفس، توحید کے اقرار اور شرک سے انکار کے لیے اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا اور رسول بھیجے، تا کہ وہ بنی آدم کے دل میں ذکرِ الٰہی کے چراغ روشن کر سکیں اور شیطان کی چالوں اور ہتھکنڈوں سے اسے خبردار کریں۔ ہر قوم پر اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجا اور اس کو پیغامِ ہدایت کا ذریعہ بنا کر انسان کو اشرف المخلوقات کے منصب کی پاسداری کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری دی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرش پر اور اس کے فرشتے اور ملائکہ عرش پر توحیدِ الٰہی کے نغمے الاپتے رہے تو دوسری طرف شیطان بھی اپنی تمام مذموم چالوں سے انسان کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے پر مجبور کرتا رہا۔ ایک طرف اللہ کے ماننے والے اپنے دلوں کو ذکرِ الٰہی سے منور کرتے رہے تو دوسری طرف شیطانی قافلے کے پیروکار اپنے دل میں شکوک وشبہات کی وجہ سے گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی وجۂ تخلیق کو حضرت عبد اللہ اور بی بی آمنہ کے گھر اتارا اور ہمارے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی ذمہ داری بنو سعد کی کنیز حضرت حلیمہ کے سپرد کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی بھائیوں کے ہمراہ جنگل میں بکریاں چرانا شروع ہوئے تو چار سال کی عمر میں ایک روز جنگل میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام انسانی رُوپ میں حاضر ہوئے، آپ کا سینۂ اطہر چاک کیا اور آپ کا دل نکال کر آسمان سے لائی گئی ایک سنہری کٹوری میں رکھا، اسے صاف کیا اور پھر اذنِ الٰہی سے واپس آپ کے سینۂ مبارک میں لگا دیا گیا۔ اس غیر معمولی واقعہ پر آپ کے رضاعی بھائی سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچے اور اپنی والدہ

حضرت حلیمہ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ اس پر وہ چلّاتی ہوئی جنگل کی طرف دوڑیں تو دیکھا کہ آپ ﷺ ایک گھنے درخت کے سائے میں پُرسکون حالت میں تشریف فرما تھے۔ حضرت حلیمہ آپ کو لے کر واپس گھر پہنچیں۔ دوسری مرتبہ یہی عمل گیارہ سال کی عمر میں، تیسری دفعہ نبوت کے وقت اور آخری مرتبہ معراج کی رات دہرایا گیا۔ یوں حضرت محمد ﷺ کے قلبِ اطہر کو شیطانی صفات، شہوانی عادات، نفسانی خواہشات اور جملہ بشری کمزوریوں سے پاک کر دیا گیا اور آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہٰی تک پہنچنے، ربِ دو جہاں سے شرفِ ملاقات اور اس سے جڑے ہوئے انوار و تجلیات کے لیے تیار کیا گیا۔ دراصل یہ ساری تمہید، تمثیل اور توضیح میں نے اس لیے پیش کی کہ عالمِ ارواح سے لے کر عالمِ آب و گل تک انسانی دل کی منفرد اور نمایاں حیثیت ثابت کی جا سکے اور یہ نکتہ واضح کیا جائے کہ چشمِ ما روشن سے زیادہ مقدم ہے دل کے نگر کا آباد ہونا۔ یہ لازم ہے کہ دل کی بستی میں نورِ ایمان اور توحیدِ الٰہی کا ظہور ہو اور حُبِ مصطفیٰ ﷺ کے پھول مہکائیں تو پھر چشمِ ما شاد قدرتی امر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک دلِ ما روشن چشمِ ما شاد ہی درست اور فطری ترتیب ہے۔ یہ میرا الیقینِ محکم ہے کہ انسان کا دل دراصل وہ محور ہے، جو دینِ حق کی بقا اور سلامتی کا ضامن ہے، جو خیر اور شر کی روزِ ازل سے شروع ہونے والی معرکہ آرائی کا اصل میدانِ جنگ ہے۔ یہ حق و باطل کی پنجہ آزمائی میں انسان کو فرشتوں سے بلند مقام تک پہنچانے یا پھر وحشی درندوں سے بھی بدتر بنانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

انسان اپنے تمام اعمال، جملہ ارادوں اور ساری خواہشات کے نقطہ آغاز سے لے کر ان کے منطقی انجام تک دل کے تابع ہے، جس نے بھی اپنی نفسانی خواہشات اور انسانی کمزوریوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور ذکرِ الٰہی سے دل کی دُنیا آباد کر لی وہی انسان دونوں جہاں کی فلاح کا مستحق ٹھہرا، اُسی روشن دل میں ہی امید کے پھول کھلتے ہیں، ایمان کے چراغ جلتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ دل میں ماں کی محبت سر چڑھ بولے تو حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ملتا ہے اور عشقِ رسول ﷺ کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ یہ دل ہی تو ہے جس کی فصلِ گل کی

آبیاری تمام انبیا، جملہ اولیا، صحابہ کرام، تابعین اجمعین اور صوفیائے کرام ہمیشہ اپنی اوّلین ذمہ داری سمجھتے رہے اور انھوں نے کبھی بھی شیطانی وسوسوں سے اپنے دل کے چمن کو اجڑنے نہیں دیا، بلکہ شیطان کے تمام ناپاک ہتھکنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے من کی دُنیا میں ڈوب کر سراغِ زندگی پایا اور اپنا اصل مقصدِ حیات پہچانا۔ یہ دل ہی تو ہے جو قوتِ عشق سے روشن ہو تو پھر دہر میں بھی عشقِ محمد ﷺ سے اُجالا ہو جاتا ہے اور انسان اپنے ربِ کریم کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنی دل کی دُنیا ذکرِ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے روشن کر لیں تو پھر ہماری چشمِ پُرنم میں مایوسی کے آنسوؤں کی بجائے امید کی شبنم اتر آئے گی اور یوں دلِ ماروشن چشمِ ماشاد کی انوکھی ترتیب نہایت آسانی سے واضح ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو رحمتِ دوجہاں بنایا تو اس کی پوری تیاری کی۔ یوں آپ ﷺ کے دل میں رحمت، شفقت، محبت، ایثار، صبر و رضا، جود و سخا، فیاضی و غنا اور خیر الوریٰ کے جملہ اوصافِ حمیدہ اور جذباتِ جمیلہ کے صدا بہار چمن مہکا دیئے۔ گویا دل ہی وہ مرکزی مقام ہے جسے روشن کر کے انسان اپنے کردار کی معراج پا سکتا ہے۔

میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے دلوں کو ذکرِ الٰہی سے منور فرمائے اور انھیں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا گہوارہ بنائے۔ (آمین)

□□□

معصوم سی خواہش!

گزشتہ رات پھر ایک پرائیویٹ سفید کرولا کار، نیلی گھومتی ہوئی لائٹ کے ساتھ مجھے اوورٹیک کرتے ہوئے برق رفتاری سے گزری اور لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک دفعہ پھر میرے ذہن پر نقش سینکڑوں واقعات تازہ ہوگئے تو میں سوچنے لگا کہ اس مضمون میں کم از کم تین واقعات آپ کی خدمت میں پیش کروں...

پہلا واقعہ مجھے کوئی سولہ سترہ برس پہلے اس وقت کے ڈی پی او منڈی بہاؤالدین نے سنایا، جو آج کل ایک صوبے میں ایڈیشنل آئی جی پولیس ہیں۔ کہنے لگے کہ ایک اتوار کی شام وہ اپنے لاہور والے گھر سے واپس ڈیوٹی پر منڈی بہاؤالدین کے لیے روانہ ہوئے۔ موٹروے سالم انٹرچینج سے اُتر کر تھانہ گوجرہ کراس کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک نیلی بتی والی گاڑی تیزی سے آئی اور انھیں کراس کرگئی۔ جب ان کی نظر پڑی تو وہ ایک پرائیویٹ کرولا کار تھی، تو فوراً اپنی سرکاری گاڑی میں بیٹھے وائرلیس آپریٹر کے ذریعے تھانہ گوجرہ اطلاع دی کہ تھانہ کے سامنے لگے بیریئر پر اس گاڑی کو روکا جائے اور چیک کیا جائے، جبکہ ڈی پی او نے بھی اپنی گاڑی واپس موڑ کر اس سفید کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ چونکہ بیریئر پر موجود پولیس اہلکار تھوڑی

دیر قبل ہی ڈی پی او صاحب کو گزرتے ہوئے دیکھ کر پوری طرح چوکس کھڑے تھے اور وائرلیس کی اطلاع نے انھیں مزید مستعد کر دیا۔ کچھ ہی لمحات میں وہ سفید کرولا کار تھانہ گوجرہ کے سامنے بیریئر پر دھر لی گئی۔ اس میں سوار ڈرائیور کے علاوہ دو اور لوگ تھے، جو کہ منڈی بہاؤالدین کے ایک متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور لاہور پولیس میں بطورِ کانسٹیبل تعینات تھے۔ ابھی ابتدائی پوچھ گچھ شروع ہی ہوئی تھی کہ ڈی پی او صاحب بھی خود موقع پر پہنچ گئے۔ دورانِ تفتیش پتا چلا کہ جب بھی یہ دونوں بھائی لاہور سے گھر چھٹی آتے تو شاپر میں نیلی لائٹ ساتھ لاتے۔ موٹروے سالم انٹرچینج تک لفٹ لے کر پہنچتے اور اپنے گاؤں سے ٹیکسی کار منگواتے، اس پر نیلی گھومتی ہوئی لائٹ لگاتے اور سرِشام اپنے گاؤں میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ پہنچ جاتے۔ بالکل اُسی انداز سے واپسی پر اتوار کی رات گاؤں سے نکلتے اور پورے علاقے کو اپنے محکمے کا دبدبہ دکھاتے ہوئے موٹروے پر پہنچتے، وہاں پھر لفٹ لے کر یا کسی بس کو روک کر لاہور پہنچ جاتے اور نیلی بتی شاپر میں ڈال لیتے۔ جب ڈی پی او صاحب نے ان سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو ان کا جواب سُن کر خود ڈی پی او صاحب لاجواب ہو گئے۔ ''صاحب جی! ہم شریکوں والے بندے ہیں اور نیلی بتی لگا کر گاؤں میں آنے جانے سے ہماری چودھراہٹ بنی ہوئی ہے۔ ویسے بھی سر! اس معصوم سی خواہش کی وجہ سے کسی کا کیا نقصان ہوتا ہے۔'' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس واقعہ پر ہم دونوں کافی دیر ہنستے رہے تھے۔

دوسرا واقعہ مجھے میرے استاد انسپکٹر بلوچ صاحب نے سنایا کہ وہ ایک دیہاتی علاقے کے تھانے میں ایس ایچ او تعینات تھے۔ ایک رات بسلسلہ گشت سرکاری گاڑی میں ایک ذیلی سڑک پر موجود تھے تو سامنے سے آنے والی ایک کار پر نیلی لائٹ، بہت بڑی سبز نمبر پلیٹ اور جھنڈے کے لیے لگا ہوا سپیشل ڈنڈا اور اس کے اُوپر چمڑے کا کور بھی دِکھائی دیا۔ بلوچ صاحب کہنے لگے کہ گاڑی کی وضع قطع دیکھ کر میں ذرا دب گیا اور اپنے ڈرائیور کو گاڑی ایک طرف کرنے کا کہا؛ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی جسٹس صاحب کی گاڑی ہو، لیکن فوراً خیال آیا کہ کوئی جعلی ڈراما بھی ہوسکتا ہے۔ شک

کی بنیاد پر میں نے گاڑی رکوانے کا فیصلہ کیا۔ جب گاڑی کو ڈرتے ڈرتے چیک کیا گیا تو دیکھا کہ گاڑی کی سبز نمبر پلیٹ کے اوپر والے حصے پر ''ناظم یونین کونسل'' کے الفاظ تانبے میں مزین تھے اور موصوف ناظم خود گاڑی چلا رہے تھے۔ اس کے بعد انسپکٹر بلوچ صاحب نے ناظم صاحب کی معصوم سی خواہش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ انھوں نے نہیں بتایا۔ استاد کا لفظ اس لیے لکھا کہ میں نے بطور زیر تربیت پولیس انسپکٹر ڈی کورس کے دوران بلوچ صاحب کی شاگردی میں بہت کچھ سیکھا۔

تیسرا واقعہ میری پولیس میں بطورِ ایس ایچ او تھانہ صدر فیصل آباد کی تعیناتی کا ہے۔ جنوری 2001ء کی ایک سرد رات تھی اور میرے ایک دیرینہ دوست بھٹہ صاحب، مجھے ملتان سے لاہور جاتے ہوئے ملنے آئے۔ رات کا کھانا میرے ساتھ تھانے میں کھایا۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے تو مجھے اطلاع ملی کہ اگلی صبح لاہور ہائی کورٹ ایک مقدمے میں ریکارڈ سمیت حاضر ہونا ہے۔ میں نے بھٹہ صاحب کی موجودگی کو غنیمت جانا اور اُن کے ساتھ لاہور کے سفر کا ارادہ کیا۔ مثل مقدمہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھوا دی اور ایک وردی ہینگر پر لگوا کر ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں گاڑی کی دستی پر لٹکا دی۔ میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بھٹہ صاحب فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی بھٹہ صاحب نے اپنی معصوم سی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے گاڑی پر نیلی بتی لگانے کا مطالبہ کیا اور اپنی دلیل میں یہ فرمایا کہ براستہ شاہ کوٹ، شیخوپورہ سردیوں کی کالی سیاہ رات میں لاہور کا سفر غیر محفوظ بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا نیلی بتی ہمیں تحفظ دے گی۔ میں نے وہ مطالبہ ساری دلیلوں سمیت مسترد کر دیا اور رات نو بجے ہم تھانہ صدر فیصل آباد سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے ہی تھانہ کا ناکہ مکّوآنہ آ گیا۔ ناکے پر پہنچتے ہی ہمیں رکنے کا اشارہ ہوا۔ سیل والی بیٹری سے اہلکاروں نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کیا۔ مجھے پہچان کر انھوں نے سیلوٹ کیا اور میں انھیں شاباش دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد راوی ٹال پلازہ لاہور تک ہمیں لگ بھگ دس بارہ مرتبہ پولیس کے ناکوں پر روکا گیا۔ وہی بیٹری لیے پولیس اہلکار ہماری جانب بڑھے۔ کہاں سے آ رہے ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں؟ ذرا ڈِگی

کھولیں۔ باہر تشریف لائیں۔ گاڑی کے کاغذات دکھائیں۔ میں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کے ہر سوال کا جواب دیا اور یوں ہم رات بارہ بجے بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔

سارے راستے میں بھٹہ صاحب، نیلی بتی والی دلیلیں دہراتے رہے اور مجھے میری غلطی کا احساس دِلاتے رہے، مگر میں ٹَس سے مَس نہ ہوا۔ بھٹہ صاحب نے اُکتا کر مجھے ایک بزدل، نکما اور ناکارہ پولیس افسر قرار دیا اور آئندہ میرے ساتھ سفر نہ کرنے کا اعلان فرمایا۔ وہ بھی بہت بااُصول آدمی ہیں۔ ہماری گہری دوستی کے باوجود آج تک اپنی بات پر قائم ہیں اور ہم دوبارہ اکٹھے سفر نہیں کر سکے۔ مشترکہ دوستوں میں میری خوب دُرگت بناتے ہیں اور اُس رات والے سفر میں میری ''بزدلی'' کا قصہ مزے لے کر سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے ایک ہی گلہ ہے کہ یہ صاحب اگر میری معصوم سی خواہش کے احترام میں نیلی بتی لگا لیتے تو ہمیں جگہ جگہ پولیس کے ہاتھوں ''ذلیل'' نہ ہونا پڑتا۔ میرا جواب ہمیشہ بڑا سادہ ہوتا ہے کہ آپ کی پرائیویٹ گاڑی پر نیلی بتی لگانا خلافِ قانون عمل تھا اور میں قانون کا محافظ خود اس جرم کا ارتکاب کیسے کرتا؟ ویسے بھی پولیس سارے سفر میں ہمارے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ہر جگہ مستعد نظر آئی اور یوں ہمارا سفر محفوظ رہا۔

اب دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اپنی زندگی میں ہی بھٹہ صاحب سے معافی مانگ لوں۔ میری وجہ سے اُن کی دل آزاری ہوئی اور بطورِ دوست میں اُس رات اُن کی امیدوں پر پورا نہ اُتر سکا۔ جب ہر دوسری موٹر سائیکل پر صحافی، پریس، وکیل، اٹارنی، بینک افسر، چیئرمین، نمبردار اور بہت سے دیگر خود ساختہ عہدے اور محکمے دیکھتا ہوں اور بڑی بڑی گاڑیوں پر مختلف رنگ و نسل کی نمبر پلیٹوں کے علاوہ گھومتی ہوئی نیلی لائٹس بھی نظر آتی ہیں تو میں بھٹہ صاحب کے سامنے واقعی خود کو ''شرمندہ'' محسوس کرتا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ اپنی اس ''غلطی'' کی تلافی کے لیے میں کسی روز اپنی سرکاری گاڑی پر نیلی بتی لگاؤں، بھٹہ صاحب کے میاں چنوں والے گھر پہنچ کر انھیں ساتھ بٹھاؤں اور رات نو بجے براستہ ساہیوال لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں!

قومی ذمہ داری کا انعام

پاکستان کے موجودہ معاشی مسائل میں اندرونی اور بیرونی قرضوں کا بوجھ، افراطِ زر، مہنگائی، بیروزگاری اور خطِ افلاس سے نیچے رہ جانے والوں کی بے کسی اور بے بسی شامل ہیں۔ ان تمام معاشی پریشانیوں کی ایک بنیادی وجہ ہمارے ہاں ٹیکس کلچر کا فقدان ہے اور آج بھی ٹیکس بالحاظ مجموعی پیداوار لگ بھگ دس فیصد کے قریب ہے۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان صرف افغانستان سے آگے ہے جہاں پچھلے چالیس سال سے آگ و خون کا کھیل جاری ہے اور مسلسل جنگ و جدل کا سماں رہا ہے۔ ٹیکس ٹو جی ڈی پی میں سب سے آگے مالدیپ ہے جہاں یہ شرح 19 فیصد سے زائد ہے، دوسرے نمبر پر بھوٹان ہے جو 16 فیصد کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سری لنکا اور بھارت میں یہ شرح 12 فیصد ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کے مابین زیادہ فرق نہیں ہے مگر قابلِ غور امر یہ ہے کہ ہمارے دانشور، مبصرین اور صاحب الرائے طبقے کے علاوہ عوام بھی اس خواہش کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم لندن، پیرس، اوسلو اور نیویارک کی رفتار سے ترقی نہیں کر پا رہے اور نہ ہی حکومت ہمارے شہروں میں جدید سہولتیں میسر کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ایسی تمام خواہشات کا احترام اپنی جگہ مگر میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن ممالک کی مثال دیتے ہوئے ہم

فخر محسوس کرتے ہیں وہاں ٹیکس کلچر کا فروغ اور استحکام مثالی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ٹیکس ٹو جی ڈی پی اوسط میں فرانس اور ڈنمارک کے مابین سخت مقابلہ جاری ہے اور پہلی پوزیشن کے حصول کے لیے دونوں ممالک سرتوڑ کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان دونوں ممالک میں یہ شرح چالیس فیصد سے زائد ہے۔ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دیگر یورپی ممالک بھی تیس فیصد سے زائد شرح کے ساتھ ایک مضبوط، قابلِ اعتبار اور خودکار ٹیکس نظام کی وجہ سے اپنی معیشت کو مضبوط کرنے میں مصروفِ عمل ہیں اور کافی حد تک کامیاب بھی۔

چونکہ پاکستانی معیشت کیش پر مبنی لین دین اور غیر رسمی خطوط پر منحصر ہے، اس وجہ سے اس کو دستاویزی نہیں کیا جا سکا۔ ایسی معیشت میں ٹیکس چوری اور اس کے مختلف اسباب و محرکات کا تدارک ایک انتہائی صبر آزما اور مشکل عمل ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں نے اپنے ہاں ٹیکنالوجی کے استعمال کو عام کیا جس کی بدولت وہاں کیش کا لین دین تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ آپ جب بھی یورپ، امریکا، آسٹریلیا یا کسی بھی ترقی یافتہ ملک کا سفر کریں تو ایئر پورٹ پر اترتے ہی جب اپنا سامان اٹھانے کے لیے ٹرالی کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے تو وہاں ایک مشین میں سکے ڈالنا پڑیں گے، یہاں سے آغاز ہوتا ہے اور پھر آپ بتدریج ایک خودکار نظام پر استوار معیشت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لگ بھگ سبھی ترقی یافتہ ممالک میں قیام و طعام، سیر و سیاحت، تجارت اور کاروبار سے جڑے جملہ امور میں کیش کے بجائے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کرنا پڑتی ہے جس کے ڈیجیٹل شواہد متعلقہ ٹیکس حکام تک خود بخود پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ہر شہری کو فراہم کردہ انشورنس نمبر دراصل اس کی تمام معاشی سرگرمیوں کے لیے درکار ہوتا ہے اور اسی منفرد پہچان کے ساتھ منسلک جملہ دستاویزی ثبوت اس کے ذرائع آمدن، اثاثہ جات، اخراجات اور کاروباری حیثیت کے متعلق ناقابلِ تردید شواہد اور دستاویزات فراہم کرتے ہیں۔ ان ٹھوس شواہد کی موجودگی میں واجب الادا ٹیکس کی رقم کا درست تخمینہ لگانا انتہائی آسان ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی شخص یا ادارہ حساب کتاب کی درستی کے بارے میں ان سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ ان کی ترقی، معاشی استحکام اور سماجی انصاف

کا راز ان کی دستاویزی معیشت میں مضمر ہے جسے ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال کی بدولت ممکن بنایا گیا ہے۔

اسی تناظر میں اب یہاں بھی حکومت نے یہ اصولی فیصلہ کر لیا ہے کہ قرضوں کے بوجھ سے نجات، افراطِ زر اور مہنگائی سے چھٹکارا اور غربت کی چکی میں پسے عوام کی فلاح و بہبود اور عام آدمی کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے ایک خودکار، شفاف، قابلِ اعتبار اور مؤثر ٹیکس کے نظام کو فروغ دینا ناگزیر ہو چکا ہے۔ اس کے لیے ٹیکس اکٹھا کرنے والے اداروں کو جدید خطوط پر ٹیکنالوجی کے بھرپور استعمال کی بدولت از سرِ نو استوار کرنا لازم ہے، یہی وجہ ہے کہ ایف بی آر نے گزشتہ قلیل عرصے میں تیزی سے اس وژن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے ہیں۔ اب ٹریک اینڈ ٹریس کا خودکار نظام سگریٹ اور شوگر سیکٹرز پر لاگو کیا جا چکا ہے جس کا افتتاح خود وزیر اعظم صاحب کر چکے ہیں۔

ٹیکنالوجی کو ٹیکس نظام سے مزید مربوط کرنے کے لیے اور ریٹیل سیکٹر کے مجموعی کاروباری حجم کا درست احاطہ کر کے اس پر واجب الادا ٹیکس قومی خزانے میں محفوظ انداز میں لانے کا عمل یقینی بنانے کے لیے ملک بھر میں موجود بڑے ریٹیل سٹورز اور برانڈز کو پوائنٹ آف سیل سسٹم کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی فروخت کی ڈیجیٹل نگرانی ہو سکے گی اور خریداری کے وقت صارفین سے وصول کیا گیا سیلز ٹیکس قومی خزانے میں جمع کرانے کے عمل کو بھی یقینی بنایا جائے گا۔ ٹیکس معاملات کے بارے میں شعور و آگہی کے فقدان، تعلیم کی کمی اور قلتِ وقت کے سبب خریدار شاپنگ کرتے وقت سیلز ٹیکس ادا کرتے ہیں مگر وہ اس ضمن میں پکی رسید طلب نہیں کرتے اور نہ ہی اس امر کو یقینی بناتے ہیں کہ ان سے وصول کیا گیا ٹیکس قومی خزانے تک پہنچا ہے یا نہیں۔ اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹیکس وصول کرنے والے کئی تاجر حضرات وہ ٹیکس قومی خزانے میں جمع کرانے کے بجائے اپنی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں اور یوں سالانہ اربوں روپے کی ٹیکس چوری ہوتی ہے۔

پاکستان کے ریٹیل سیکٹر کا سالانہ کاروباری حجم تقریباً بیس ٹریلین روپے ہے اور اس میں سے محض چار ٹریلین کا کاروبار ٹیکس نظام میں اپنا حصہ ڈالتا ہے جبکہ اَسّی فیصد ٹیکس چوری میں ملوث ہے۔ اس ضمن میں دو مثالیں پیش کر کے صورتِ حال مزید واضح کرنا چاہتا ہوں ۔ گزشتہ دنوں اسلام آباد میں ایک معروف سٹور پر چھاپہ مارا گیا تو علم ہوا کہ اس کے ریکارڈ میں موجود ستائیس ہزار رسیدوں میں سے صرف چودہ سو رسیدوں پر وصول کیا گیا ٹیکس قومی خزانے میں جمع کرایا گیا تھا، باقی ماندہ ٹیکس خریداروں سے وصول کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک مشہور شو سٹور کے ریکارڈ میں محض دس ماہ کے دوران ڈیڑھ ارب کی سیلز کو چھپایا گیا اور اب ان کی طرف سے چالیس کروڑ روپے کی ٹیکس چوری کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ یہ صرف دو مثالیں ہیں، ان سے باقی حالات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ لندن، پیرس اور نیو یارک کی مثالیں دینے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہاں ٹیکس کلچر کے فروغ اور استحکام میں ہر فرد اپنی قابلِ ٹیکس آمدن، ذرائع اور اثاثہ جات کے مطابق حصہ ڈالتا ہے۔ یہاں ایسا کلچر رائج کر کے اور اپنی اہم قومی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس امر کو بھی یقینی بنایا جائے کہ وصول کیا گیا ٹیکس قومی خزانے تک محفوظ انداز میں پہنچا ہے یا نہیں تو یقیناً حالات بہتر ہو جائیں گے۔

اسی قومی ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کرنے اور پوائنٹ آف سیل پر وصول کیا گیا ٹیکس قومی خزانے تک پہنچانے کو یقینی بنانے کے لیے انعامی سکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اس سکیم کا مقصد خریداروں کو ٹیکس کے نظام میں براہِ راست شامل کرنا اور انھیں انعامات کے ذریعے ترغیب دینا ہے کہ وہ خریداری کرتے وقت ٹیکس سسٹم سے منسلک بڑے ریٹیلرز یا برانڈز سے خریداری کریں اور ان سے پکی رسید طلب کریں۔ آپ بھی اپنی قومی ذمہ داری نبھائیں اور یقینی بنائیں کہ آپ سے وصول کیا گیا ٹیکس قومی خزانے میں جمع ہوا ہے یا نہیں۔

□□□

تجدیدِ عہدِ وفا

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے عملی سیاست کا آغاز کانگریس کے رکن کی حیثیت سے کیا تھا اور بہت جلد چوٹی کے رہنماؤں میں اپنا مقام و مرتبہ بنالیا، آپ کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ میں بھی بہت مقبول تھے، یہی وجہ ہے کہ 1916ء کا میثاقِ لکھنو آپ کی مدبرانہ سیاست اور تحمل و برداشت کے جذبے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سنگِ میل کے حصول پر آپ کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر بھی کہا گیا مگر بہت جلد آپ پر کانگریس کی سیاسی تنگ نظری اور محدود سوچ آشکار ہونے لگی، بالخصوص تحریکِ خلافت، تجاویزِ دہلی اور نہرو رپورٹ میں یہ امر بالکل واضح ہو گیا تھا کہ کانگرس میں موجود ہندو انتہا پسند سوچ کسی صورت بھی برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مفادات اور معاشی حقوق کے تحفظ کے لیے سنجیدہ نہیں بلکہ اُن پر کاری ضرب لگانے کے لیے کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے کانگریس سے راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر لیں اور نہرو رپورٹ کے جواب میں چودہ نکات پر مبنی ایک جامع اور مربوط سیاسی پروگرام مرتب کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کے سامنے پیش کیا اور اسے منظور کروایا۔ رہی سہی کسر 1937ء میں کانگرسی وزارتوں کے ذریعے نکال دی گئی جب مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور

عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا اور مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ اس پر یہ بات ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر واضح ہوگئی کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت پسند سوچ کی جانب سے اقلیتی مسلمانوں کے ساتھ بہت غیر مناسب سلوک روا رکھا جائے گا اور انگریزوں سے آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم ہی مسلمانوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حقوق، معاشی خوشحالی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کی ضمانت بن سکتی ہے لہٰذا برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا قیام لازم تھا جس کا تصور علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں پیش کیا تھا۔

اس تناظر میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کا انعقاد منٹو پارک لاہور میں کیا گیا اور تین روز جاری رہنے والے اس تاریخی اجلاس میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ اور خودمختار ملک بنانے کے لیے چار سو الفاظ پر مبنی، چار پیرا گراف پر مشتمل ایک قرارداد پیش کی گئی جیسے قراردادِ لاہور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ قرارداد بنگال کے وزیر اعلیٰ شیرِ بنگال اے کے فضل الحق نے پیش کی تھی جس کی تائید پنجاب مسلم لیگ سے چوہدری خلیق الزماں اور مولانا ظفر علی خان، سندھ مسلم لیگ سے سر عبداللہ ہارون، مسلم لیگ صوبہ سرحد سے سردار اورنگزیب، مسلم لیگ بلوچستان قاضی محمد عیسیٰ نے کی، دیگر اکابرین میں نواب اسماعیل اور بیگم محمد علی جوہر بھی شامل تھے۔ اس تاریخی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ ''آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو؛ جغرافیائی طور پر متصلہ علاقوں کی حد بندی ایسے خِطوں میں کی جائے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے، ان کی تشکیل ایسی ''آزاد ریاستوں'' کی صورت میں کی جائے جس کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں نیز ان وحدتوں اور خِطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، مؤثر اور حتمی تحفظ اُن کے مشورے سے آئین میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔'' قراردادِ لاہور کا پاس ہونا تھا کہ ہندو سیاسی رہنماؤں اور

اخبارات نے آسمان سر پر اٹھالیا اور تمام بڑے اخبارات، جن میں بندے ماترم، پرتاب، ملاپ، اور ٹریبیون شامل تھے، نے قراردادِ لاہور کو قراردادِ پاکستان کہنا شروع کر دیا حالانکہ پوری قرارداد کے متن میں کہیں بھی لفظ ''پاکستان'' استعمال نہیں کیا گیا تھا، البتہ بیگم محمد علی جوہر نے اپنے خطاب میں اسے قراردادِ پاکستان ضرور کہا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگی قیادت نے اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور قراردادِ پاکستان کو سیاسی جدوجہد کا مرکزی نقطہ بنا دیا اور پھر محض سات سال کی قلیل مدت میں دُنیا کے نقشے پر پاکستان ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے طور پر معرضِ وجود میں آ گیا جو کسی کرشمے سے کم نہیں تھا۔

یاد رہے کہ اسی تاریخی اجلاس سے بانئ پاکستان نے تقریباً سو منٹ تک فی البدیہہ خطاب کیا تھا، آپ نے اپنی تقریر کا آغاز اُردو زبان میں کیا، چونکہ آپ برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ پوری عالمی سیاسی قیادت سے بھی مخاطب تھے اور بین الاقوامی برادری کے سامنے پاکستان کے قیام کے اغراض و مقاصد تفصیل سے رکھنا چاہتے تھے، اس لیے جلد ہی انگریزی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ آپ نے دُنیا کو باور کرایا کہ کس طرح ہندوستان میں دو مختلف قومیں، متضاد تہذیبیں اور تاریخی اعتبار سے الگ قسم کے لوگ آباد ہیں جن کی معاشرت، معیشت، ثقافت، سیاست اور رہن سہن بالکل مختلف ہے۔ قائداعظم نے فرمایا کہ ہندو معاشرہ ذات پات پر مبنی ہے جبکہ اسلام میں کسی شخص کو دوسرے پر محض رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی برتری نہیں اور نہ ہی لسانی یا گروہی بنیاد پر کسی کو فوقیت حاصل ہے بلکہ مسلمان معاشرہ عدل و انصاف، اخوت اور مساوات کے سنہری ابدی اصولوں پر قائم کیا گیا ہے لہٰذا ہندو اور مسلمان کسی صورت بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور سیاسی خودمختاری کا واحد حل ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام میں ہی مضمر ہے۔ یہی نظریۂ پاکستان دوقومی نظریے کی اساس بنا اور قیامِ پاکستان کا سب سے مؤثر محرک بھی ثابت ہوا۔ بانئ پاکستان کے خطاب کا خصوصی پہلو سامعین کا پورے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ یہ خطاب حرف بحرف سننا تھا، سامعین اگرچہ انگریزی زبان سے ناواقف تھے مگر اُن کا

ایمان تھا کہ قائداعظم جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، وہ بالکل سچ اور ایک اٹل حقیقت ہے۔

حسبِ توقع کانگریس کے رہنماؤں اور ہندو قائدین کا ردعمل بڑا سخت تھا۔ گاندھی اور نہرو سمیت سب کانگریسی رہنما دوقومی نظریے کے خلاف زہر اگلنا شروع ہو گئے اور مسلمانوں کے لیے الگ مملکت کے قیام کے مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا گیا اور اسے ہندوستان کی قومی وحدت کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ قائداعظم اور مسلم لیگی قیادت نے اس ہرزہ سرائی کو خاطر میں لائے بغیر شبانہ روز کاوشوں کا دائرہ بڑھا دیا اور ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا جب تک کہ پاکستان کے حصول کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گیا۔ یوں پاکستان ایک آزاد اور خودمختار ملک بن کر دُنیا کے نقشے پر ابھرا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت نے آج تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور شروع دن سے ہی اس کے لیے مشکلات اور مسائل کے پہاڑ کھڑے کرتا آیا ہے۔ وسائل کی تقسیم میں بھی بندر بانٹ کی گئی۔ ریڈ کلف ایوارڈ میں بھی پاکستان کے کئی علاقے بھارت میں شامل کر دیئے گئے اور کشمیر وادیٔ جنت نظیر کو ایک جعلی معاہدے کے تحت بھارت کے حوالے کر دیا گیا حالانکہ اس کی اکثریت آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی جو پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتی تھی۔ اس تنازع پر اب تک بھارت تین مرتبہ پاکستان پر جنگ مسلط کر چکا ہے اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے باوجود کشمیریوں کے تسلیم شدہ حقِ خودارادیت کو ماننے سے انکاری ہے بلکہ 5 اگست 2019ء سے وہاں بدترین کرفیو اور لاک ڈاؤن نافذ کر کے جبر کے زور پر معصوم نہتے کشمیریوں کے ساتھ آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں بھارت میں بسنے والی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا وہاں جینا بھی دوبھر کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں پر زندگی کا قافیہ تنگ کر دیا گیا ہے۔ یہ تمام حالات آج بھی قائداعظم کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ہمیشہ کی طرح امسال بھی یومِ پاکستان پورے جوش وخروش اور عقیدت واحترام سے منایا گیا۔ پاکستان کو درپیش اندرونی اور بیرونی خطرات کی بدولت وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ہم

تحریکِ پاکستان کے فقید المثال جذبے اور لازوال ولولے کو دوبارہ زندہ کرتے ہوئے پاکستان کو حقیقی معنوں میں قائداعظم کا پاکستان بنانے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں اور عام پاکستانی کے لیے خوشحالی اور معاشی استحکام یقینی بنانے کے لیے یکساں مواقع میسر کریں تا کہ ایک خودمختار، خوشحال اور خوددار پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ تجدیدِ عہدِ وفا کی ضرورت جتنی آج ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ آئیں! مل کر اپنی ارضِ پاک سے ایک بار پھر یہ وعدہ کریں...

تم سے اپنا یہ وعدہ ہے میرے وطن
تجھ سے تیرے اندھیرے مٹائیں گے ہم

❑❑❑

خواہشوں کے غلام

بحیثیت معاشرہ ہم اس المیے سے دوچار ہیں کہ اپنی زندگی میں احتیاط اور اعتدال، دونوں صفات کو غیر اہم گردانتے ہیں مگر دوسری طرف زندگی پُرسکون گزارنے کی خواہش اور تمنا بھی رکھتے ہیں۔ دراصل کامیاب اور متوازن زندگی کا راز قناعت اور اعتدال پسندی میں پوشیدہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں افراط وتفریط سے بچنا اور بیچ کی راہ اختیار کرنے کا نام اعتدال پسندی ہے۔ حق تعالیٰ نے کسی کو غریب اور کسی کو دولت مند بنایا مگر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں راحت اور سکون کی زندگی میسر ہے۔ بے شک دولت وثروت کم میسر ہو مگر اس پر بخوشی راضی رہنا ہی اصل زندگی ہے اور حقیقی خوشی بھی۔ قلبی اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ آپ مطمئن ہوں اور ذرائع آمدن کے مطابق اپنے اہل وعیال پر خرچ کریں۔ اگر اہلِ ثروت ہیں تو لباس، رہائش اور خوراک میں وسعت پیدا کریں لیکن اسراف سے بچیں۔ اگر نادار ہیں تو جو میسر ہے، اس پر قناعت کریں۔ قناعت اور معتدل مزاجی اعلیٰ ترین انسانی صفات ہیں۔ خواہشات کے تابع ہوئے بغیر بے جا لالچ اور حرص سے بچا جا سکتا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ لالچ اور حرص انسانی سرشت میں شامل ہیں۔ حرص کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ دولت کی، عہدے اور مرتبے کی، جائیداد کی، کاروں، گھروں

اور فیکٹریوں کی۔فطری طور پر انسان ازل سے خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہے۔کھانے،لباس، تقریبات اور مختلف رسوم ورواج کے نام پر دولت مند طبقہ اسراف میں حد سے نکل جاتا ہے یا اس قدر بخل سے کام لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہو سکے اور گھر والوں کو ترساتا رہتا ہے۔میانہ روی یہی ہے کہ نہ تو ہاتھ کھلے چھوڑ دیئے جائیں اور نہ گردن سے باندھ دیئے جائیں۔ اعمال وافعال ہوں یا عبادات،تعلقات ہوں یا رشتے داریاں،معاشرتی اقدار ہوں یا رسم ورواج، معتدل راہ اختیار کرنا ہم سب کے لیے اشد ضروری ہے۔اسی میں پُرسکون اور اطمینان بخش زندگی کا راز مضمر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''دولت مندی یہ نہیں کہ مال واسباب زیادہ ہو بلکہ دولت مندی یہ ہے کہ دل غنی و بے نیاز ہو۔'' (صحیح بخاری) کامیاب وہ شخص ہے جسے اسلام نصیب ہوا، گزر بسر کے لیے روزی ملی،تعلیم وتربیت کے مواقع اور صحت ملی، جو ماں باپ کی محبت اور شفقت میں پروان چڑھا اور جسے زندگی گزارنے اور جائز ذرائع آمدن کا وسیلہ عطا ہوا۔اطمینانِ قلب اور قناعت پسندی وہ نعمتیں ہیں جو فقیر کو بھی بادشاہ بنا دیتی ہیں۔اگر آپ کے پاس دولت اور دنیاوی نعمتوں کے ڈھیر ہوں مگر آپ کو دلی سکون میسر نہ ہو تو سب کچھ آپ کے کس کام کا؟ آپ کو سونے کے لیے سکون آور ادویات لینا پڑیں، کھانے میں نمک جیسی بنیادی چیز منع ہو تو سوچنے کی بات ہے زندگی پھیکی، بے چین اور ادھوری ہو گی۔قناعت پسندی کا درس قدرت نے جا بجا دیا ہے۔غور وفکر اور تدبر کی بات ہے۔سیپ کی قناعت کا انجام اور صلہ ہی ہے کہ قدرتِ کاملہ پانی کے ایک قطرے کو قیمتی موتی بنا دیتی ہے۔اگر سیپ قطرے پر قناعت نہ کرے تو پانی منہ سے باہر آنے لگے گا اور یوں سیپ موتی سے محروم ہو جائے گی۔نعمت تھوڑی بھی بہت ہوتی ہے اگر قناعت، اعتدال اور توکل پر اکتفا کیا جائے۔رزق رب کی عطا سے ملتا ہے۔ ہمارے مال،عزت اور مرتبوں پر صرف اپنا ہی حق نہیں، کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد ہوتی ہیں۔صلہ رحمی کرنا، پڑوسیوں کے حقوق،معاشرتی اور اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ ریاستی

اداروں اور بین الاقوامی اداروں کی طرف بنائے جانے والے معیارات اور قوانین کی پاسداری بھی ہمارا فرض ہے۔ جن پر اللہ کا فضل ہے، ان پر لازم ہے کہ وہ کمزوروں کو اپنے ساتھ شامل کریں۔ خلیفہ ہارون الرشید نے نہر کنارے چہل قدمی کرتے ایک شخص کو مچھلیاں پکڑتے دیکھا۔ رک کر پوچھا کہ کتنی مچھلیاں پکڑ لیتے ہو؟ جواب ملا: تین؛ ایک گھر میں استعمال کرتا ہوں اور دو بازار میں فروخت کر کے ضرورت کی اشیا لے لیتا ہوں۔ خلیفہ نے کہا مجھے اپنا حصہ دار بنا لو۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ مان گیا۔ اس کو نیا جال اور دیگر سامان خلیفہ نے مہیا کر دیا اور کہا کہ ہم دونوں آدھے آدھے کے حصہ دار ہوں گے، میرا حصہ جمع کرتے رہنا اور پھر بغداد آ کر مجھے دے جانا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ہارون الرشید کے عالی شان محل میں کھڑا خلیفہ کو اس کا حصہ دے رہا تھا تو حیران و پریشان تھا کہ اس کو حصہ داری کی کیا ضرورت تھی؟ خلیفہ نے سمجھایا کہ تمھاری قناعت پسندی کی وجہ سے میں نے تمھیں اپنا حصہ دار بنایا، تمھارے نصیب کا رزق بھی اب میرے رزق میں شامل ہو گیا ہے۔

دولت اور دنیاوی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی ضرورت اور اہمیت اس قدر ہے کہ اگر اس میں چھپی بھلائی اور مصلحت سمجھ میں آ جائے تو ہم ناشکری اور فضول خرچی کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ افسوس آج مال کی حرص اور خود نمائی کا رواج اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس ناسور نے معاشرے کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ احساسِ برتری اور مال و متاع پر فخر وغرور اور حسب ونسب پر تفاخر نے معاشرتی توازن بگاڑ دیا ہے۔ غریب اور دولت مند اشرافیہ کے لائف سٹائل یکسر الگ الگ ہو گئے ہیں۔ تفریق بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 60 فیصد شہری خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی میں ایک طرف غیر معیاری اشیا اور مراعات یافتہ طبقے کے لیے برانڈڈ اشیائے خورونوش دستیاب ہوں گی تو احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی شدت سے جنم لے گا۔ لوگ دولت جائز اور ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے میں اس قدر مگن ہیں کہ مخبوط الحواس ہو چکے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں ''کوئی شخص قناعت سے بے جان نہیں ہوتا،

کمزوری اور احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا، حرص کے سبب کوئی انسان سلطان نہیں بن جاتا۔''

پاکستان ہی میں نہیں، دنیا بھر میں اسراف، احساسِ برتری اور دکھاوے کا رواج ہے۔ امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک مہنگی ترین مارکیٹ موجود ہے جہاں موزے کے ایک جوڑے کی قیمت بھی دو ہزار ڈالر سے کم نہیں۔ باقی اشیا کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم بے جا خواہشات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنے جائز ذرائع آمدن میں صبر اور شکر کے ساتھ جینا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے وسائل اور اخراجات میں توازن رکھنے کا ہنر اور سلیقہ سیکھنا ہوگا۔ دوسروں کے نصیب اور مقدر سے حسد کرنے کے بجائے قناعت اور اعتدال پسندی کی روایت اپنانے کی کوشش اور صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ جھوٹی اور تصنع والی زندگی سے سوائے بے سکونی، بے چینی اور خود فریبی کے کچھ نہیں ملتا۔ ہمیں اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی ضرورت ہے، اسی کے اندر خوشی اور اطمینانِ قلب پوشیدہ ہے۔ شیخ سعدی ؒ گلستانِ سعدی میں ایک واقعہ درج کرتے ہیں کہ حریص کی مثال ایسے ہے کہ حرص کے سبب پورا سمندر کوزے میں بھرنا چاہتا ہے۔ ایک دفعہ شیخ سعدی نے اپنے تاجر دوست کے گھر رات کو قیام کیا، رات بھر اس نے سونے نہیں دیا اور اپنی کامیاب تجارت کے قصے سناتا رہا۔ جب ایران اور توران کی سنا چکا تو کہنے لگا کہ اس کی ساری آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں، بس ایک آخری خواہش باقی ہے۔ شیخ سعدی نے پوچھا: وہ کیا؟ کہنے لگا کہ میں فارسی گندھک لے کر چین جاؤں، چین سے برتن لے کر روم جاؤں، روم کا کپڑا لے کر ہندوستان بیچوں، ہندوستان سے فولاد لے کر شام جاؤں، شام سے شیشہ لے کر یمن فروخت کروں، یمنی چادریں لے کر واپس فارس آجاؤں۔ شیخ سعدی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا جہاں لالچ کی بے حساب لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ پھر اس نے لمبا سانس لیا اور کہا: اس کے بعد میں بقیہ زندگی اپنی دکان پر گزاروں گا۔ شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں ''دنیا دار کی تنگ نگاہ کو یا تو قیامت پُر کر سکتی ہے یا قبر کی مٹی، تیسرا کوئی راستہ نہیں۔'' ایک طرف خواہشوں کے غلام ہیں جنھیں مال وزر اور شان وشوکت کے فریبوں نے اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے تو دوسری طرف فقر ومستی کی دنیا آباد کیے ہوئے وہ خوش نصیب، جو

روحانی سکون اور قلبی اطمینان کی دولتِ بے پایاں سے مالا مال ہیں۔ آپ خود کو کہاں دیکھتے ہیں؟

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

❑❑❑
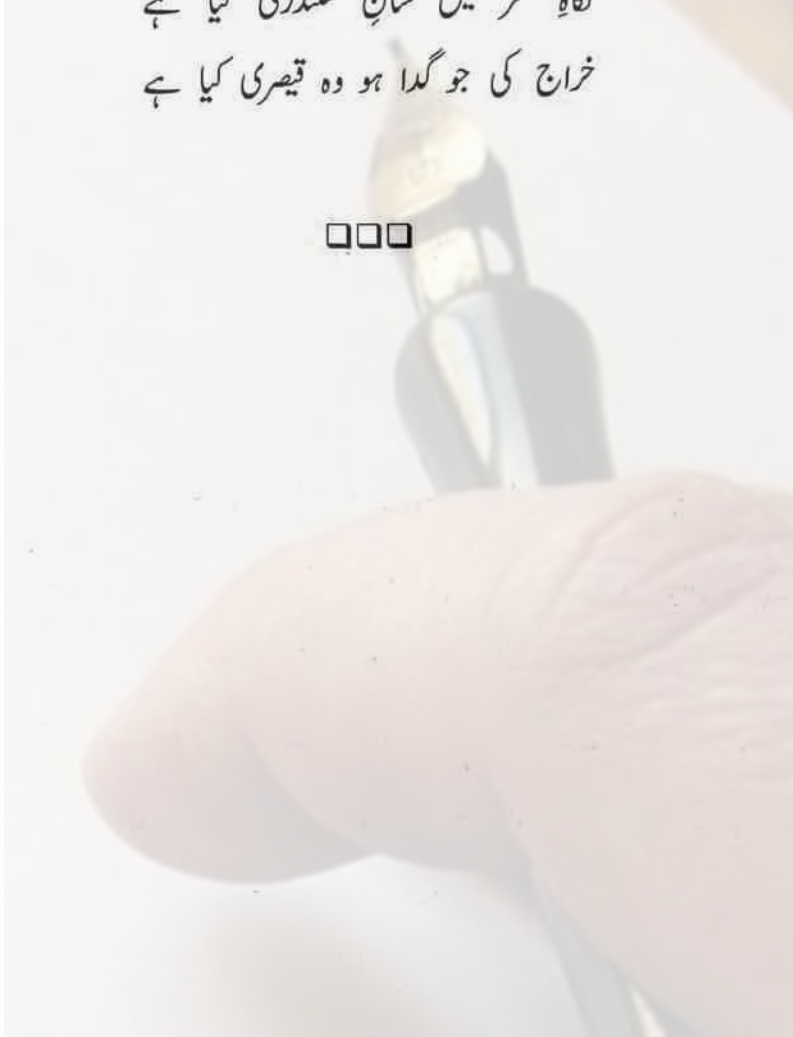
ورکنگ ویمن

ہاؤس وائف مضمون لکھنے کے بعد میں ووکنگ ویمن کے متعلق لکھنے پر سوچ بچار کر رہا تھا کہ اتنے میں میرے دو خاص مہمان، پروفیسر رحمت علی صاحب المعروف ''بابا جی'' اپنے چہیتے چیلے جیدی میاں کے ساتھ آن پہنچے۔ بابا جی شعبۂ تاریخ کے نامور استاد رہے ہیں اور اس کے علاوہ فلسفہ، تصوف اور مذہب پر پُرمغز گفتگو کرنے پر ملکہ رکھتے ہیں جبکہ جیدی میاں اُن کے ہوشیار شاگردوں میں سے ہیں اور برطانیہ سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مختلف لا کالجز میں لیکچر دیتے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جب بھی میں کسی مشکل موضوع کی گتھیاں سلجھانے بیٹھتا ہوں عین اسی وقت بابا جی جلوہ افروز ہو جاتے ہیں اور میری مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ کرسی پر براجمان ہوتے ہی جیدی میاں خود کو آزادئ نسواں کا علمبردار ثابت کرنے پر تُل گیا اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اللہ بھلا کرے بابا جی کا جنھوں نے اس طوفان کو اپنے استدلال اور منطقی دلائل سے سنبھالا دیا۔

بابا جی کی گفتگو کا خاص پہلو اُن کی تاریخی حوالوں پر مکمل دسترس ہے۔ حقوقِ نسواں کے تاریخی تناظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بابا جی گویا ہوئے ''جب سترہویں صدی میں برطانیہ میں صنعتی انقلاب شروع ہوا تو جہاں ایک طرف برطانیہ کا قومی خزانہ دھڑا دھڑ بھرنا شروع ہوا وہیں دوسری

طرف مصیبت یہ آن پڑی کہ وسائل زیادہ ہو گئے اور ان کو بروئے کار لا کر ملک کو آگے لے جانے والے لوگ کم رہ گئے۔ برطانیہ کے پاس اتنے ٹھیکے تھے کہ انھیں پورا کرنے کے لیے مزدور کم پڑ گئے۔ اس ضمن میں عورتوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا گیا مگر عورتوں کو گھر سے باہر لانا آسان نہ تھا اور تقریباً تمام مذاہب اس چیز کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے لہٰذا سب سے پہلے ایک آزاد خیال عورت ''میری والسٹون کرافٹ'' کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ عورت کی آزادی پر بات کر کے اُسے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے پر قائل کرے۔ اِس ضمن میں 1796ء میں ایک کتاب ''اے ونڈیکیشن آف دی رائٹس آف ویمن'' سامنے آئی، جس نے عورت کی سوچ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اس کتاب کو عالمی سطح پر بے حد پذیرائی ملی اور اس کے بعد عورتوں نے گھر سے نکلنا شروع کر دیا مگر ایک حیران کن اور انتہائی اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کی مصنفہ کے انتقال کے بعد اس کی آپ بیتی ''میموریز آف دی آتھر آف ونڈیکیشن آف دی رائٹس آف ویمن'' اس کے شوہر ولیم گوڈون کی مدد سے منظرِ عام پر آئی۔ اس خود نوشت کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آزاد خیال مصنفہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے پوری زندگی مختلف اخلاقی اور سماجی مسائل کا شکار رہی، یہاں تک کہ اس نے بارہا خودکشی کی کوشش بھی کی۔

''تو بابا جی! آپ کا کیا خیال ہے کہ نصف آبادی کو گھر بٹھا کر ملک کی تعمیر و ترقی کا سفر روک دیا جائے؟'' جیدی میاں نے مزید تیر کمان سے نکالتے ہوئے تند و تیز سوالات کے انبار لگا دیئے۔ ''عورت اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر خود کو ضائع کر لے؟ اسے جینے کا، خوش ہونے کا کوئی حق نہیں؟ وہ دن رات بچوں اور شوہر کے لیے وقف کر دے لیکن زندگی کو اپنی مرضی سے نہ گزارے؟ کیا وہ انسان نہیں؟ عورت میں وہ سب صلاحیتیں موجود ہیں جن کی بنا پر وہ دُنیا تسخیر کر سکتی ہے۔'' باباجی کے چہرے پر پھیلی حکمت کی جھلک مزید واضح ہوئی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے۔ ''دیکھ پتر جیدی! مرد اور عورت فطرت کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو اس قدر لازم اور ضروری ہیں کہ ایک نہ ہو تو کہانی ادھوری رہ جاتی ہے، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں لیکن ذمہ داریاں الگ الگ

ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ عورت نوکری کرتی کیوں ہے؟ درحقیقت معاشرے میں خواتین کے چار طبقے ہیں۔ پہلا طبقہ گھریلو خواتین پر مشتمل ہے جس کی خصوصیات (پچھلے مضمون میں) بیان ہو چکیں، جن سے میں متفق بھی ہوں۔ دوسرا طبقہ ان خواتین پر مشتمل ہے جن کے مالی حالات اس قدر غیر مستحکم ہیں کہ انھیں اپنے خاوند کا معاشی بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے اور عورتوں کا سب سے مظلوم طبقہ یہی ہے جن پر امورِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ رزق کمانے کی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ یہ خواتین گھر کے کاموں، کھانا پکانے، بچوں کی بہترین پرورش سے لے کر اخراجات تک سب بوجھ خود اٹھاتی ہیں اور یوں زندگی کا پہیہ چلانے کی جہدِ مسلسل میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ تیسرا طبقہ ان خواتین کا ہے جو بے پناہ صلاحیتوں کی مالک اور اعلیٰ تخلیقی ذہن کی حامل ہوتی ہیں جن کے لیے انگریزی میں ''بلیوسٹاکنگ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ خواتین سمجھتی ہیں کہ وہ معاشرے کی ترقی میں اہم ترین کردار ادا کر سکتی ہیں اور دُنیا کو ایک نئی سوچ دے سکتی ہیں۔ یہ خواتین پُروقار شعبے کا چناؤ کر کے گھریلو ذمہ داریوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتی ہیں اور اگر کبھی گھر اور کام میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑے تو یہ گھر کو ترجیح دیتی ہیں۔ چوتھا اور آخری طبقہ ان خواتین کا ہے جو نہ تو ذہین ہوتی ہیں اور نہ ہی گھریلو ذہن رکھتی ہیں؛ وہ بس آزادی چاہتی ہیں۔ ان کا مذہب سے لگاؤ ہوتا ہے نہ معاشرتی رسم و رواج سے کوئی سروکار، انھیں بس آزادی چاہیے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ کس سے آزاد ہونا چاہتی ہیں۔ نہایت قلیل تعداد پر مشتمل خواتین کا یہ طبقہ رشتوں کو بوجھ اور بچوں کو پاؤں کی بیڑیاں سمجھتا ہے'' ''بابا جی پلیز!'' اب جیدی میاں کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، وہ چیخ اٹھا۔ ''بابا جی! آپ اس قدر اینٹی ویمن ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آپ نے خواتین کے جس چوتھے طبقے کی بات کی ہے وہ طبقہ ہی اصل زندگی جی رہا ہے، ایسی زندگی جو ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہ مرد ہوتا کون ہے عورت کو یہ بتانے والا کہ وہ کیا پہنے اور کیا نہ پہنے، کس سے ملے اور کسے نظر انداز کرے، گھر میں بیٹھے یا نوکری کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ لوگ عورت کو انسان سمجھتے ہی نہیں، آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اُف تک نہ

کہے۔ اگر عورت ان فرسودہ روایات سے فرار چاہے اور اپنی خوشی سے جینا چاہے تو وہ باغی اور آوارہ کہلاتی ہے۔ یہ سراسر انسانیت کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔''

اس سے پہلے کہ اس ساری بحث میں مَیں اپنا حصہ ڈالتا، بابا جی پھر گویا ہوئے۔ ''بہت خوب! تیری ساری باتیں دل کو لگتی ہیں پر تو جو عالم فاضل بن کے ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتا پھرتا ہے، اگر آج سے 40 سال پہلے ایک عورت تجھے اپنی آغوشِ محبت میں نہ چھپاتی، دن رات ایک کر کے تیری تربیت نہ کرتی تو کیا ہوتا؟ وہ عورت جس کی سانسوں سے وظیفوں کی اٹھنے والی خوشبو سیدھا تیرے دل تک جاتی اور تو سرشار ہو جاتا۔ وہ عورت جو گھنٹوں تیرا سر گود سے اس لیے نہ نکالتی کہ کہیں تیری نیند خراب نہ ہو۔ جو تجھے توے سے گرما گرم روٹی اتار کر دیتی تاکہ تیرا جسم طاقت پکڑے اور تو ترقی کے سفر پر گامزن رہے۔ وہ عورت جو تیرے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بے حد سنجیدہ لیتی اور ان کے حل کے لیے اپنی جان لڑا دیتی۔ اگر تیری ماں بھی آزادی کا نعرہ لگا کر ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کا اعلان کر دیتی تو آج تمھاری یہ جاندار شخصیت کبھی سامنے نہ آتی۔ جیدی بیٹا! عورت اللہ کی رحمت ہے، اللہ نے اسے باعثِ سکون و راحت بنایا ہے۔ یہ نسلوں کو سنوارنے کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اسی لیے اِسے مسندِ توقیر عطا کی گئی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ مغرب کے نام نہاد تہذیب یافتہ معاشرے میں دو تہائی عورتیں شدید ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں، ان کی جوانی تو کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے مگر بڑھاپا سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ یاد رکھیں! اللہ نے جس عورت کے پاؤں کے نیچے ہمارے لیے جنت رکھ دی ہے ہم اسے کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں جبکہ اللہ نے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں صرف مرد پر عائد کی ہیں۔'' گفتگو میں مختصر سا وقفہ آ گیا اور مکمل خاموشی چھا گئی۔ ''جیپہ صاحب کافی پلائیں!'' جیدی میاں نے ہشاش لہجے میں کہا، جو وہ اکثر بات بدلنے کے لیے استعمال کرتا ہے، میں نے سب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

□□□

وَن مور چانس!

وہ 1951ء کی ایک اداس شام تھی جب امریکا کے شہر کینٹکی کے ایک پارک میں گھنے پیڑ کے نیچے رکھے بینچ پر بیٹھا ایک 61 سالہ مایوس بوڑھا یہ سوچ رہا تھا کہ کاش نبضِ حیات تھم جائے۔ یہ خرقہ پوش اپنی بدنصیبی سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا اور اب کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اپنی زندگی کا چراغ گُل کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں سوائے ناکامی اور نامرادی کے اور تھا ہی کیا؟ عجیب وحشت کا عالم تھا۔ اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچ لیں اور اس کی پوری زندگی کے مصائب، ناکامیاں اور مسائل ایک فلم کی طرح اس کے دماغ کی سکرین پر چلنے لگے۔

9 ستمبر 1890ء کے دن امریکی ریاست انڈیانا میں سکونت پذیر مسٹر ڈیوڈ سینڈرز اور مارگریٹ نامی خاتون کے ہاں ان کی پہلی اولاد نے جنم لیا، جس کا نام ہارلینڈ سینڈرز رکھا گیا۔ صرف پانچ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مارگریٹ نے شوہر کی موت کے بعد اپنے تینوں پھولوں کو مرجھانے سے بچانے کے لیے دن رات محنت کی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنے بچوں کے بدن ڈھانپنے کا سامان کرتی رہی۔ ماں فیکٹری جانے لگی تو ننھا ہارلینڈ چھوٹے بہن بھائی کیتھرین اور کلیرنس کو سنبھالنے لگا۔ فیکٹری سے واپسی پر ماں اپنے بیٹے کو دیکھتی تو لرز جاتی۔ اسے اپنے کم سن بیٹے کے چہرے پر 60 سالہ بوڑھے کی سنجیدگی اور فکر مند آنکھیں نظر آتیں کیونکہ اپنی ماں کے بعد اب وہ گھر کا ''بڑا'' تھا۔

اسی دوران ہارلینڈ نے گھر کا چولہا ہانڈی بھی سنبھال لیا اور وہ دن ہارلینڈ کی زندگی کا خوشگوار ترین دن تھا جب اس نے چھ سال کی عمر میں پہلی بار بریڈ تیار کی۔ بہن بھائیوں کو کھلانے کے بعد لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالنے ہی لگا کہ ماں کا خیال آ گیا جو روزی کمانے بنا کچھ کھائے ہی نکل گئی تھی۔ ہارلینڈ نے اپنے دونوں ننھے بہن بھائیوں کو ہمراہ لیا اور چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس فیکٹری جا پہنچا جہاں ماں مزدوری کرتی تھی۔ ماں نے دور سے اپنے بچوں کو دیکھا تو دیوانہ وار اپنے بچوں کی طرف بھاگی اور انھیں سینے سے لگا لیا۔ اسی اثنا میں ہارلینڈ نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ اپنے ننھے ہاتھوں سے تیار کردہ بریڈ ماں کی خدمت میں پیش کی تو ماں کی آنکھیں خوشی سے چھلک گئیں اور اس نے اپنے بیٹے کو دعا کی دولت سے نوازا۔ یہ وہ دعا تھی جو تمام عمر ہارلینڈ سینڈرز کے ہمراہ رہی اور جس نے کبھی اُسے تھکنے نہیں دیا۔ اسی طرح چند سال اور گزر گئے تو روز و شب کی مسلسل محنت سے تھکی ماندی مارگریٹ دوسری شادی کر کے اپنے تین بچوں کے ہمراہ گرین ووڈ آن بسی لیکن اس کا بیٹا ہارلینڈ سینڈرز اُجڑ گیا۔ سوتیلے باپ کے ناروا سلوک نے اس تیرہ سالہ لڑکے کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ راستوں کی دُھول اس کا مقدر ٹھہری مگر یہ چلتا رہا۔ اس نے فارم پر کام کرنا شروع کیا مگر ناکام رہا؛ پولیز کے شہر میں گھوڑا گاڑیوں کو رنگنے کا کام بھی اس کی زندگی میں کوئی رنگ نہ بھر سکا؛ بطور کنڈیکٹر ملازمت اختیار کی مگر یہاں بھی ناکامی کا سامنا رہا؛ فوج میں بھرتی ہوا نکال دیا گیا، انشورنس اور کریڈٹ کارڈ بیچے تو وہ بھی ایک سعیٔ لاحاصل ثابت ہوئی۔ لیکن جب ریلوے کی ملازمت اختیار کی تو اس کی قسمت نے ہلکا سا تبسم کیا اور اس کی ملاقات جوسفن نامی لڑکی سے ہوئی جو اس کی شریکِ حیات بنی اور اسے تین خوبصورت بچوں کا تحفہ دیا۔ مگر جلد ہی وہ ریلوے کی ملازمت سے بھی نکال دیا گیا۔ جمع پونجی ختم ہوئی اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچی تو نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا۔ اب وہ نجی زندگی میں بھی مکمل طور پر ناکام ہو چکا تھا لیکن ہارلینڈ سینڈرز کسی بھی طور خود کو ناکام شخص ماننے کو تیار نہ تھا۔

ہارلینڈ ملازمتوں میں مسلسل ناکامی سے اُکتا چکا تھا، لہٰذا اس نے کاروبار کا فیصلہ کیا۔ اس

نے لال ٹین کی کمپنی بنائی جو ابتدا میں بہتر چلنے لگی لیکن شومئ قسمت کہ بلب بنانے والی کمپنی ٹیلکو کے مارکیٹ میں آتے ہی اس کی کمپنی کا چراغ بجھ گیا۔

1929ء میں ہارلینڈ کینٹکی جا پہنچا اور یہاں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اُسے بچپن سے چکن کی مختلف ریسپیز بنانا آتی تھیں اور فرائی چکن کی ایک ریسپی پر اُسے بے پناہ یقین تھا، لہٰذا اس نے کینٹکی میں ایک گیس سٹیشن کھولا اور اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنالیا، وہاں اس نے اپنی شاندار ریسپی فرائیڈ چکن کی ترسیل شروع کی جسے لوگوں نے بے پناہ پسند کیا۔ کینٹکی کے گورنر کو اس کا فرائیڈ چکن اس قدر پسند آیا کہ اس نے اُسے کرنل کے خطاب سے نواز دیا۔ اب وہ کرنل ہارلینڈ سینڈرز بن چکا تھا، لیکن یہاں بھی اس نے منہ کی کھائی اور بدقسمتی سے اس کا چلتا ہوا ریسٹورنٹ ہائی وے کی زد میں آ گیا اور حکومت کی طرف سے 105 ڈالر ماہانہ پنشن کے عوض یہ ریسٹورنٹ گرا دیا گیا۔ اس عمارت کے گرتے ہی ہارلینڈ کا حوصلہ بھی گر گیا۔ اب اس کی عمر 61 برس ہو چکی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب اسے محسوس ہوا کہ اس طویل عمر میں اس نے ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں کمایا۔ اب یہ ناکام بوڑھا کمزور لمحات کی شکستہ زمین پر اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا بوجھ اٹھائے تاریک راستوں پر سائے کی مانند رینگ رہا تھا۔ اس کے سامنے سوچوں کی پگڈنڈی دُور مستقبل کے بنجر ٹیلوں میں جا کر گم ہو جاتی تو یہ تھک کر اپنے ہی بدن کے شکستہ سائے میں بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھیں موند لیتا۔

پارک میں بیٹھے اس مایوس بوڑھے نے آنکھیں کھولیں تو پارک لوگوں سے خالی ہو چکا تھا، برقی قمقموں کی روشنی اس کی ویران آنکھوں سے ٹکرائی تو اس نے مایوسی کا بوسیدہ لباس اتار پھینکا اور زندگی کو ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ ''ون مور چانس'' کے تین الفاظ اسے زندگی میں واپس لے آئے، اُسی لمحے اس نے عزمِ صمیم کیا کہ وہ آخری سانس تک ہار نہیں مانے گا۔ دل میں امید اور اعتماد کے نئے چراغ روشن کر کے وہ کامیابی کے تعاقب میں دوبارہ نکل پڑا۔ اس خالی ہاتھ بوڑھے نے ایک دوست سے 83 ڈالر ادھار لیے، پریشر ککر اور گیارہ مصالحے اٹھا کر اپنی ریسپی کی فرنچائز

بیچنے نکل کھڑا ہوا، جسے ہارلینڈ خفیہ ریسیپی قرار دیتا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ پوری دُنیا میں اس سے بہتر فرائیڈ چکن کی کوئی ریسیپی نہیں۔ یہاں بھی اس نے دردر کی ٹھوکریں کھائیں اور ایک ہزار نو ریسٹورنٹس نے اسے یکسر مسترد کر دیا مگر اس بوڑھے نے پھر بھی ہار نہیں مانی، بالآخر 1952ء میں پیٹر ہارمن نے اپنے ریسٹورنٹ کے مینیو میں ہارلینڈ کی ریسپی کینٹکی فرائیڈ چکن کے نام سے شامل کر لی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب قسمت اور دولت کی دیویاں اس پہ اچانک مہرباں ہوئیں۔

ہارلینڈ کی زندگی کا سنہرا دور شروع ہوا، جب نوے فیصد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے آرام کا وقت ہے۔ لیکن اسی وقت ہارلینڈ کی زندگی کا سب سے کامیاب اور خوبصورت دور شروع ہوا اور یوں 1955ء میں اُس نے اپنی کمپنی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وہ ہارلینڈ سینڈرز جسے کل تک لوگ باہر کا راستہ دکھایا کرتے تھے، اس کے آفس کے باہر قطار در قطار فرنچائیز کے حصول کے لیے لوگ کھڑے ہوتے۔ ہارلینڈ کی فرائیڈ چکن ریسپی امریکا سے نکل کر کینیڈا اور پھر برطانیہ سے ہوتی ہوئی پوری دُنیا میں پھیل گئی۔ پوری دُنیا ہارلینڈ سینڈرز کی صلاحیتوں کا لوہا مان چکی تھی۔

1964ء میں ہارلینڈ نے دوملین ڈالرز کے عوض اپنی کمپنی بیچ دی اور چالیس ہزار سالانہ تنخواہ پر کمپنی کے برینڈ ایمبیسڈر کے طور پر تاحیات کام کرتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے دُنیا کی دوسری مقبول ترین شخصیت قرار دیا گیا۔ 16 دسمبر 1980ء کو یہ ناقابلِ شکست انسان پُرسکون چہرے کے ساتھ دُنیا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گیا، مگر اس کی زندگی میں ہی اس کی فرائیڈ چکن کمپنی کے 48 ممالک میں پانچ ہزار فرنچائیز ریسٹورنٹس موجود تھے۔

چمکتی آنکھوں اور غیر متزلزل حوصلے والا یہ بوڑھا کرنل ہارلینڈ سینڈرز بے مثال عزم و ہمت کا استعارہ بن کر ہمیں جُہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کا درس دیتا نظر آتا ہے۔ اگر آپ کبھی زندگی میں ناکامیوں، مایوسیوں، پریشانیوں اور مسائل کی بند گلی میں پھنس جائیں تو شکستِ آرزو تسلیم کرنے کی بجائے خود کو ایک اور موقع ضرور دیں۔ ہوسکتا ہے وہی لمحہ آپ کی قسمت بدل ڈالے۔

□□□

تعارف نہیں، تعاون

صبح سویرے حسبِ معمول پرائمری سکول کے دوستوں کے ساتھ پورے جوش وخروش سے خوش گپیاں جاری تھیں کہ اچانک سناٹا چھا گیا کیونکہ ہمارے ایک لمبے تڑنگے ساتھی نے گاؤں سے آنے والے تانگے میں سوار پولیس والوں کو دیکھتے ہی اعلان فرمایا، ''پولیس!'' پوری شدومد سے چہکتا ہوا سکول پل بھر میں ایسے خاموش ہو گیا جیسے کوئی شہرِ مدفون۔ مجھ سمیت سکول کے اکثر طلبہ نے یقیناً پولیس کے بارے سن رکھا تھا مگر شاید پہلے کبھی دیکھا نہ تھا اُس دن پہلی مرتبہ پولیس کو اپنے سامنے پا کر ہم خوف سے سہم گئے۔ سکول کی کچی اور ٹوٹی پھوٹی دیوار کی اوٹ لے کر تانگے کی آمد کا انتظار شروع ہوا کیونکہ سڑک سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی تھانے تک جاتی تھی اور جوں جوں تانگہ قریب آتا گیا، ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں اور سانسیں پھولنے لگیں۔ چند لمحات میں تانگہ ہمارے سکول کے سامنے سے گزرنے لگا، ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پانچ چھ افراد کے ہاتھ اُن کی قمیصوں کے ساتھ پیٹھ کے پیچھے باندھے گئے تھے اور وہ تانگے کے آگے تقریباً بھاگتے ہوئے جا رہے تھے جبکہ تانگے پر کوچوان کے علاوہ وردی میں ملبوس دو عدد سپاہی موجود تھے جن کا رعب اور دبدبہ بلاشبہ دیدنی تھا، وہ رعونت کی عملی تصویر نظر آئے۔ ایک سگریٹ کے کش

لگا رہا تھا تو دوسرا ملزمان کو گالیاں دیتا، جانوروں کی طرح ہانک رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے پولیس کا رعب اور خوف، دونوں میرے قلب وروح میں مستقل گھر کر بیٹھے۔

پولیس سے اصل ٹاکرا تو اس وقت ہوا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھائی شروع کی، سیف بھائی اور میں، دونوں موٹر سائیکل پر کالج آنے جانے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سیف بھائی براجمان ہوتے کیونکہ انھیں اپنی مہارت پر ناز تھا جبکہ چھوٹا بھائی ہونے کے سبب میری ذمہ داری کتابیں پکڑ کے پیچھے چپ چاپ بیٹھنا ہوتی تھی کیونکہ زیادہ گفتگو کی وجہ سے اکثر ہم کالج کا راستہ بھول جاتے تھے۔ لاہور ویسے بھی اتنا بڑا شہر ہے اور شروع شروع میں تو سب عمارتیں، چوک، چوراہے اور ٹریفک سگنلز ایک جیسے نظر آتے تھے۔ کالج آنے جانے میں سب سے بڑا امتحان ٹریفک پولیس سے نظریں بچا کر اشارہ کراس کرنا تھا۔ ہماری اولین ترجیح چلتی ہوئی ٹریفک میں نکلنا ہوتی مگر اکثر اشارہ بند ملتا تو سیف بھائی بڑی ہوشیاری سے کسی بس یا ویگن کے پیچھے چھپ کر موٹر سائیکل کھڑی کرنے کی ناکام کوشش میں ٹریفک کانسٹیبل کی عقابی نگاہوں کا تارا بن جاتے، جو ہمیں دور سے ہی مشکوک انداز میں دیکھتا اور پلک جھپکتے ہی ہمارے قریب آکر ہم سے موٹر سائیکل کے کاغذات اور ڈرائیونگ لائسنس طلب کرتا۔ کم عمری و کم علمی کی وجہ سے لائسنس تھا ہی نہیں اور کاغذات کی فوٹو کاپی اسے قابلِ قبول نہ تھی، اکثر بیس روپے میں معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ یاد رہے کہ 1990ء میں پٹرول آٹھ روپے لیٹر تھا اور بہترین ٹیلر شلوار قمیص کی سلائی کے پچیس روپے لیتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے ذہانت کا مظاہرہ کیا اور جیب میں کاغذ کے ٹکڑے رکھنے شروع کر دیئے، جیسے ہی کانسٹیبل ہمارے قریب آتا، میں نہایت پُراعتماد انداز میں اس کی مٹھی میں اپنی بند مٹھی کھول دیتا اور وہ اس سے زیادہ تیزی سے اپنی پینٹ کی سائیڈ پاکٹ میں یہ ''معقول رقم'' ڈال لیتا۔ یوں ہم اپنی عزت اور معیشت دونوں محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

زندگی کے ماہ و سال گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں معاشرتی ڈھانچے کی سمجھ آئی، پولیس کلچر کا ادراک شروع ہوا، طاقت کا معیار اور اخلاقی اقدار کے بارے میں سوجھ بوجھ بڑھنا شروع ہوئی۔

آئے روز پولیس کی وردی، طاقت کا اظہار اور استعمال دیکھنے کو ملتا۔ تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا اور رزلٹ آئے ہی گورنمنٹ کالج کمالیہ میں بطور لیکچرار تعیناتی ہو گئی۔ فروری 1996ء میں ایم اے انگلش لٹریچر کے طلبہ کو پڑھانا شروع کیا تو وہاں کئی سٹوڈنٹس مجھ سے عمر میں بڑے اور ڈیل ڈول میں زیادہ تگڑے نظر آئے۔ چند ایک شادی شدہ بھی تھے اور صاحبِ اولاد بھی۔ لاہور سے کمالیہ منتقل ہوا تو ہاسٹل میں قیام ٹھہرا اور ساتھ ہی مقابلے کے امتحانات کی تیاری شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں مقابلے کے تین امتحانات دیئے، 1998ء کے اوائل میں تینوں امتحانات کے نتائج آئے اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے چند ہفتوں میں ہی تین آفر لیٹرز بھی پہنچ گئے۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے ایف بی آر میں بطور انکم ٹیکس آفیسر کی تقرری کی سفارش کی تو پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل فنڈ آڈٹ اور پنجاب پولیس میں بطور انسپکٹر نوکری کے لیے موزوں قرار دیا۔ یوں پچیس برس کی عمر میں بطور لیکچرار تین مختلف سرکاری نوکریاں ہاتھ لگ جانے کی خوشی یقیناً ناقابلِ بیان تھی۔

زمانہ طالب علمی سے نکلے تو انگریزی ادب کے استاد کے طور پر معاشرتی مقام میں کوئی خاص فرق نہ پڑا اور نہ ہی محسوس ہوا تھا مگر جیسے ہی تین رعب دار نوکریاں ہاتھ آئیں تو جیسے مجھے سرخاب کے پر لگ گئے ہوں اور قسمت کا ہُما میرے ہی کندھے پہ آن بیٹھا ہو۔ چند دنوں میں سب کچھ بدل گیا، رویے تک تبدیل ہو گئے۔ سب دوست، رشتہ دار مجھے اہم آدمی سمجھنے لگے۔ بھولے بسرے دوست قربتیں بڑھانے لگے، دور نزدیک کے رشتہ دار چاچے، مامے اور کزن سے کم اپنا تعارف کروانے پر تیار نہ تھے۔ ہر کسی نے ضرورت سے زیادہ عزت دینا شروع کر دی۔ وفاقی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن کے تین امتحانات میں ٹاپ پوزیشنز پر کامیاب ہونے کی وجہ سے قریبی دوستوں میں میری علمی اور ادبی برتری کی دھاک بیٹھ چکی تھی اور میری ذہانت اور مہارت کا چرچا چارسُو ہونے لگا تھا، جو مجھے موٹر سائیکل ادھار دینے پر تیار نہ ہوتے تھے، اب گاڑیاں لا کر آگے پیچھے پھرنے لگے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ زندگی کی اصل

حقیقت کیا ہے، لوگوں کے مفادات کتنے اہم ہیں، اور میری اصل حیثیت کیا ہے، مجھے سب معلوم ہو گیا!

یکے بعد دیگرے تین تقرر نامے ملنے پر جہاں بہت زیادہ خوشی ہوئی وہاں ایک شعبے کا انتخاب بھی بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ ہر شخص کی رائے مختلف تھی، نقطہ نظر اور زاویۂ نگاہ یکسر الگ تھا۔ جو ملتا، وہ اپنے تجربے کے مطابق رائے دیتا اور اسے حتمی انتخاب بنا کر پیش کرتا۔ کوئی پولیس کے حق میں تھا تو کوئی ایف بی آر کے گن گاتا۔ تیسرا لوکل فنڈ آڈٹ اور صوبائی سول سروس کی خوبیوں کا راگ الاپتا، یہ سب کچھ مجھے ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا اور میں کوئی واضح فیصلہ لینے میں ناکام رہا، حتیٰ کہ آفر لیٹر قبول کر کے جوائن کرنے کے دن قریب آ گئے۔ اس کشمکش میں لاہور میں ایک ٹریفک کانسٹیبل نے مجھے فیصلہ کرنے میں بہت مدد دی۔ ایک روز شاپنگ کے لیے کلمہ چوک کی طرف جاتے ہوئے ایک کانسٹیبل نے میری موٹر سائیکل روکی اور چابی نکال کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ موٹر سائیکل کے کاغذات کا پوچھا تو میں نے رجسٹریشن کی کاپی پیش کی، جسے وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

میں نے بطور لیکچرار اپنا تعارف کرواتے ہوئے نہایت ادب سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ مجھے بطور استاد عزت دے اور میری بات پر یقین کرے کہ موٹر سائیکل میری ذاتی ملکیت ہے مگر اس کانسٹیبل نے میری بات مکمل طور پر سنی اَن سنی کر دی، اس کی طاقت اور اختیار کے سامنے میں مکمل بے بس تھا۔ کوئی بیس منٹ کی سعیٔ لا حاصل کے بعد اُس نے ''دستِ تعاون دراز کرنے'' کا مطالبہ کیا اور بڑی گرم جوشی سے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، میں نے بھی از راہِ مروت جیب سے 50 روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کی مٹھی میں تھما دیا۔ اس پچاس روپے کے عوض مجھے پولیس کلچر کی مکمل سمجھ آ گئی (جسے بدلنے کے لیے مجھ سمیت 300 انسپکٹرز کی تقرری کا عمل مکمل ہو چکا تھا) اُس کانسٹیبل نے موٹر سائیکل کی چابی مجھے واپس کرتے ہوئے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''باؤ جی! تعارف نہیں، تعاون کیا کریں!'' میں مسکرایا، موٹر سائیکل کو کِک لگائی اور شاپنگ کا

ارادہ ترک کر کے گھر کی راہ لی۔

اب مجھے اپنے محکمے کے انتخاب میں ذرہ بھر بھی شک نہ رہا اور میں نے پنجاب پولیس بطور انسپکٹر جوائن کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
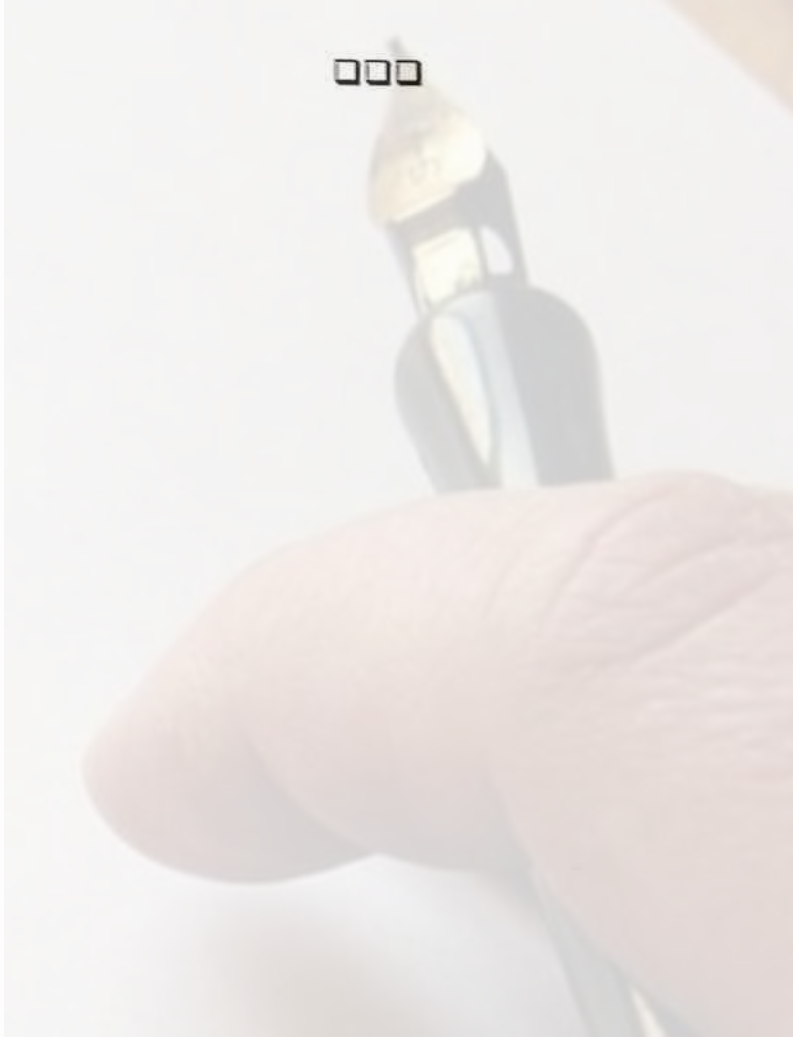
معاشی سکیورٹی اور ٹیکس کلچر

دُنیا کی ہر ریاست کی ترجیحات میں جغرافیائی سالمیت، سیاسی خودمختاری، معاشی استحکام، سماجی انصاف، سرحدوں کا دفاع اور داخلی سلامتی سرِفہرست ہوا کرتے ہیں۔ ہر ملک اپنے جغرافیائی خدوخال اور علاقائی حالات کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرتا ہے اور اپنے وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے ایک جامع منصوبہ بندی ترتیب دیتا ہے جس میں ملک کے باشندوں کی تمام بنیادی ضروریات کی فراہمی یقینی بنانے کی حکمتِ عملی بھی وضع کی جاتی ہے۔ ترقی کے یکساں مواقع فراہم کر کے ان میں چھپے صلاحیتوں کے جوہر کو نکھارنے کے پروگرامز اور منصوبہ جات پر عملدرآمد کیا جاتا ہے تاکہ اقوامِ عالم میں نہ صرف قومی تشخص کو اجاگر کیا جا سکے بلکہ سیاسی و معاشی تعلقات مضبوط کر کے باہمی احترام پر مبنی دوطرفہ تجارت کے ذریعے ملکی معیشت کو خود انحصاری، خودمختاری اور خوشحالی کی طرف گامزن کیا جا سکے۔ ہر ملک عالمی منڈی میں اپنی تجارت بڑھانے کے درپے رہتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک سے مختلف مصنوعات تیار کر کے قیمتی زرِمبادلہ کما کر اپنے شہریوں کی زندگی بہتر بنائے اور انسانی زندگی کے معیار میں مزید بہتری لائے تاکہ معاشی مساوات کا دور دورہ ہو، داخلی استحکام رہے اور سیاسی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت

بطریقِ احسن کی جا سکے۔ اس تناظر میں ملک کے معروضی حالات، تاریخی حقائق اور موجودہ معاشی وسماجی ترجیحات کا جائزہ لینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ وطنِ عزیز مالکِ کائنات کے انعامات میں سے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ اس کے شمالی علاقہ جات قدرتی حُسن سے مالا مال ہیں، پُرفضا مقامات دُنیا بھر کے سیاحوں کو اپنی آغوشِ الفت میں سما لینے کی طاقت رکھتے ہیں اور سال بھر یہاں ملکی وغیر ملکی مہمانوں کے بسیرے ہوتے ہیں۔ دُنیا کی بلند ترین چوٹیوں پر مبنی پہاڑی سلسلے ہیں اور برف پوش مناظر اپنی فطری دلکشی کے باعث آنے والے سیاحوں کا من موہ لیتے ہیں، یہاں تازہ پھل بھی ہیں اور خشک میوہ جات کے خزانے بھی، متعدد اقسام کی جنگلی حیات ہیں اور نادر و نایاب پرندے بھی۔ ہمارے میدانی علاقہ جات میں دریاؤں سے نکلنے والا دُنیا کا ایک خوبصورت نہری نظام موجود ہے جو لاکھوں ایکڑ رقبے کو سیراب کرتا ہے اور زرعی اجناس کی پیداواری صلاحیت میں گراں قدر اضافے کا سبب بنتا ہے۔

آج ہمارے ملک میں اکثریت دیہی علاقوں میں آباد ہے اور زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے۔ نہ صرف ہمارے محنت کش کسان بلکہ ملک کی 65 فیصد دیہی آبادی ملک کی زرعی اجناس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دن رات کوشاں ہیں بلکہ شہروں میں موجود انسانی آبادی کی خوراک اور ملکی صنعت کے لیے خام مال بھی فراہم کرنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کیے ہوئے ہے۔ بلاشبہ ہماری زرخیز زمین سونا اگلنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں انتظامی خلفشار، سیاسی عدم استحکام اور معاشی ناانصافیوں کے باوجود معمولاتِ زندگی کا پہیہ اپنی ڈگر پر رواں رہا۔ اس ضمن میں ملکی تاریخ پر نظر ڈالنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔

آزادی کے فوراً بعد 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں اشرافیہ نے ملکی وسائل پر اپنا قبضہ جما کر دولت کا ارتکاز چند خاندانوں تک کر لیا۔ اس وقت کی سیاسی قیادت اور معیشت کے ماہرین نے قوم کو یہ راگنی سنائی کہ معیشت کا پہیہ رواں رکھنے کے لیے سرمایہ داروں کو خاطر خواہ سہولتیں اور

مراعات دینا ضروری ہے، اس کے باعث صنعتی ترقی کا سنہرا دور شروع ہوگا، عام لوگوں پر روزگار کے دروازے کھلیں گے اور یوں ملک کے طول وعرض میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔

اسی منصوبہ بندی کے تحت اشرافیہ نے ملکی وسائل پر اپنا تسلط مضبوط کرلیا اور اپنی نسلوں تک کے لیے نہ صرف اقتدار کی راہیں ہموار کرلیں بلکہ ذاتی معاملات کے حصول کو بھی یقینی بنا لیا گیا، جس کے باعث عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔

پھر 1970ء کی دہائی میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند ہوا۔ بڑی صنعتیں اور کارخانے قومیا لیے گئے اور مزدور یونین اور زرعی اصلاحات کے ذریعے عام آدمی کی خوشحالی کے دعوے کیے گئے جبکہ اقتدار کے ایوانوں میں جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی نمائندگی بدستور برقرار رہی۔ 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں اشرافیہ پوری طاقت کے ساتھ واپس آئی اور اپنے سرمایے کو استعمال میں لاکر صنعتکاری اور کاروباری معاملات کو تیزی سے آگے بڑھا کر اور سیاسی آقاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ایک طرف اپنے لیے دولت کے انبار لگائے تو دوسری طرف ملکی معیشت کو اندرونی اور بیرونی قرضوں کے دلدل میں دھکیل دیا گیا۔ آج ہم قرضوں کے حصول کے لیے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ عالمی مالیاتی ادارے ہمیں مزید قرض دینے کے لیے کڑی ترین شرائط عائد کررہے ہیں اور ہماری معیشت کو اپنے مکمل کنٹرول میں لے چکے ہیں جبکہ ہم بے بسی کی تصویر بنے ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں۔ ماضی کی ناقص منصوبہ بندی، اشرافیہ کے تباہ کن گٹھ جوڑ اور اقتدار پر اس کے قبضے کے باعث آج ہم اس معاشی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ریونیو کے ادارے جو کچھ سال بھر ٹیکسوں کی مد میں جمع کرتے ہیں، ان کا نصف تو قرضوں اور ان کے سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے جبکہ باقی ماندہ رقم سے ملکی ضروریات، درآمدات، دفاعی ساز وسامان، اشیائے خورونوش، پیٹرولیم مصنوعات کی خریداری اور سرکاری اداروں کی تنخواہوں اور پنشن کے لیے فنڈز مہیا نہیں کیے جاسکتے۔ مزید برآں ملک میں جاری ترقیاتی منصوبے اور نئے پروجیکٹس کا اجرا بھی اس رقم سے نہیں کیا جاسکتا جس کے لیے ہمیں دوبارہ عالمی مالیاتی اداروں کے

دروازے پر گھٹنے ٹیکنا پڑتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک طرف ڈالر اونچی اڑان بھرتا ہے تو دوسری طرف مہنگائی کا طوفان غریب آدمی کو دو وقت کی روٹی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کاروباری طبقے کی چاندی ہے جو ڈالر کی اڑان کی آڑ میں چیزوں کو کئی گنا مہنگا کر کے بیچنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اس معاشی ابتری کا واحد اور دیرپا حل ملک میں معاشی سکیورٹی کا بیانیہ عام کرنے میں ہے۔ جب تک اشرافیہ، کاروباری طبقہ اور سرمایہ دار اپنی آمدن اور حیثیت کے مطابق ٹیکس ادا کر کے قومی خزانے میں اپنا حصہ نہیں ڈالیں گے، ملک میں معاشی استحکام یقینی نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی سماجی انصاف کے خواب کی تعبیر ممکن ہے۔ ملک میں اشرافیہ کا لائف سٹائل، لگژری گاڑیوں کی ریل پیل، بڑے بڑے محلات، ملکی اور غیر ملکی دورے اور مہنگے ترین تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم بچے ان کی بے پناہ دولت کی گواہی دے رہے ہیں مگر ان کے ٹیکس گوشوارے ان حقائق کے برعکس حالات کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ 22 کروڑ نفوس کی آبادی میں سے صرف تیس لاکھ افراد انکم ٹیکس گوشوارہ جمع کراتے ہیں جن میں سے صرف گیارہ لاکھ ٹیکس گزار اپنی آمدن قابلِ ٹیکس آمدن سے کم ظاہر کرتے ہیں اور نو لاکھ ٹیکس گزار محض 1 سے 5 ہزار تک ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ صرف تنخواہ دار طبقہ اور وہ کاروباری حضرات، جن کا ٹیکس تجارتی یا کاروباری لین دین کے موقع پر ہی کٹ جاتا ہے، قومی خزانے میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ دوسری طرف زرعی اجناس کی پیداواری صلاحیت بڑھنے، گاڑیوں کی فروخت میں گراں قدر اضافے اور ٹریکٹروں کی صنعت میں فروغ سے ملکی معیشت میں مثبت اشارے تو ملتے ہیں مگر ٹیکس اس تناسب سے جمع نہیں ہوتا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وطنِ عزیز کے ریٹیل سیکٹر کا حجم اٹھارہ سے بیس ٹریلین روپے ہے مگر ٹیکس نیٹ میں محض تین سے چار ٹریلین روپے کا کاروبار ہے۔ ہماری معیشت کیش کے لین دین اور غیر رسمی خطوط پر چل رہی ہے جسے دستاویزی بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

وقت آن پہنچا ہے کہ ٹیکس چوری روکنے، سمگلنگ کی روک تھام اور ٹیکس کلچر کے فروغ کے

لیے قومی ترجیحات کا از سرِ نو تعین کیا جائے اور معاشی سلامتی کو مقدم رکھا جائے۔ ہر شخص کی قابلِ ٹیکس آمدن پر واجب الادا ٹیکس قومی خزانے میں شفاف انداز سے منتقل ہو تا کہ ملک کو اندرونی و بیرونی قرضوں کے بوجھ سے نجات دلا کر خوشحالی کی طرف گامزن کیا جا سکے۔
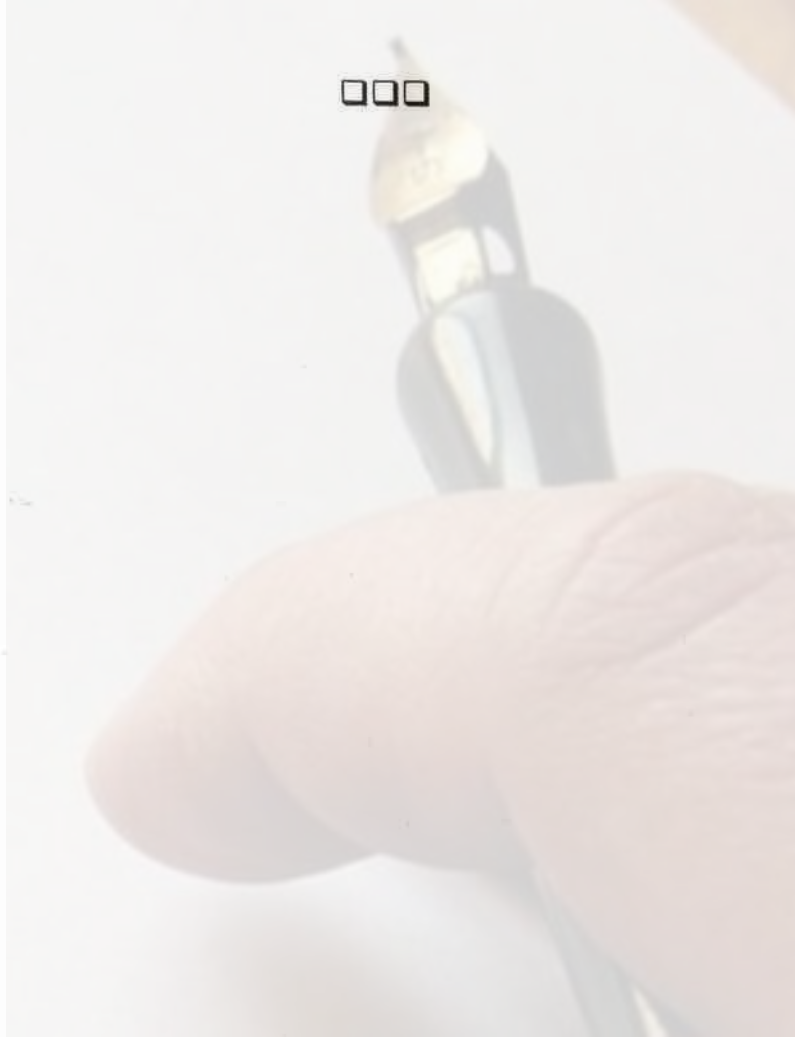
پاکستان کا مطلب کیا؟

تاریخ شاہد ہے کہ برِ صغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے محمد بن قاسم سے بہادر شاہ ظفر تک، لگ بھگ ایک ہزار برس بلا شرکتِ غیرے حکومت کی ہے۔ اس دوران سلاطینِ دہلی کا راج رہا تو خاندانِ غلاماں نے بھی اس خطے پر حکمرانی کی۔ پھر مغلیہ خاندان کا طویل عہدِ اقتدار شروع ہوا اور بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بالآخر زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ اسی دوران برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کاروبار اور تجارت کے لبادے میں یہاں آئی اور آہستہ آہستہ مقامی وسائل اور ذرائع پر اپنا تصرف بڑھانا شروع کر دیا اور پھر بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے یہاں کے تخت و تاج پر قبضہ جما لیا۔ ہندو بنیے نے مسلمانوں سے آزادی پا کر نئے آقاؤں کو خوش آمدید کہا اور اُن کے عہدِ اقتدار کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے لگا مگر مسلمانوں نے غلامی کی زنجیریں دل سے قبول نہ کیں اور 1857ء میں سیاسی، معاشی اور تعلیمی پسماندگی کے باوجود انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے اپنی طاقت کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اس مہم جوئی میں انھیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور انگریز حکمرانوں نے اس بغاوت کو کچل ڈالا مگر انھیں اس حقیقت کا شدت سے ادراک ہو گیا کہ مقامی باشندوں کو زیادہ دیر تک بزورِ شمشیر غلام بنائے رکھنا محال ہے۔

اس شکست کے اسباب اور محرکات کا بغور جائزہ لینے کے بعد سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو تحریکِ علی گڑھ کے ذریعے تعلیم کے شعبہ میں ترقی کرنے اور ان میں سیاسی بلوغت کو پروان چڑھانے کے لیے ایک مربوط اور منظم پروگرام کا آغاز کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور تعلیمی شعبوں میں مضبوط اور مخالفین کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنے کے قابل بنانا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں تاجِ برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند کے مقامی لوگوں کو اپنے اقتدار میں آہستہ آہستہ شامل کرنا شروع کیا اور قانون ساز اداروں سے سرکاری ملازمتوں تک آبادی کے تناسب سے حقِ نمائندگی دینے کے عمل کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں آبادی میں واضح برتری حاصل تھی لہٰذا انھوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور انگریز حکمرانوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے ان کے اقتدار میں حصہ دار بننے لگے۔ اس دوران مفکرِ پاکستان شاعرِ مشرق سر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کے لیے اپنی فکر انگیز شاعری کا استعمال کیا اور ان میں احساسِ خودداری، تابناک ماضی سے آشنائی اور آنے والے روشن مستقبل سے آگاہی کے لیے اپنے اشعار کو ہتھیار بنایا اور 1930ء میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شمال مغربی علاقوں پر مشتمل مسلم اکثریتی آبادی کی بنیاد پر ایک الگ مملکت کا تصور پیش کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح شروع میں متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کے متلاشی رہے مگر جلد ہی انھیں بنیے کی ہٹ دھرمی، تنگ نظری اور متعصّبانہ نظریات کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ انھوں نے یہ بھانپ لیا کہ تاجِ برطانیہ سے آزادی کی صورت میں ہندو اپنی عددی اکثریت کا خوب فائدہ اٹھائیں گے اور مسلمانوں کو استحصال اور ظلم کا نشانہ بنائیں گے جس کا عملی مظاہرہ 1937ء میں بننے والی کانگریسی وزارتوں میں انھیں بخوبی دیکھنے کو مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حکومت کے خاتمے پر قائداعظم نے یومِ نجات منانے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد تحریکِ پاکستان کی باقاعدہ منظم انداز میں بنیاد ڈال کر مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک بنانے کی شبانہ روز کاوشیں

شروع کر دیں۔ 1940ء میں قراردادِ لاہور کے ذریعے اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور بالآخر 14 اگست 1947 کو قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں دُنیا کے نقشے پر پاکستان کی شکل میں ایک الگ ملک ظاہر ہوا۔

27 رمضان المبارک کے بابرکت دن قائم ہونے والا یہ ملک کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ یہ دراصل ہمارے لیے ربِ کریم کی طرف سے ایک انمول تحفہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد، متعدد مواقع پر بانئ پاکستان کی تقاریر اور خطبات اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کا اولین مقصد محض ایک خطۂ ارضی کا حصول نہیں تھا بلکہ ایک ایسا ملک قائم کرنا تھا جس میں سنہری اسلامی اصولوں اور اقدار کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی زندگیاں ڈھالنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس ضمن میں قائداعظم کے فرمودات بالکل واضح ہیں۔ 13 جنوری 1948ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں اپنے خطاب میں انھوں نے فرمایا ''اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے، ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔'' اسی طرح 26 مارچ 1948ء کو چٹاگانگ کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے واشگاف الفاظ میں کہا ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا، اس کی خاطر اس لیے جدوجہد کی اور اسے اس لیے حاصل کیا کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے میں جسمانی اور روحانی طور پر قطعاً آزاد ہوں۔ اخوت، مساوات اور رواداری، یہ ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نکات ہیں۔'' قائداعظم نے مزید کہا ''اسلامی اقدار کو اپنانا انسانی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے، یہ اقدار دراصل ایک مثالی معاشرے کی تخلیق کی ذمہ دار ہیں۔''

مگر بدقسمتی سے پاکستان کے قیام کے محض ایک سال بعد ہی بانئ پاکستان ہم سے بچھڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی ملک میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔ قراردادِ مقاصد کو عملی طور پر پسِ پشت ڈال دیا گیا اور نو سال تک

ہمیں پہلے آئین کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ ہماری اشرافیہ ایوانِ اقتدار پر قبضے میں مصروفِ عمل رہی جس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے کئی وزرائے اعظم محلاتی سازشوں کا شکار ہوئے اور ارضِ پاک کو طاقت، دولت، اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کی اندھیر نگری میں جھونک دیا گیا۔ ہماری چوہتر سالہ قومی تاریخ میں ہمارے طالع آزماؤں، سیاست دانوں، وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور عاقبت نااندیش حکمرانوں نے وطنِ عزیز کو عظیم تر بنانے کے نعرے لگا کر دراصل اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قائداعظم کے پاکستان کو اسلام کے سنہری اصولوں اور درخشندہ روایات کی روشنی میں ڈھالنے کے بجائے یہاں اقربا پروری، رشوت ستانی، منافع خوری، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، قانون شکنی، موقع پرستی اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی بدترین نظام رائج کیا گیا۔ محض چند خاندان اور گنے چنے افراد کروڑوں پاکستانیوں کی قسمت کے فیصلے کرنے پر مامور نظر آئے۔ غریب، نادار، بے کس اور پسماندہ عوام ہر الیکشن کے موقع پر نئی امیدوں، نئے نعروں، نئے وعدوں اور مکر وفریب پر مشتمل نئی چالوں سے دھوکا کھاتے رہے مگر اپنے ووٹ کی طاقت کے ذریعے تبدیلی لانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ کر سکے۔ قدرتی وسائل سے مالا مال ہمارا ملک قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے، زرعی ملک ہونے کے باوجود پاکستان گندم تک درآمد کرنے پر مجبور ہے، پانی کی فراہمی کے باوجود لاکھوں ایکڑ رقبہ ناقابلِ کاشت ہے۔ ایک طرف توانائی کا بحران ہے تو دوسری طرف مہنگائی کے طوفان نے غریب کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے نچلے طبقے کو معاشی تحفظ فراہم کرنے کے لیے کئی ایک عملی اقدامات کیے ہیں جن میں پناگاہوں، لنگر خانوں، احساس پروگرام، بلاسود قرضوں کی فراہمی، کامیاب نوجوان پروگرام، کامیاب کسان پروگرام اور تعمیراتی شعبے میں مراعات اور ٹیکس سے استثنا جیسے اقدامات شامل ہیں۔ ہمارا پچھتّرواں یوم آزادی اس امر کا متقاضی ہے کہ پاکستان کو اشرافیہ کے چنگل سے آزاد کروانے کے لیے کامیاب پاکستان پروگرام شروع کیا جائے جو اسے حقیقی معنوں میں خوددار، خودمختار اور خوشحال ملک بنائے جس کے لیے ہمارے اسلاف نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ ایک

ایسی اسلامی فلاحی ریاست، جہاں پناہ گاہ اور لنگر خانے میں جانے والا کوئی نہ ہو، جہاں حیات جرم نہ ہو اور زندگی وبال نہ ہو۔

□□□
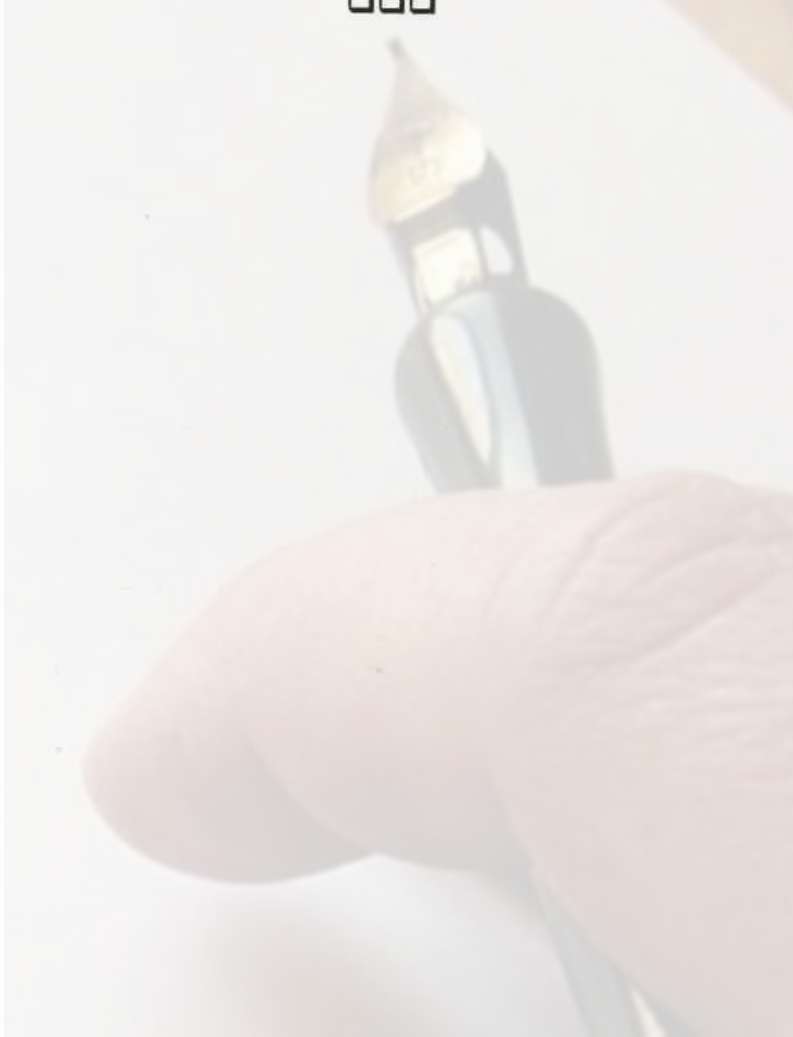
غمِ حسین رضی اللہ عنہ کی نعمت

جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف طویل جدوجہد کرنے، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور اس کی پاداش میں ستائیس سال جیل میں گزارنے والے نیلسن منڈیلا پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ سیاہ فام باشندوں کے حقوق کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں ہار تسلیم کرنے کو تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ نسلی تعصب کے خلاف یہ جنگ ہار جاتے، نیلسن منڈیلا نے اپنے گرتے ہوئے حوصلے کو سہارا دینے کے لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق پرست کردار اور واقعہ کربلا کی روشن مثال سے ایسی طاقت کشید کی جس نے بالآخر انھیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ''میں نے جیل میں بیس سال سے زائد کا عرصہ گزارا اور ایک رات میں نے یہ طے کر لیا کہ میں آج سرکاری مسودات پر حکومت کی طے کردہ شرائط پر دستخط کر کے اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ میں یہ کر گزرتا، اچانک مجھے امام حسین رضی اللہ عنہ کا خیال آیا اور میدانِ کربلا میں ان کی حق پرستی کے واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے۔ اس بے مثال کردار نے حق و صداقت کا استعارہ بن کر مجھے ایسا حوصلہ بخشا کہ میں ایک بار پھر آزادی کی جدوجہد کا عزمِ صمیم لے کر پوری قوت کے ساتھ نسلی تعصب کے خلاف ڈٹ گیا۔'' تاریخِ انسانی میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا عظیم کردار مینارۂ نور

بن کر خوف اور مایوسی کے اندھیروں کو صدیوں سے نگل رہا ہے اور اپنے اصولی مقاصد کے لیے ڈٹ جانے والوں کے عزم و ہمت کو حوصلوں کی تازگی بخش رہا ہے۔

یزید کے مسندِ اقتدار سنبھالتے ہی مسلمانوں کے نظامِ حکومت میں بہت سی خرافات نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ عدل و انصاف کی جگہ ظلم و بربریت عام ہونے لگی، منتخب خلافت کی روایات دم توڑنے لگیں اور وراثتی طرزِ حکمرانی اپنے پنجے گاڑنے لگا، حُریت، حق پسندی اور فِکر و نظر معدوم ہونے لگی۔ اس نازک وقت میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے نانا خاتم النّبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دینِ حق کی بقا اور سلامتی کے لیے پوری طاقت سے کھڑے ہو گئے اور ظالمانہ نظامِ حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کُن معرکہ کے لیے تیار ہو گئے۔ توحید و رسالت کا علمبردار بن کر اور قوتِ ایمانی سے سرشار ہو کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ابرہہ کی طاقتور فوج کے ہاتھیوں کے خلاف اللہ کی پرندوں پر مبنی کمزور فوج کی فتح مبین کو یاد کرتے ہوئے اپنے پیاروں اور جانثاروں کے مختصر ترین قافلے کے ساتھ یزیدی فوج کے ہزاروں سپاہیوں کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ فاتحِ خیبر، حیدرِ کرار، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر کربلا کے صحرا میں حق و صداقت کا ابر بن کر پورے زور سے گرجے بھی اور برسے بھی، اور ایسے برسے کہ اپنے اور اہلِ بیت کے پاکیزہ خون سے کربلا کی ریتلی زمین کی آبیاری کی اور اُسے جذبۂ ایماں سے حق و صداقت کا لالہ زار بنا دیا۔ یوں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ دینِ حق کا وہ میزان ٹھہرے جو ہر دور میں حق و باطل کے درمیاں کسوٹی قرار پایا۔ اُس کڑی آزمائش کی گھڑی میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اپنے نانا کے وہ الفاظ گونجنے لگے، ''خدا کی قسم اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں اور ساری دُنیا کی دولت میرے قدموں میں ڈھیر کر دیں پھر یہ چاہیں کہ میں خدا کا حکم اس کی مخلوق تک نہ پہنچاؤں تو میں ہرگز اس کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ یہاں تک کہ خدا کا سچا دین لوگوں میں پھیل جائے یا کم از کم میں اس جدوجہد میں اپنی جان دے دوں۔''

مدینہ منورہ کے والی ولید اور مروان حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کر رہے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ یہ جانتے تھے کہ یزید کی بیعت کا مطلب اسلام کے اصولِ خلافت سے انحراف کے مترادف ہوگا لہٰذا آپ نے دینِ حق کی سربلندی کے لیے قوتِ ایمانی کو طاقت بنا کر دوٹوک الفاظ میں بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور ظلم کے خلاف علمِ حق بلند کرنے کے لیے باطل قوتوں کو للکارا۔ انکار کی شمشیرِ حق نیام سے باہر نکالی، ظلم کے خلاف عملی جہاد کے لیے کربلا کے میدان میں جا پہنچے اور اپنے اہلِ بیت سمیت اکہتر جانثاروں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر کے تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی قربانی کی لازوال داستاں رقم کی۔ اہلِ بیت کے مقدس خون نے ایک خوابیدہ ملت کو ایمانی حرارت اور بیداری عطا کی جس کو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس شعر میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا...

خونِ او تفسیر ایں اَسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

واقعہ کربلا کی یہ عظیم داستان اور عظمتِ کردارِ امام حسین رضی اللہ عنہ کا یہ بیش قیمت وِرثہ صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں، سارے جہانوں اور سب زمانوں کے لیے یکساں سرمایۂ حیات ہے۔ گزشتہ چودہ سو سالوں سے ظلم و بربریت کے خلاف حق و صداقت کی ہر اٹھنے والی آواز کے لیے یہ بے پناہ طاقت کا سبب بنتا چلا آیا ہے۔ آج بھی جموں و کشمیر کے مظلوم مسلمان حسینیت کا علمِ حق بلند کرتے ہوئے مودی کی فاشسٹ سرکار کے سامنے ڈٹ چکے ہیں۔ ظالمانہ یزیدی حکومت کی اخلاق سوز روایات کی یاد تازہ کرتے ہوئے آج مودی سرکار نے کشمیریوں کو بنیادی سہولتوں، خوراک، مواصلاتی نظام اور علاج معالجے سے محروم کر رکھا ہے۔ ان کے تمام انسانی حقوق سلب کر کے آٹھ لاکھ بھارتی فوجیوں کو بے بس کشمیریوں پر درندوں کی طرح چھوڑ کر ان کی آوازِ حق کو دبانے کی مذموم کارروائی کی جا رہی ہے۔ مودی سرکار یہ سمجھتی ہے کہ ان سفاکانہ

ہتھکنڈوں سے وہ کشمیریوں کی اپنے حقِ خودارادیت کے لیے اٹھنے والی آواز کو دبا لے گی مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔

اسلامی تاریخ کے اِس سنہرے باب سے بے بہرہ مودی کو کیا معلوم کہ چودہ صدیاں قبل کربلا کے میدان میں پانی کے لیے ترستا چھ ماہ کا ننھا علی اصغر مقبوضہ جموں و کشمیر کے ان ہزاروں شیر خوار بچوں کا رہنما ہے جو دودھ کو ترستے ہوئے اپنے بے بس ماں باپ کی غم ناک آنکھوں کے سامنے جاں سے گزر جاتے ہیں۔ کربلا کے میدان میں موجود اہلِ بیت میں شامل وہ آٹھ عظیم مائیں جن میں علی اصغر رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت رباب، عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہ کی والدہ بنت شکیل جلیلہ رضی اللہ عنہا اور عون رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا شامل ہیں، وہ بے مثال مائیں جن کی نظروں کے سامنے ان کے لختِ جگر لہو میں لت پت خیمے میں لائے جاتے تو وہ عزم و ہمت اور صبر و رضا کا پیکر بن کر اپنے معصوم شہیدوں کی پیشانی چوم لیتیں۔ یہ آٹھ مائیں اب لاکھوں کشمیری ماؤں کا حوصلہ ہیں جن کے نوجوان بیٹے راہِ حق میں روزانہ کی بنیاد پر شہید کیے جا رہے ہیں، جنھیں بغیر کسی جرم کے ماورائے عدالت قتل کر دیا جاتا ہے۔ کلمۂ حق بلند کرنے کی پاداش میں سال ہا سال جیل میں رکھ کر انھیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور جن کی آنکھوں کا نور پیلٹ گنز سے بجھا دیا جاتا ہے۔ لیکن اس ظلم و بربریت کے باوجود بھارت سرکار کشمیریوں کی آوازِ حق کو دبانے میں بری طرح ناکام ہو رہی ہے کیونکہ مظلوم کشمیریوں کی غیبی امداد میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بلند پایہ کردار اور حق و صداقت کی ابدی طاقت اور لازوال روشنی موجود ہے۔

انسانی تاریخ آج تک حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا یزید کے سامنے بولا گیا یہ جملہ فراموش نہیں کر پائی ''اے یزید! اگرچہ حادثاتِ زمانہ نے ہمیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے اور مجھے قیدی بنایا گیا ہے لیکن جان لو! میرے نزدیک تیری طاقت کچھ بھی نہیں۔'' غمِ حسین رضی اللہ عنہ کی یہی نعمت سولہ سالہ فلسطینی لڑکی احد تمیمی کے لہجے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی للکار نمایاں کرتی ہے جو اسرائیلی فوجی کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے یہ کہتی ہے ''تم کیا سمجھتے ہو تم طاقت کے بل بوتے پر یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنا

لو گے؟''ظلم و بربریت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں غمِ حسین ؓ کی یہی نعمت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اور حق و صداقت کی طاقت بن کر باطل قوتوں کو شکستِ فاش دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ غمِ حسین ؓ کی یہی بیش بہا نعمت قرآنِ کریم کی سورۃ العصر کی عملی تفسیر بن کر ہمیں ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ'' کا درس دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

□□□
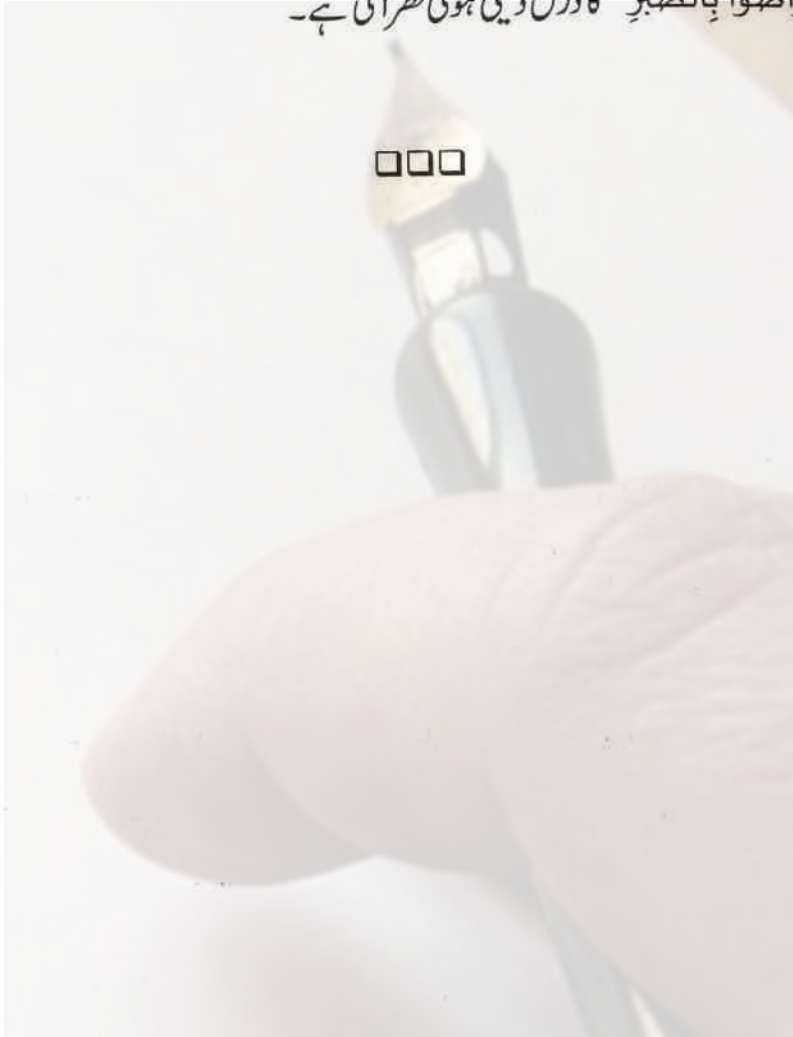
خود احتسابی

ہمارے معاشرے میں اخلاقی قدریں، سماجی بندھن اور انسانی رویے بڑی تیزی سے زوال پذیر ہیں اور اس اخلاقی بحران اور معاشرتی انتشار کے کئی عوامل اور بے شمار محرکات ہیں۔ کافی حد تک سسٹم کی خرابی، سیاسی عدم استحکام، معاشی تفاوت اور انصاف کی عدم فراہمی اس بگاڑ کے ذمہ دار ہیں مگر انفرادی سطح پر ہمارے اپنے اندر بھی بہت سی خرابیاں ہیں جنھیں ہم اس تنزلی کے سفر میں کہیں شمار نہیں کرتے بلکہ اپنی ان ساری وارداتوں، کج رویوں اور کوتاہیوں کو نظام کے کھاتے میں ڈال کر تپلی گلی سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف لوٹ کھسوٹ، منافع خوری، گراں فروشی، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، اقربا پروری، تشدد اور عدم برداشت کے نت نئے ریکارڈ بنتے اور ٹوٹتے نظر تو آتے ہیں مگر ان خرابیوں کی ذمہ داری انفرادی سطح پر کوئی بھی شخص اپنے کھاتے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کم تولنے والا اور ملاوٹ شدہ اشیا تین گنا قیمت پر بیچنے والا بھی سب خرابیوں کی جڑ حکومتِ وقت کو ہی سمجھتا ہے اور حالات کا رونا رونے میں دیر نہیں لگاتا۔ اس افسوس ناک اخلاقی انحطاط میں ہمارے اس رویے اور طرزِ عمل کا بہت بڑا دخل ہے۔ ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں ایک اور علت جسے ہم نے اپنے اندر سمو رکھا ہے اور جو ہماری روزمرہ

زندگی کے اندر کینسر کی طرح سرایت کر چکی ہے، وہ ہے دوسروں کی زندگی میں غیر ضروری اور بے جا مداخلت، دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانا بلکہ اس سلسلے میں اپنے قیمتی وقت، توانائیوں اور صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر دوسروں کے بارے میں کھوج لگا کر، جاسوسی کر کے معلومات نہ صرف اکٹھی کی جاتی ہیں بلکہ پھر اس کی تشہیر بھی کی جاتی ہے۔ دوسروں کی ترقی اور خوشحالی کو رول ماڈل بنا کر اِس سے سبق سیکھ کر اپنی زندگی کو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے بجائے ان کے معاملات کی ٹوہ لگا کر، منفی زاویہ نگاہ میں رکھ کر انھیں اپنے سے کم تر ثابت کرنے میں لوگ اپنی زندگیاں خراب کر لیتے ہیں، اپنی توانائیاں ضائع کر بیٹھتے ہیں بلکہ اپنی کئی نسلیں تک تباہ کر لیتے ہیں لیکن کبھی کوئی خیر کی خبر نہیں آتی، کسی کے لیے خوشگوار الفاظ ادا نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے سے بہتر انسان ماننے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ رویہ ہی اُن کی زندگی میں پسماندگی، ناکامی اور مایوسی کے سارے اسباب پیدا کرتا ہے مگر انھیں نہ اپنے اس جرم کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اسے کوئی برائی سمجھتے ہیں۔ آپ کو زندگی میں ایسے افراد سے کئی مرتبہ واسطہ پڑا ہوگا کہ وہ آپ کے انتہائی قریبی دوست یا رشتہ دار کے بارے میں ہوش رُبا انکشافات کرنے لگیں گے اور جواب میں آپ سے داد و تحسین کی توقع بھی رکھتے ہوں گے حالانکہ آپ خود اس وقت سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہوں گے۔

اخلاقی عیوب میں ایک قبیح حرکت غیبت ہے اور یہ بڑے گناہوں میں شمار ہوتی ہے جسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقیقی بھائی کا مُردار گوشت کھانے کے برابر گردانا ہے اور اِس کی سخت وعید آئی ہے مگر ہمارے معاشرے میں غیبت کو ایک مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ جہاں چند دوست احباب اکٹھے ہوں گے وہاں کسی نہ کسی کی خامیاں ضرور زیرِ بحث لائی جائیں گی۔ ایک زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ زیادہ تر غیبت خواتین کرتی ہیں مگر آج کل یہ اخلاقی برائی مرد و زن میں برابر دیکھی جاسکتی ہے۔ ذاتی محفل ہو یا محفلِ یاراں، شادی بیاہ کی تقریب ہوں یا کسی مرگ پر اکٹھے ہوئے لوگ، غیبت کے دریا پورے زور سے بہتے نظر آتے ہیں۔ یہ کئی لوگوں کے لیے دلی سکون اور

راحت کے حصول کا پسندیدہ ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ امریکی صدر روز ویلٹ کی اہلیہ ایلنور روز ویلٹ نے بالکل سچ کہا تھا کہ بڑے ذہن کے مالک افراد افکار کو زیرِ بحث لاتے ہیں، اوسط درجے کے اذہان واقعات پر گفتگو کرتے ہیں جبکہ سب سے کم تر ذہن رکھنے والے لوگ محض لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے معاشرے پر سو فیصد لاگو ہوتی ہے جس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

ہمارے معاشرے کا ایک اور بڑا مسئلہ منافقت اور قول و فعل کا تضاد ہے، ظاہر اور باطن کا تفاوت ہے، لوگ ایک چہرے کے پیچھے درجنوں چہرے چھپائے پھرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین وعدوں، دعووں اور خوبصورت الفاظ سے من موہ لینے والے جادوگر ہیں، عملی طور پر ہمیشہ اپنے معاملات میں وہ بہت نیچے گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی دورخی قائدین سے چلتی چلتی نچلی سطح پر منتقل ہوئی اور اب خاص وعام کی زندگی کا خاصہ بن چکی ہے اور ہمارے معاشرے کے اخلاقی بحران کے بڑے اسباب میں سے ایک ہے۔ اخلاقیات کا درس دینے والے ہی اخلاقی انحطاط میں گھرے نظر آتے ہیں، رہبر ہی رہزن ٹھہرے ہیں۔ ان حالات میں قوم ومعاشرہ بھی تباہی و بربادی کی نچلی ترین سطح پر جا پہنچے۔ آج ہم بحیثیت قوم مالی بحران اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہیں، اخلاقی پستی سے دوچار ہیں اور ابھی تنزلی کا سفر رکا نہیں کیونکہ قول وفعل کے تضاد نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ رمضان کریم کا مہینہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ جہاں ہم روزے کو پورے خشوع وخضوع کے ساتھ رکھتے ہیں، نماز کی ادائیگی کو یقینی بناتے ہیں، افطار کے اہتمام میں تکلف دکھاتے ہیں، نمازِ تراویح بھی اگلی صفوں میں کھڑے ہو کر ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ اور خیرات میں بھی پہل کرتے ہیں، وہاں اپنے کردار اور معاملات میں بھی بہتری دکھائیں، سچ بولیں اور جھوٹ سے اجتناب کریں، غیبت، حسد، کینہ اور بغض جیسی قباحتوں سے چھٹکارا پائیں، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کو اپنے کاروبار پر حرام کر دیں، منافقت سے رہائی پا کر قول وفعل کے تفاوت کا خاتمہ یقینی بنائیں مگر یہ سب کچھ خود احتسابی کے عمل

سے ہی شروع ہوسکتا ہے اور یہ سفر ہم سب کو انفرادی سطح پر طے کرنا ہے۔ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے، نظام کی خرابیوں پر انگشت نمائی کرنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے کردار کا بے لاگ جائزہ لیں تو باطن کے اندر ہی چھپا ہوا چور مل جائے گا۔ ہم سب کا ایمان ہے کہ رمضان کریم میں تمام شیاطین قید کر لیے جاتے ہیں مگر اصل شیطان، جو ہم سب کے اندر مکمل آزاد پھرتا رہتا ہے، اسے جکڑنا تو ہماری ذمہ داری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے باطن کے شیطان کو جکڑ کر اسے مستقل پسِ زندان ڈال دیا جائے اور اپنا اپنا محاسبہ کر کے کردار کی عظمت کی معراج کا سفر شروع کیا جائے تو پھر اس دُنیا میں بھی کامیابی اور آخرت میں بھی سرخرو ٹھہرنا ہمارے مقدر میں لکھ دیا جائے گا وگرنہ دونوں جہاں کی رسوائیاں ہمارا نصیب ہو جائیں گی۔

آج کل فرانس کے بائیکاٹ کے حوالے سے ایک مہم چلائی جا رہی ہے، ناموسِ رسالت کے تحفظ اور حرمت کے لیے پاکستان بھر میں مظاہرے کیے اور جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنے آقا و مولیٰ نبی آخر الزماں، خاتم النّبیین ﷺ کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ عشق ہے اور ہم اُن کے نامِ نامی پر ہر لمحہ مر مٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں مگر کیا ہم اپنے محبوب نبی ﷺ کی سنت اور تعلیمات کو اپنا کر اپنے کردار کو اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے عملی طور پر بھی کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم اپنی زندگی سے جھوٹ، منافقت، ملاوٹ، حرص و ہوس، لالچ اور ظلم و بربریت ختم کر کے اپنے اخلاق اور سلوک کو حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں نکھارنے اور سنوارنے کے لیے اپنا محاسبہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے سچ ہی کہا تھا...

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

❑❑❑

جیت کی لگن

ایسا نہیں کہ عظیم لوگ پیدائشی طور پر سونے کا چمچ منہ میں لے کر اس دُنیا میں آتے ہیں اور پھر کامیابیاں سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں! ایسا بھی نہیں کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے، کبھی گرتے نہیں، ڈگمگاتے نہیں، گھبراتے نہیں یا حالات کی سختیوں نے اُن کی زندگی کا رخ نہیں کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا کی تمام قدآور اور تاریخ ساز شخصیات نے اپنے اپنے حصّے کی ناکامیاں، پریشانیاں، دکھ، تکالیف، درد و آلام اور مصائب سے نبرد آزما ہو کر ہی اپنے لیے منفرد مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ وہ لوگ ناکام ہوئے تو انھوں نے پھر اٹھ کر ازسرِ نو زیادہ طاقت اور جوش و ولولے کو بروئے کار لا کر بڑی کامیابی اپنے نام کی۔ اُن کے قدم ڈگمگائے تو وہ دوبارہ سنبھل کر اپنی منزل کی طرف عزمِ صمیم کے ساتھ چل پڑے۔ ان کے باغِ تمنا میں خزاں نے ڈیرے ڈالے تو انھوں نے امیدِ بہار کا دامن نہیں چھوڑا، ثابت قدمی کے ساتھ گل و لالہ کی امید کے چراغ جلاتے رہے اور شبِ تاریک کے اختتام پر اک صبحِ پُرنور کے استقبال کا انتظار کرتے رہے۔ یہی ہے بنیادی فرق اور خاص نکتہ جو اُن ہستیوں کو عام انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ تھامس کارلائل کے نزدیک تاریخ

انھی عظیم انسانوں کی سوانح عمری بن کر رہ جاتی ہے بلکہ خود تاریخ اِن بڑے لوگوں کے سنہری کارہائے نمایاں کو اپنے صفحات پر سجا کر نازاں رہتی ہے۔ مشہور برطانوی ڈراما نگار، ولیم شیکسپیئر نے عظیم لوگوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے نزدیک کچھ تو پیدائشی طور پر عظیم ہوتے ہیں۔ کچھ عظمت کا تاج اپنی اَن تھک محنت کے بل بوتے پر اپنے سر پر سجاتے ہیں اور کچھ کے سر پر عظمت کا تاج ٹھونس دیا جاتا ہے، یعنی وہ حادثاتی طور پر عظیم لوگوں کی صف میں گھس آتے ہیں حالانکہ وہ اس کے اہل ہرگز نہیں ہوتے۔ ان تینوں میں سے سب سے قابلِ قدر وہ لوگ ہیں جو عملِ پیہم، عزمِ صمیم اور جہدِ مسلسل سے زندگی میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دیتے ہیں اور حالات کی سختیاں اور سنگینیاں برداشت کرتے ہوئے مشکلات کے باوجود ہمت وحوصلہ نہیں ہارتے اور اپنی منزل کے حصول کو یقینی بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہی وہ عظیم لوگ ہیں جو جیت کی لگن سینے میں بسائے، جوش وولولہ کا پیکر بن کر شبِ ظلمت میں اپنے حصے کا دیپ جلاتے ہیں اور کامیابی کا استعارہ بن کر دوسروں کے لیے ایک روشن مثال بن جاتے ہیں۔ یہ عظیم وکامیاب لوگ تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں اور ایسی کئی درخشندہ مثالیں موجود ہیں جن سے ہم بھی سبق سیکھ کر اپنی زندگی کے راستوں میں بچھائے گئے کانٹوں کو ہٹا کر اپنے باغِ تمنا میں رنگِ بہار کی سب رعنائیاں اور گلاب رُت کے سارے شباب جی بھر کر دیکھ سکتے ہیں۔

سکاٹ لینڈ کا بادشاہ رابرٹ بروس ایک بہادر اور باہمت حکمران تھا اور اس نے انگریزی افواج کے خلاف کئی جنگیں لڑیں مگر ہر مرتبہ شکستِ فاش اس کا مقدر ٹھہری۔ ایک مرتبہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور پہاڑوں میں چھپ گیا۔ ایک غار میں بیٹھا وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس ہزیمت ناک شکست اور میدان سے بھاگنے کے بعد اب اسے مزید لڑائی نہیں لڑنی اور ہمیشہ کے لیے ہتھیار ڈال دینا ہیں۔ اس فکری کشمکش میں اس نے دیکھا کہ ایک مکڑی اپنا جالا بُننے میں مصروف ہے اور ریشمی دھاگے سے لٹکتے ہوئے اوپر جالے تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہے مگر جونہی وہ ایک خاص مقام سے تھوڑا اوپر جاتی ہے تو نیچے گر جاتی۔ یہ منظر نو مرتبہ اس کے سامنے دہرایا گیا۔

رابرٹ بروس نے نویں مرتبہ جب دیکھا تو اس نے سوچ لیا کہ اب مکڑی تھک ہار کے بیٹھ جائے گی اور مزید کاوش نہیں کرے گی مگر اس کی سوچ کے برعکس مکڑی نے دسویں مرتبہ پھر ہمت کی اور بالآخر اپنے جالے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس سے بادشاہ کو بھی سبق ملا اور اس نے واپس جا کر نئے عزم و ولولے کے ساتھ انگریزی افواج پر فیصلہ کن حملہ کیا اور سکاٹ لینڈ کو ہمیشہ کے لیے آزاد کرالیا۔ یہ سب مسلسل محنت، عزمِ صمیم اور جیت کی لگن کی بدولت ہی ممکن ہوا۔

اسی طرح تاریخِ انسانی میں بے شمار ایسی شاندار مثالیں موجود ہیں جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ شہرہ آفاق سائنسدان تھامس ایڈیسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں جس کی منفرد ایجاد بلب نے دُنیا کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا، اس کے علاوہ بھی ایڈیسن نے لگ بھگ ایک ہزار ایجادات اپنے نام کی ہیں۔ سکول کے زمانہ میں ایک روز اس کے پرنسپل نے اسے ایک لفافہ بند خط دیا کہ اپنی والدہ کو دے دینا۔ جب وہ خط اس کی والدہ نے پڑھنا شروع کیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو مچل پڑے، ایڈیسن نے والدہ سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ خط میں لکھا ہے کہ آپ کا بچہ انتہائی ذہین اور قابل ہے مگر ہمارے اوسط درجے کے اساتذہ اسے نہیں پڑھا سکتے لہٰذا آپ اسے خود گھر پر پڑھائیں۔ ایڈیسن کی والدہ نے خوب محنت سے اسے پڑھایا اور بالآخر وہ ایک عظیم سائنسدان بننے میں کامیاب ہوگیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ایک روز وہ گھر کے کاغذات میں کچھ تلاش کر رہا تھا کہ اسے اپنی الماری میں وہ سکول والا خط نظر آیا، اس نے وہ خط پڑھا تو حیران رہ گیا، اس میں لکھا تھا ''آپ کا بچہ انتہائی کند ذہن اور نالائق ہے جسے ہم مزید نہیں پڑھا سکتے اور ہم نے اسے سکول سے نکال دیا ہے لہٰذا آپ خود اس کی تعلیم کا بندوبست کریں۔'' یہ پڑھ کر ایڈیسن بہت رویا اور یہ تاریخی جملہ بولا ''تھامس ایلوا ایڈیسن بنیادی طور پر ایک کند ذہن بچہ تھا جسے اس کی عظیم ماں نے ایک جینیئس بنا دیا۔'' اسی طرح البرٹ آئن سٹائن بھی اپنی ابتدائی تعلیم میں مشکلات کا شکار رہا اور اس کی تعلیمی قابلیت پر بے شمار سوالات اٹھائے گئے۔ مائیکروسافٹ کے بانی بل گیٹس اور شہرہ آفاق شخصیت سٹیو جابز اپنے تعلیمی سفر کو مکمل نہ کر سکے۔ ان سب کے اساتذہ کی ان کے

بارے میں رائے قابلِ تحسین نہ تھی مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری، مسلسل محنت اور بے پناہ ولولے کے ساتھ تاریخ میں اپنا نام سنہرے حروف میں لکھوایا۔ زندگی کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہی اور عظیم لوگوں نے راستوں سے کانٹے ہٹا کر اسے خود کامیابی کی شاہراہ بنایا ہے ورنہ عام لوگ ہمیشہ مشکلات، نامساعد حالات اور راستے کی رکاوٹوں کا گلہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ مناسب وقت اور حالات کے انتظار میں اپنی توانائیاں اور وقت، دونوں برباد کر دیتے ہیں۔ یہ اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری حکومت، نظام کی خرابیوں اور معاشرے کی معاشی اور سماجی ناہمواریوں کے نام کر دیتے ہیں۔

ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں تو جارج واشنگٹن سے لے کر تھامس جیفرسن تک، مائیکل اینجلو سے لے کر پکاسو تک، ابراہم لنکن سے لے کر براک اوباما تک، جو بائیڈن سے لے کر کملا ہیرس تک، سب عظیم اور کامیاب ترین شخصیات کی کامیابی کے پیچھے عزم و ہمت کی ایک لازوال داستان ملتی ہے اور عملِ مسلسل اور مضبوط ترین قوتِ ارادی کی بے مثال کہانیاں۔ اُن تاریخ ساز ہستیوں نے اپنی ناکامیوں، پریشانیوں، مسائل اور حوادثِ زمانہ سے روگردانی کرنے کی بجائے اُن کو اپنی طاقت بنا کر حالات سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مسلسل گرتے رہے، پھسلتے رہے، ڈگمگاتے رہے مگر پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور سینہ تان کر میدان میں نکل پڑے اور پھر جیت کی لگن کو اپنا سب سے مضبوط ہتھیار بنا کر منزل کو حاصل کرنے کے لیے آبلہ پا چلتے رہے۔ کھیل کا میدان ہو یا سیاست، کاروبار ہو یا تجارت، طب ہو یا فنونِ لطیفہ، خطابت ہو یا تحقیق، زندگی کے ہر شعبہ میں منفرد مقام یا ممتاز حیثیت حاصل کرنے کے لیے خوداعتمادی، محنت پر یقینِ محکم اور جہدِ مسلسل پر ایمان دراصل انسان کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر آپ جیت کی لگن پر یقین کر لیں تو پھر لگن کی جیت یقینی ہے اور آپ کے خواب آپ کی عملی زندگی میں دھنک رنگ بھر دیں گے اور کامیابی آپ کی خدمت پر مامور ہو جائے گی۔ ورنہ چھوٹی سی ناکامی پر واویلا کرنے والوں اور ہلکی سی پریشانی لاحق ہونے پر مایوس ہو جانے والوں کی منزل کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ بقول

حنفی غلام ہمدانی...

حسرت پہ اس مسافر بےکس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

❑❑❑
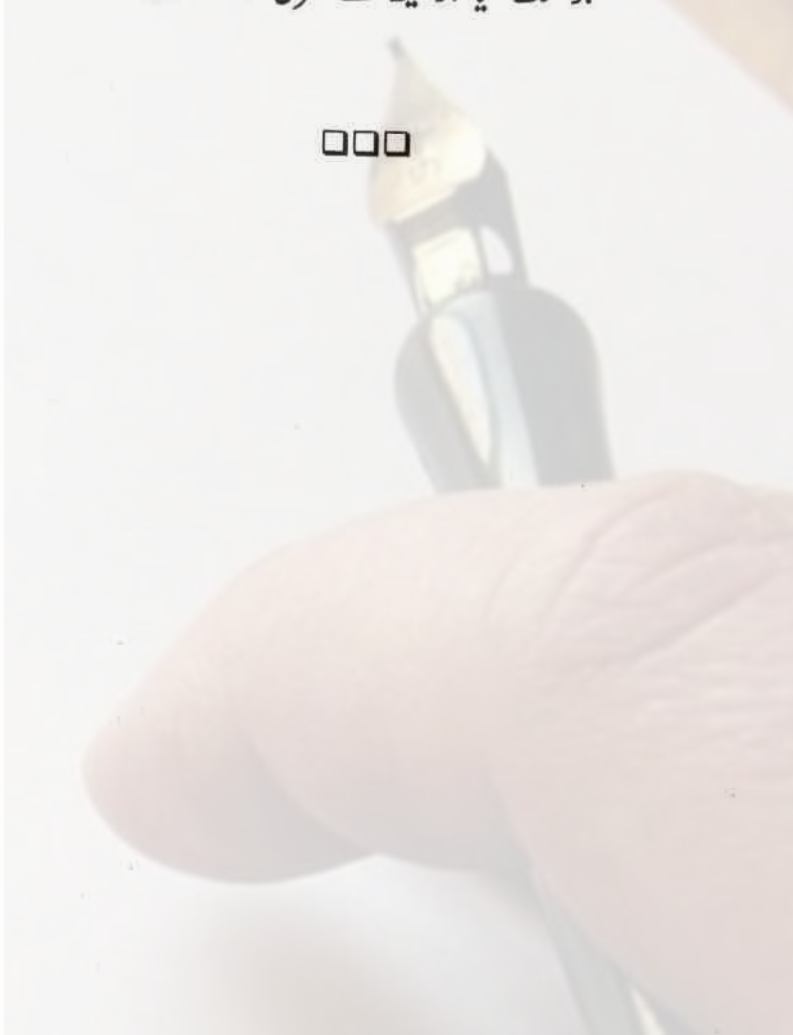
ماں بولی کی موت

پنجاب کی ثقافت، رہن سہن، اقدار اور رسم و رواج کی بقا اور احیا میں مقامی شعرا، فنکاروں اور لوک گلوکاروں کا کردار ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔ پنجابی صوفی شاعری ہو یا لوک گیت، ہمیں اپنی ماں بولی سے سچا پیار انھی کے طفیل نصیب ہوا۔ 1980ء کی دہائی کے اوائل میں ہمارے دیہات میں بجلی کی سہولت محدود تھی، اس وقت کمپیوٹر تھا نہ موبائل فون، نہ انٹرنیٹ اور نہ ہی سوشل میڈیا کی یلغار۔ ذرائع ابلاغ میں ریڈیو کی حکمرانی تھی، محض چند گھرانوں میں ٹیلی وژن کی عیاشی موجود تھی۔ پاکستان ٹیلی وژن واحد چینل تھا اور وہ بھی چند گھنٹے کے لیے، نشریات کا آغاز عصر سے شروع ہوتا، رات نو بجے خبرنامے کے بعد فرمانِ الٰہی کے ساتھ یہ اختتام پذیر ہو جاتی تھیں۔ دیہی آبادی رات کو نمازِ عشا کے بعد سو جاتی اور ہم رات کے ڈرامے اور خبرنامے کے بعد سونے کی تیاری شروع کرتے۔ باہر کھیت کھلیان میں ہل چلاتے ہوئے ٹریکٹر پر چلتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی اونچی آواز میں گانے سنائی دیتے اور پنجابی شاعری میں دوہڑے اور ماہیے ہماری دیہی ثقافت اور رہن سہن کی عکاسی کرتے تو گویا دل باغ باغ ہو جاتا۔ ان سریلی آوازوں میں فوک میوزک کے تین قد آور نام ہمارے کانوں میں رس گھولتے جن میں منصور ملنگی، طالب حسین درد اور اللہ دتہ لونے والا شامل

تھے۔ موسیقی کے پیچ وخم اور سُر کے تال میل سے نابلد ہونے کے باوجود ان بڑے فنکاروں اور مانے ہوئے گلوکاروں کے پنجابی گیت قلب وروح میں اتر جاتے۔ لڑکپن کے ابتدائی ایام میں ہی اپنی ماں بولی میں شعروسخن سے شغف انھی تین مسحورکن آوازوں کی وجہ سے بڑھا اوراس کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت سے گہرے رشتے بھی استوار ہونے لگے۔

اُس دور میں تفریح کے ذرائع اور سہولتیں محدود ہونے کے سبب شادی بیاہ کی تقریبات اور مقامی میلوں پر کہیں رقص وسرود کی محافل منعقد ہوتیں اور ان تین فنکاروں میں سے کسی ایک کو بھی مدعو کرلیا جاتا تو مہمانوں کے علاوہ علاقے کے دوسرے افراد بھی ایک جمِ غفیر کی شکل میں آن دھمکتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے خاندان میں خوشی کے ایک موقع پر کس طرح برادری کی پُرزور فرمائش پر اللہ دتہ لونے والا کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا جن کی شہرت اس وقت آسمانوں پر تھی۔ خطیر رقم لے کر دو، تین ماہ ایڈوانس میں فنکشن کا وقت طے ہو پاتا تھا، لہٰذا انھیں مدعو کرنے کے لیے چنیوٹ کے ایک سیاسی وڈیرے کی خدمات لینا پڑیں جس کے اثر ورسوخ کے سبب اللہ دتہ لونے والا نے ہمارے گاؤں میں آنے کی ہامی بھر لی۔ جیسے ہی ہمارے علاقے میں اس عظیم فنکار کی آمد کی اطلاع عام ہوئی تو پورا علاقہ اس دن اور وقت کے انتظار میں مضطرب رہنے لگا۔ پھر وہ شام آن پہنچی اور لوگ جوق در جوق متعین جگہ پر ٹولیوں کی شکل میں امڈ آئے۔ اللہ دتہ لونے والا کو اپنے درمیان پا کر پورا مجمع مسرت سے مالا مال تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیسے ہی اس سریلے گلوکار نے اپنے ہارمونیم اور طبلے کے تال میل ملائے تو سامعین پر سکوت طاری ہو گیا۔ معروف پنجابی شاعر مہر ریاض سیال کے مشہورِ زمانہ دوہڑے سے آغاز ہوا اور اپنی روایتی اونچی لَے میں یہ مصرع پڑھا ''نت اپنی بال کے سیکی کر، تو آس کسے دی رکھ ناہیں'' تو گویا یہ مسحورکن آواز آسمانوں سے جاٹکرائی اور پھر گونجتی ہوئی واپس آ کر سامعین کے قلب وروح میں اتر گئی۔ لگ بھگ دو گھنٹے اس خوبصورت فنکار نے سننے والوں کو اپنی منفرد آواز کے سحر میں گرفتار رکھا اور انھیں ہمیشہ کے لیے

اپنا گرویدہ بنالیا۔

یہ عظیم فنکار 1957ء میں چنیوٹ کے نواحی گاؤں لونے والا میں پیدا ہوا اور سریلا ہونے کے سبب بچپن سے ہی سکول میں نعت و ترانے پڑھتا۔ سکول اسمبلی میں علامہ محمد اقبال ؒ کی دعائیہ نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' باترنم سنا کر پورے سکول کو اپنی جادو بھری آواز کے سحر میں گرفتار کر لیتا۔ اک دفعہ اپنے دلآویز سرسنگیت کے سبب سکول کی بزمِ ادب تقریبات میں اول پوزیشن حاصل کی تو اس کے استاد نظامی صاحب نے اللہ دتہ لونے والا کے والدِ گرامی سے مشاورت کے بعد اسے اوکاڑہ کے بزرگ فنکار میاں عیسیٰ کی شاگردی میں دے دیا جہاں اسے فوک میوزک کی باقاعدہ تربیت ملی مگر اپنے بزرگ استاد کی جلد وفات کے بعد اس کے بیٹے طالب حسین کی شاگردی میں ہارمونیم کی تربیت حاصل کی اور یوں پنجابی فوک گائیکی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اپنے منفرد اندازِ گائیکی کے سبب اللہ دتہ لونے والا نے درجنوں ایوارڈز اپنے نام کیے۔ اُن کی فنی خدمات کے اعتراف میں صدرِ پاکستان نے اسے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا تو پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویجز آرٹس اینڈ کلچر نے انھیں پرائیڈ آف پنجاب کا اعزاز بخشا۔ 1960ء کی دہائی کے وسط میں شروع ہونے والا یہ سفر چند دن پہلے اس وقت اختتام پذیر ہوا جب اللہ دتہ لونے والا پینسٹھ برس کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہونے سے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور یوں پنجابی فوک میوزک کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا اور ہمارا ملک ایک عظیم گلوکار سے محروم ہو گیا۔

چند برس قبل جھنگ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے پنجابی شاعر مہر ریاض سیال کی کتاب ''دسکارے'' کی تقریبِ رونمائی میں مجھے مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تو میں ہامی بھرنے کے باوجود یہ سوچ کر پریشان رہا کہ انگریزی ادب اور قانون میں ڈگری لینے اور سول سروس کے گورکھ دھندے میں الجھے رہنے کے سبب بھلا میں مہر ریاض کے شعر و سخن پر کیا بات کروں گا، مگر پھر مجھے اپنے بچپن کے زمانے میں کانوں میں رس گھولتی آواز یاد آئی اور اللہ دتہ لونے والا کی مسحور کن آواز میں گائے ہوئے مہر ریاض سیال کے دوہڑے یاد آئے جن کے سبب نہ صرف پنجابی

ثقافت اور اپنے مقامی رہن سہن سے آشنائی ہوئی بلکہ ماہ وسال گزرنے کے ساتھ ساتھ ان گیتوں میں چھپے معانی و مفاہیم کے اسرار ورموز بھی سمجھ آنے لگ گئے، زندگی گزارنے کے قرینے اور احساسِ ذمہ داری کے جذبات بھی اجاگر ہونے لگے۔ میں پوری دیانتداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ سکول کے زمانہ طالبعلمی میں نہ کسی موٹیویشنل سپیکر سے پالا پڑا اور نہ ہی تھنک بگ فلاسفی کا ادراک ہوا، اگر بڑے خواب دیکھنے اور زندگی میں منفرد مقصد حاصل کرنے کی ضد ٹھانی تو یہ پنجابی شعرا کے دوہڑے اور گیت ہی تھے جنھوں نے اِن عظیم فنکاروں کے سریلے اندازِ گائیکی کے سبب میرے اندر گھر کر لیا تھا اور انجانے میں مجھے کسی بڑی منزل کی طرف دھکیل بھی رہے تھے۔ یہی لوک گیت تھے جو سکول آتے جاتے راستے میں کسی ٹریکٹر پر چلتے ٹیپ ریکارڈر پر سننے کو مل جاتے تھے اور نجانے مجھ جیسے کتنے نوجوانوں کو ان منفرد لوک گلوکاروں نے اپنے دل لبھانے والے گیتوں سے کامیابی کے راہ دکھائی ہوگی اور زندگی میں خودی اور خودانحصاری کے سنہرے اصول اپنانے میں اپنا کلیدی کردار انجام دیا ہوگا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ گیت اور ان کو گانے والے سریلے فنکار ہی دراصل ہمارے پنجابی کلچر، اس کی دیہی زندگی اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے رومانس کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اب وہ شعرا نہیں رہے، نہ وہ عابد تمیمی، رحمٰن صحرائی، یٰسین اور نہ ہی مہر ریاض، جن کے پنجاب کی مٹی میں گندھے ہوئے دوہڑے اور ماہیے ایک طرف ہمیں اپنی ماں بولی سے پیار کرنا سکھاتے تو دوسری طرف ہمیں اپنی دھرتی ماں کے سچے بیٹے بن کر اس کے لیے کوئی قابلِ فخر بڑا کام کرنے پر اکساتے رہتے۔ بلاشبہ ان فنکاروں نے ہمیں اپنے وطن، اپنی مٹی اور اس کی جڑوں سے ایک مضبوط تعلق استوار کرنے اور اسے مضبوط تر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ منصور ملنگی اور طالب حسین درد چند برس قبل منوں مٹی تلے جا سوئے تو فوک موسیقی اور پنجابی شاعری کو اللہ دتہ لونے والے نے اپنے سریلے گیتوں میں زندہ رکھا۔ اب وہ بھی راہِ عدم سدھار گئے ہیں تو میں سوچ رہا ہوں کہ اب پنجابی وسیب کے ساتھ ہمارا رشتہ کس طرح مضبوط ہوگا اور اپنے پیارے پنجاب کی ماں

بولی اور اس میں ہونے والی شاعری کو اگلی نسلوں تک کون پہنچائے گا۔ جب بھی یہ خیال آتا ہے تو پریشانی لاحق ہو جاتی ہے کہ ہمارے بچے تو پہلے ہی انگلش میڈیم سکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں اور پنجابی زبان اور اس کی شاعری و گائیکی سے نا آشنا ہیں، کہیں ان عظیم فنکاروں کے مر جانے کے سبب ہماری ماں بولی ہی نہ مر جائے اور خدانخواستہ یہ زرخیز مٹی بانجھ نہ ہو جائے جسے اللہ دتہ لونے والا کی سریلی آواز نے چار چاند لگا رکھے تھے۔

❑❑❑
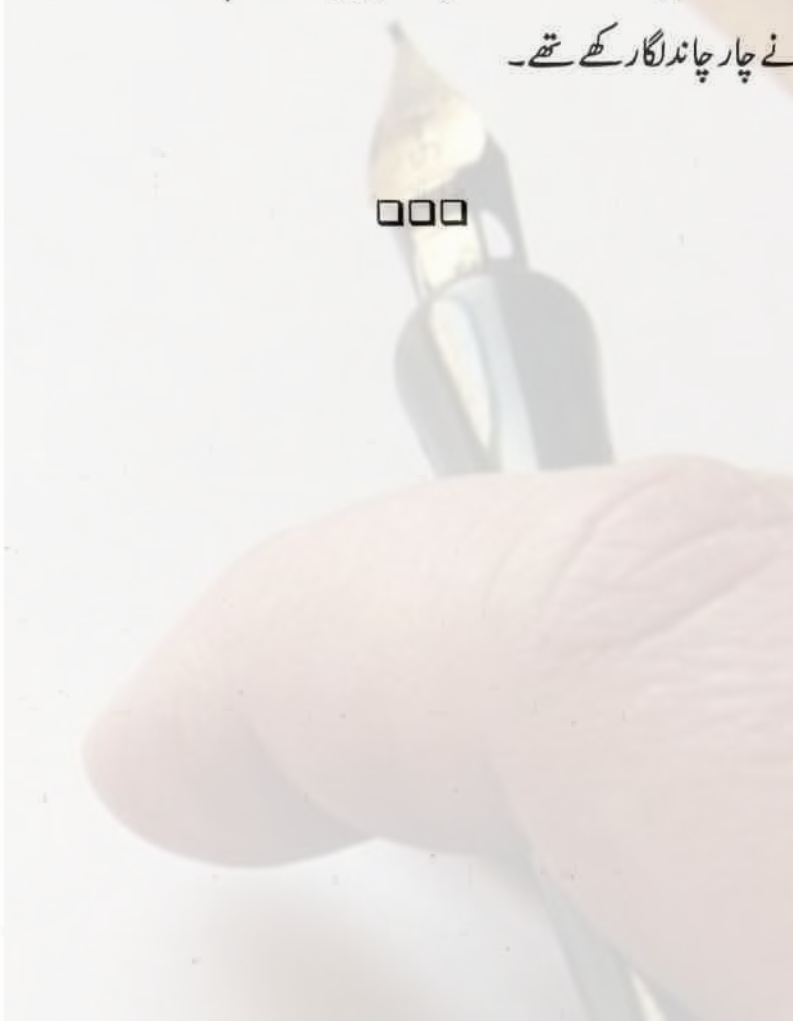
آگے بڑھتا ہوا ایف بی آر!

مالی سال 20-2019ء کا اختتام ہوا تو ایف بی آر نے مجموعی طور پر 3997 ارب روپے محصولات میں نیٹ ریونیو حاصل کیا اور 30 جون 2020ء کی شام اس قابلِ تحسین کارکردگی پر ملک بھر میں ادارے کے ذیلی دفاتر میں موجود افسران اور ملازمین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کورونا وبا کے باعث نہ صرف معمولاتِ زندگی بری طرح سے متاثر ہو چکے تھے بلکہ کاروباری معاملات بھی مسلسل تعطل اور دباؤ کی وجہ سے پریشان کن انداز میں چل رہے تھے۔ اس خوفناک اور خونیں وبا کے سائے جیسے جیسے عالمی سطح کے ساتھ ساتھ پاکستان پر گہرے ہوتے گئے، ایسے میں ملکی معیشت کے استحکام اور کاروباری آسودگی میں نئے انداز اپنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نئے مالی سال 21-2020ء کے آغاز میں ہی حکومت سے کئی سالوں سے پھنسے ہوئے ریفنڈز کی رقوم کی ادائیگی کے لیے اضافی گرانٹ منظور کرائی گئی اور ملکی صنعت وتجارت کا پہیہ چلانے اور کاروباری مراکز کی رونقیں بحال رکھنے کے لیے اربوں روپے کے ریفنڈز صنعتکاروں اور ٹیکس گزاروں کو براہِ راست منتقل کیے گئے۔ جب دُنیا بھر میں کورونا کے باعث فیکٹریاں بند ہونا شروع ہوئیں تو وطنِ عزیز میں کارخانے ڈبل شفٹ پر چلنا شروع ہو گئے۔ فیصل آباد جیسے بڑے اور گنجان آباد شہر میں

مزدوروں کی قلت پڑ گئی اور فیکٹری مالکان بیرونِ ملک سے ملنے والے آرڈرز کو پورا کرنے کے لیے پریشان نظر آنے لگے۔ ٹیکسٹائل سیکٹر کی پیداوار میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔ برآمدات بڑھیں اور ملک کو قیمتی زرِمبادلہ حاصل ہوا۔

اس کے ساتھ ہی کلین ریونیو کولیکشن کا ایک نیا اور اچھوتا نظام متعارف کروایا گیا جس میں کسی بھی ٹیکس گزار سے ایک پائی تک بھی ایڈوانس نہ لینے کی تلقین کی گئی اور ہر ٹیکس گزار کے جائز اور تصدیق شدہ قابلِ ادا ریفنڈ کی فوری ادائیگی کے لیے ہدایات دی گئیں۔ مزید برآں ٹیکس گزاروں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور خوش اخلاقی کے ساتھ برتاؤ اور ان کو ہر ممکن آسانی فراہم کرنے کے لیے بھی واضح اور غیر مبہم احکامات جاری کیے گئے۔ ان اقدامات کا مقصد ٹیکس گزاروں اور وصول کنندگان کے درمیان موجود خلیج کو کم کرنا، بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا خاتمہ اور باہمی اعتماد کی بحالی کو یقینی بنانا تھا۔ تمام فیلڈ فارمیشنز میں کاروباری آسانی اور تجارتی آسودگی میں درپیش رکاوٹوں کے خاتمے کے لیے خصوصی احکامات جاری کیے گئے اور ایف بی آر میں موجود کالی بھیڑوں کے خلاف شکایات پر ایکشن لینے کے لیے محتسب مقرر کیے گئے تاکہ نچلی سطح پر ٹیکس گزاروں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ کیا جا سکے۔

مالی سال 21-2020ء میں 4691ارب روپے کے محصولات اکٹھا کرنے کا ہدف تھا مگر مذکورہ بالا اقدامات، ٹیکس آسانی پر مبنی شفاف نظام اور میرٹ کو یقینی بنانے کے لیے دی گئی ہدایات نے کام آسان بنا دیا۔ 30 جون 2021ء کی شام مالی سال کے خاتمے پر نہ صرف مطلوبہ ہدف حاصل کر لیا گیا بلکہ 54ارب کی خطیر رقم اضافی اکٹھی کی گئی۔ اس طرح گزشتہ مالی سال 20-2019ء کے نیٹ ریونیو 3997ارب روپے کے مقابلے میں تقریباً19 فیصد کا اضافہ ہوا۔ جون 2021ء میں نیٹ کولیکشن کا حجم 568ارب روپے رہا جو جون 2020ء میں حاصل کردہ 451ارب روپے کے مقابلے میں 26 فیصد زائد تھا۔ سب سے خوشگوار پہلو ریفنڈز کے اجرا میں 86 فیصد کا اضافہ تھا کیونکہ مالی سال 21-2020ء میں مجموعی طور پر 251ارب روپے کے ریفنڈز جاری کیے

گئے جو پچھلے سال 135ارب روپے تھے۔ واضح رہے کہ 30جون 2021ء تک مالی سال 2020ء کے انکم ٹیکس گوشوارے جمع کروانے والوں کی تعداد 30لاکھ 10ہزار تک بڑھ چکی ہے، گزشتہ مالی سال کے خاتمے پر یہ تعداد 26لاکھ 70ہزار تھی۔ اس طرح ٹیکس گوشواروں کی وصولی میں 12.5فیصد اضافہ ہوا جبکہ ٹیکس گوشواروں کے ساتھ ادا شدہ ٹیکس 52ارب رہا۔

انکم ٹیکس کے محصولات میں اضافے کے ساتھ ساتھ کسٹم ڈیوٹی میں بھی قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ پاکستان کسٹمز نے مالی سال 2020-21ء میں مجموعی طور پر 742ارب روپے کی کسٹمز ڈیوٹی حاصل کی جبکہ مقررہ ہدف 640ارب روپے تھا۔ اس طرح مجوزہ ٹارگٹ سے 102 ارب زائد ڈیوٹی وصول کی گئی جو 16فیصد اضافہ ہے۔ صرف جون کے مہینے میں مقررہ ٹارگٹ 75ارب تھا لیکن 83 ارب روپے کے محصولات جمع کیے گئے اور اس طرح مطلوبہ ہدف سے 8ارب زائد کسٹم ڈیوٹی جمع کی گئی۔ مالی سال 2019-20ء کے مقابلے میں 2020-21ء میں 117 ارب زائد کسٹم ڈیوٹی حاصل ہوئی جو 18فیصد زائد ہے۔ پاکستان کسٹمز نے 2020-21ء میں 57.7ارب روپے کی سمگل شدہ اشیا ضبط کیں جو پچھلے سال 36ارب روپے تک تھیں اور اس طرح ضبط کی گئی اشیا کی شرح میں بھی 58 فیصد اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈائریکٹوریٹ جنرل انٹیلی جنس اینڈ انویسٹی گیشن نے مالی سال 2020-21ء میں شاندار کارکردگی دکھاتے ہوئے 1608 تفتیشی رپورٹس اور ریڈ الرٹس پر مبنی 244ارب روپے کے محصولات سے متعلق ایف بی آر کے ذیلی دفاتر کو آگاہ کیا۔ اس کے علاوہ اسی ڈائریکٹوریٹ نے جعلی سگریٹ کے 8754 کارٹن ضبط کیے جن کی مالیت 8 کروڑ 75 لاکھ روپے سے زائد تھی۔ ان پر قابلِ ادا ٹیکس کی رقم بھی چھپائی گئی تھی۔

رواں مالی سال کے لیے ملنے والے ٹیکس اہداف کا حجم 5829 ارب روپے ہے، جس کا تعاقب شاندار انداز میں شروع کیا گیا ہے اور پہلے چار ماہ (جولائی تا اکتوبر) میں 1841 کا نیٹ ریونیو جمع کر کے 37فیصد ریکارڈ اضافہ حاصل کیا گیا۔ مقررہ ہدف 1608 ارب سے 233ارب روپے زائد محصولات اکٹھے کر کے گزشتہ سال کے اسی دورانیہ میں جمع ہونے والے 1347ارب

سے تقریباً 500 ارب روپے زائد ٹیکس حاصل کیا گیا۔ صرف اکتوبر کے ماہ میں 337 ارب روپے کے ہدف کے مقابلے میں 440 ارب روپے کے محصولات وصول کر کے 30.5 فیصد اضافہ حاصل کیا گیا۔ یہ سب اعداد وشمار اور قابلِ رشک کارکردگی حکومت کی توجہ اور ستائش حاصل کر چکی ہے اور گزشتہ کئی مہینوں سے وزیر اعظم نے اس پرفارمنس پر تواتر سے ٹوئیٹس بھی کیے ہیں۔

ستمبر میں انکم ٹیکس گوشواروں کے حصول کے لیے ایک بھرپور تشہیری مہم چلائی گئی۔ اہلِ قلم نے قومی معیشت میں ٹیکس کی ادائیگی پر روشنی ڈالی۔ ٹی وی اینکرز نے بھی قوم سے بھرپور اپیل کی۔ موبائل کمپنیوں کے تعاون سے صارفین کو آگاہی پیغامات بھیجے گئے۔ 31 اکتوبر تک مالی سال 2021ء کے انکم ٹیکس گوشواروں کی تعداد 28 لاکھ سے تجاوز کر گئی جبکہ 52 ارب سے زائد ٹیکس بھی وصول ہوا۔ رواں مالی سال کے آخر تک ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ 6000 ارب سے زائد ریونیو حاصل کرنے کا ٹارگٹ رکھا گیا ہے اور امید ہے کہ عوام کے تعاون سے یہ ہدف بھی حاصل کر لیا جائے گا۔ اگر ملک کو غیر ملکی قرضوں اور عالمی اداروں کی ڈکٹیشن سے آزاد کرانا ہے تو سب کو اپنے اپنے حصے کا چراغ جلانا ہوگا اور ملکی معیشت میں اپنا حصہ بقدر جثہ ڈالنا ہوگا۔ جب ہر شہری ٹیکس کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر ادا کرے گا، تبھی ملکی ترقی کا سفر تیز تر ہوگا۔ بقول شاعر...

جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
جہاں سے چاہیں گے، رستہ وہیں سے نکلے گا
وطن کی مٹی مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقیں ہے کہ چشمہ یہیں سے نکلے گا

□□□

ریاستِ مدینہ میں مسجد کا کردار

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ اعلانِ نبوت کے بعد تیرہ برس تک نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تبلیغِ دین کے مشن پر گامزن رہے، جب کفارِ مکہ اور دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیاں اور کارستانیاں بامِ عروج پر پہنچ گئیں تو اِذنِ الٰہی سے مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لائے اور مہاجرین اور انصار کے درمیان باہمی تعاون، ایثار، مساوات، اخوت اور ہمدردی کے فقید المثال اصولوں پر مبنی پہلی اسلامی فلاحی ریاست قائم کی جو آج تک بنی نوعِ انسان کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے اور فلاحی ریاست کے نظریے اور مفہوم کو سمجھنے کے لیے ایک مستند تاریخی حوالہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے قائم کی گئی یہ عظیم اسلامی فلاحی ریاست دین اور دُنیا کے جملہ امور کا احاطہ کرتی ہے اور انسانی ضروریات اور مسائل کے حل اور اُن سے نمٹنے کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ سنہری اصولوں پر مبنی یہ ریاست دراصل مدینہ طیبہ میں تعمیر کی گئی پہلی مسجد جسے مسجد نبوی کے نام سے جانا جاتا ہے، میں قائم ہوئی اور ریاست کے جملہ انتظامی امور مسجدِ نبوی ہی میں انجام دیئے جاتے تھے۔

مسجد نبوی دراصل مدینہ کی فلاحی ریاست کا بنیادی مرکز تھی اور یہی پہلا پارلیمنٹ ہاؤس، مجلسِ شوریٰ، سپریم کورٹ اور پبلک سیکرٹریٹ قرار پائی۔ نبی کریم ﷺ دینِ اسلام کی تبلیغ، تعلیم و تربیت اور اپنے پیغامِ حق کی نشر و اشاعت کے ساتھ مسجدِ نبوی ہی میں قانون سازی، مجلس شوریٰ کی مشاورت، عدالتی احکامات اور انتظامی امور سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ یوں مسجدِ نبوی ریاستی امور کی انجام دہی میں کلیدی حیثیت اختیار کر گئی۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ دورِ رسالت میں مسجد ہی میں عدالتی فیصلے سنائے جاتے، جنگوں اور غزوات کی تیاری اور عسکری تربیت کے مراحل وہاں انجام پاتے، وہیں دوسری قوموں اور قبائل کے عمائدین اور وفود کا استقبال کیا جاتا، مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی، بیت المال سے غربا اور مساکین کی حاجت روائی بھی مسجدِ نبوی میں ہی کی جاتی، جزا اور سزا کے قوانین کا نفاذ بھی مسجدِ نبوی ہی سے کیا جاتا تھا۔ مسجد کا ریاستی امور کی انجام دہی میں کلیدی کردار سنتِ رسول ﷺ بھی ہے اور فلاحی ریاست کا بنیادی جز و بھی۔ لہٰذا یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست کا قیام مسجد کے کلیدی کردار کے بغیر ممکن نہیں۔

گزشتہ اڑھائی سالوں سے پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے اور ریاستِ مدینہ کے تصور کو عملی طور پر پاکستانی امورِ سلطنت میں شامل کرنے کی بازگشت سنائی دے رہی ہے مگر پاکستانی انتظامی ڈھانچے اور عدل و انصاف کے نظام میں موجودہ کمزوریاں اور قباحتیں اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں رکاوٹ ہیں۔ لوٹ کھسوٹ، اقربا پروری، کرپشن، سفارش اور رشوت جیسے ناسور اپنے خونی پنجے گاڑے نظامِ حکمرانی کو عملی طور پر مفلوج کر چکے ہیں۔ غریب، بےنوا اور بےکس طبقہ فاقوں، ڈاکوں اور ناکوں کے ہاتھوں مجبور دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے کما پاتا ہے اور آئے روز نئے مسائل سے نبرد آزما رہتا ہے۔ دولت اور وسائل کا ارتکاز محض چند خاندانوں اور مخصوص افراد تک ہے جبکہ آبادی کی اکثریت بنیادی ضروریات سے محروم چلی آ رہی ہے۔ عدم انصاف، سماجی تفاوت اور معاشی ناہمواریاں ہمارے نظام کو ایک فلاحی ریاست کے عظیم تصور کی

عملی تصویر بنانے میں حائل ہیں لہٰذا عوام اور حکومت کے درمیان موجود خلیج اور عدم اعتماد کی فضا مزید بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

اگر حکومت سنجیدگی سے چاہتی ہے کہ پاکستان کو ریاستِ مدینہ جیسی عظیم فلاحی ریاست بنانا ہے اور اسلام کے سنہری اصول اپنا کر اقربا پروری، رشوت، سفارش، لوٹ کھسوٹ اور ظلم وستم کے بجائے عدل وانصاف، مساوات، اخوت، بھائی چارے، میرٹ اور فلاح وبہبود کے نظام کو فروغ دینا ہے تو افسر شاہی کو جمہور کے تابع کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس ضمن میں انتظامیہ اور عوام کی خدمت پر مامور تمام ادارے اور اُن کے سربراہان اپنے آپ کو صحیح معنوں میں عوام کا جواب دہ بنائیں، اپنے دفاتر کے دروازے سائلین کے لیے کھلے رکھیں اور ہفتے میں ایک مرتبہ اپنے علاقے کی سب سے بڑی مسجد میں کھلی کچہری کا انعقاد یقینی بنائیں تو عوام کا کھویا ہوا اعتماد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب آئی جی اور سیکرٹری سے لے کر آر پی او، کمشنر، ڈی سی، ڈی پی او اور تحصیل کی سطح پر ڈی ایس پی اور اسسٹنٹ کمشنر اپنے اپنے علاقوں کی جامع مساجد میں عوام سے خود مخاطب ہوں گے اور انھیں حکومت کی ترجیحات اور مختلف ترقیاتی پروگرامز، فلاح و بہبود کے منصوبوں اور چلائی جانے والی دیگر سکیموں سے روشناس کرائیں گے اور میڈیا، انجمن تاجران، چیمبر آف کامرس اور دیگر عوامی نمائندگان کی موجودگی میں کھلی کچہری کا انعقاد کریں گے، عوام کی شکایات، مسائل اور مشکلات کو توجہ سے سنیں گے اور اُن کے ازالہ اور حل کے لیے موقع پر فوری احکامات صادر فرمائیں گے تو کیا ریاستِ مدینہ کا خواب عملی حقیقت نہیں بنایا جا سکتا؟ اس مسجد پروگرام سے نہ صرف عوام اور حکومت کے درمیان باہمی اعتماد اور تعاون کے رشتے مضبوط ہوں گے بلکہ عوام کی انتظامی امور اور اُن سے متعلقہ افسران تک آسان رسائی یقینی بنائی جا سکے گی۔ اقربا پروری، رشوت اور سفارش کی لعنت سے چھٹکارا ممکن ہو سکے گا اور حکومت کی خدمات اور سہولتوں کا نچلی سطح پر بہم پہنچانا یقینی بن جائے گا۔

کیا یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ نہیں کہ برطانوی سامراج کے خاتمے کے باوجود آج بھی وطنِ عزیز

پاکستان میں وہی طرزِ حکمرانی رائج ہے جو انگریز صاحب بہادر نے ایک غلام قوم پر اپنا قبضہ مضبوط بنانے کے لیے اپنایا تھا۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ کہ آئے روز ہم علمی مباحثوں اور ٹی وی ٹاک شوز میں برطانیہ، امریکا، یورپ اور سکینڈے نیویا جیسے مہذب معاشروں میں قانون کی حکمرانی اور عدل وانصاف کی مثالیں تو دیتے ہیں مگر خود اس ضمن میں عملی اقدامات کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ امر باعثِ ندامت ہے کہ ان معاشروں نے ریاستِ مدینہ کے سنہری اصول اپنا کر عوامی خدمت کے نئے معیار متعارف کروائے اور اپنے ہاں عدل وانصاف اور معاشی استحکام کو یقینی بنایا اور ہم اُس ریاست کو بھی اسلامی فلاحی ریاست نہیں بنا پائے جو حاصل ہی اسلام کے نام پر کی گئی تھی۔

پاکستان میں سرکاری اداروں کی کارکردگی پر ہمیشہ سے کئی سوالات اٹھتے رہے ہیں اور وہ حقیقی معنوں میں عوام کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ افسران اور عوام کے درمیان بداعتمادی، عدم تعاون اور بڑھتے ہوئے فاصلے یقیناً ہر حکومت کی مجموعی کارکردگی کا عکاس رہے ہیں۔ ریاستِ مدینہ کے سنہری اصولوں اور عظیم تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری افسران اپنے فرسودہ پروٹوکول، جھوٹی انا اور اپنے اردگرد افسر شاہی کے بُنے جال سے باہر نکلیں اور اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ قانون کی حکمرانی، عدل وانصاف کی فراہمی اور بے کس اور کمزور طبقے تک حکومتی وسائل اور سہولتوں کی منتقلی ہی دراصل ریاستِ مدینہ کے ماڈل کے بنیادی اصول ہیں جنھیں اپنا کر ہم اپنے ملک میں اسلامی فلاحی ریاست کا نظام ایک جیتی جاگتی حقیقت بنا سکتے ہیں۔ مساجد میں کھلی کچہری اور سوالات و جوابات کی نشستیں عوام کے مسائل حل کر سکتی ہیں، شفاف اور میرٹ پر مبنی نظام کے ذریعے سرکاری ادارے عام آدمی تک معاشی ترقی کے ثمرات پہنچا سکتے ہیں جس سے حکومت اور عوام کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم کی جا سکتی ہے۔ سرکاری افسران عملی طور پر عوام کے جواب دہ بن کر ریاستِ مدینہ کے قیام میں اپنا کلیدی کردار ادا کر کے وطنِ عزیز کو ایک اسلامی فلاحی ریاست

بنانے میں خود آگے بڑھ کر پہل کریں اور ملکی تاریخ کا دھارا بدل ڈالیں۔ نقطۂ آغاز کے لیے علامہ اقبال ؒ کا یہ شعر امید کی کرن ہے۔

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

❑❑❑
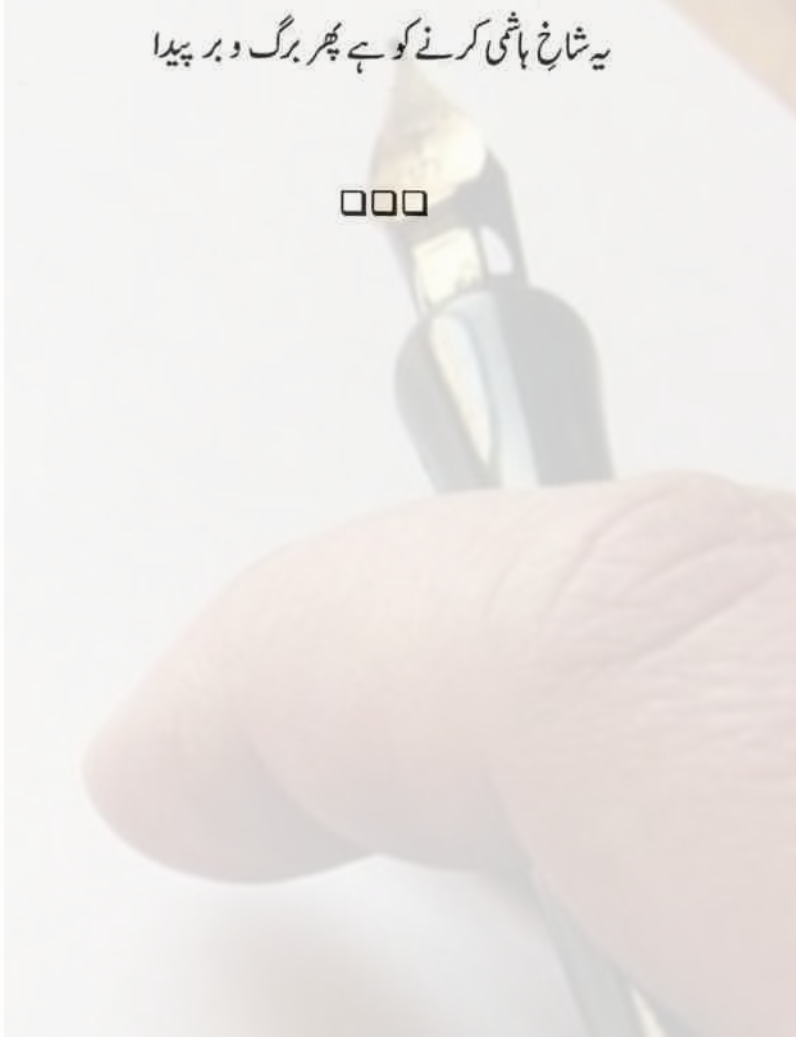
استقبالِ رمضان

میرے روحانی پیشوا، محسن ومربی اور علمی وفکری استدلال میں استادِ محترم پروفیسر رحمت علی المعروف "بابا جی" ہر سال آمدِ رمضان سے قبل اپنے آستانہ عالیہ پر ایک خوبصورت اور روح پرور محفل کا انعقاد کرتے ہیں جس میں اس عظیم ماہِ مبارک کی رحمتوں، برکتوں اور فضائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور بابا جی کا دل پذیر بیان قلب وروح میں اتر کر علم ونور کے چراغ روشن کر دیتا ہے اور یوں محفل میں شریک ہر شخص اس مبارک مہینے کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہو کر واپس لوٹتا ہے۔ آخر میں سوال وجواب کی نشست ہوتی ہے اور بابا جی سوالات کا پوری دلجمعی، تحمل اور تدبر سے جواب دیتے ہیں۔ اس دوران میں نے کبھی بھی اُن کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ سوال پوچھنے والے کے بارے میں بدگمانی رکھتے ہیں بلکہ وہ خوش دلی سے عقل ودانش کا فیضِ عام بانٹتے ہیں اور یوں اس محفل میں استقبالِ رمضان کے جملہ امور کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں کے برعکس اس بار اس بابرکت محفل میں توقع سے زیادہ لوگ شریک ہوئے اور بابا جی نے پُرتکلف عشائیے کا بھی اہتمام کر رکھا تھا جو شاید روزہ افطار کرانے کی ڈرل ریہرسل تھی۔ یہ فکری نشست عصر کی نماز سے شروع ہو کر عشا کی نماز تک جاری رہی، بعد میں ہمیشہ کی طرح راقم الحروف اور

باباجی کا برطانیہ پلٹ ہونہار شاگردِ خاص جیدی میاں اُن کے علم کدہ میں مزید دو گھنٹے حکمت کے گوہرِ نایاب اپنی جھولیوں میں بھرتے رہے۔

ہمیشہ کی طرح باباجی کی علمی گفتگو نے اپنا جادو جگایا، انھوں نے سامعین کو رمضان کریم کی ممتاز اور یگانہ حیثیت سے روشناس کرایا۔ انھوں نے فرمایا کہ رمضان المبارک قمری مہینوں میں نواں مہینہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس ماہِ مبارک کی اپنی طرف خاص نسبت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''رمضان اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے'' یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اس مبارک مہینے کو ربِ ذوالجلال سے خاص نسبت ہے اور یہی فوقیت اسے دوسرے مہینوں سے ممتاز بناتی ہے۔ اس خصوصی تعلق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تجلیاتِ خاص اور انوار و اکرام اس مبارک مہینے میں اس قدر تواتر سے نازل ہوتے ہیں کہ رحمتِ الٰہی گویا موسلا دھار بارش کی طرح برستی رہتی ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کے اوّل حصے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے (جس کے سبب انوار و اسرار کے اظہار کے سب امکان آشکار ہوتے ہیں اور یوں انسان کو اپنے گناہوں کے خبائث اور معصیت کی کثافتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔) اس مہینے کا دوسرا عشرہ گناہوں سے مغفرت اور آخری دوزخ کے عذاب سے آزادی کا ہے۔ باباجی نے مزید فرمایا کہ ارشادِ ربانی ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کا اجر دوں گا۔ چونکہ روزے کی غرض اور فلسفہ بھی نفسانی خواہشات کے گھوڑے کو لگام دینا، حرام سے بچاؤ، جذبات کے طوفان کو تھامنا، قلب و روح کی طہارت کو یقینی بنانا، مساکین اور فقرا کی حاجت روائی کرنا اور ان جملہ اوصافِ حمیدہ سے خوشنودیٔ الٰہی اور تقویٰ کا حصول ہے جسے صاحبِ ایمان اپنی اولین ترجیح بنا لیتے ہیں؛ اسی لیے قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر کیے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔'' (البقرہ) گویا تقویٰ کا حصول ہی روزے کے فیوض و برکات کا مرکزی نکتہ ہے اور سب سے نمایاں ثمر بھی یہی ہے۔

فضائلِ رمضان پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بابا جی نے فرمایا ہمیں معلوم ہے کہ اس ماہِ مبارک میں ہی قرآن مجید کا نزول ہوا، روزے فرض ہوئے، شبِ قدر کی نعمت بھی اسی ماہِ مبارک میں رکھی گئی، فتحِ مکہ کا واقعہ اس مہینے میں پیش آیا، جنگِ بدر لڑی گئی، اس ماہ میں فطرانے کے علاوہ زکوٰۃ وصدقات کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مقدس مہینے کے تین عشروں کو مخصوص اور منفرد اہمیت دی گئی اور اس لحاظ سے رمضان کریم سے منسلک جملہ عبادات کے درجات اور فضائل بلند کر دیے گئے ہیں لہٰذا اس ماہِ مقدس کی آمد امتِ مسلمہ کے علاوہ پوری انسانیت کے لیے خیر وبرکت کا ذریعہ بھی ہے۔ اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں میں مسلم برادری میں صبر ورضا، تقویٰ، انسانی ہمدردی، غمگساری، ایثار وقربانی، راہِ خدا میں استقامت، جذبہ اتحاد، خیر خواہی، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے بے انتہا محبت اور ایمان کی قوت کو دوبالا کرنے کی سالانہ تربیت کا ایک ہمہ گیر نصاب بھی ہے جو اہلِ ایمان کو تقویٰ کا راستہ اختیار کرنے کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ ظاہر و باطن کو پاک کر کے اُمتِ واحدہ میں اتحاد، اتفاق اور یگانگت کے جذبات بھی اجاگر کرتا ہے اور انھیں پوری انسانیت کے لیے جذبہ خیر سگالی کی تعلیم دیتا نظر آتا ہے۔

بابا جی کی اس خصوصی نشست کی روح پرور فضا نے اسے نہ صرف ایمان افروز بلکہ استقبالِ رمضان کے لیے ایک مثال بھی بنا ڈالا۔ سحر انگیز علمی وفکری گفتگو، تند سوالات، علم و استدلال سے مزین جوابات، سادہ مگر پُر وقار کھانے کا اہتمام اور سامعین کی یکسوئی اور دلجمعی نے یہ شام یادوں میں امر کر دی۔ عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد جب تقریباً سب افراد روانہ ہو گئے تو مجھے اور جیدی میاں کو بابا جی کی الگ نشست سے استفادہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس گفتگو میں اس وقت رہی سہی تشنگی بھی جاتی رہی جب استقبالِ رمضان کے ضمن میں بابا جی نے لوگوں کو دو بڑے طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے وضاحت کر دی کہ پہلا طبقہ صاحبانِ ایمان پر مشتمل ہے جو اس ماہِ مبارک کا سال بھر بڑی بے چینی سے انتظار کرتا ہے اور اس مقدس مہینے کی ایک ایک گھڑی، اِک اک پل کو اپنی جان، مال، عزت، سلامتی، ظاہری و باطنی طہارت کے لیے حتی المقدور استعمال کرتا

ہے۔ اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ کی خوشنودی کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے یہ تقویٰ و پرہیز گاری کی ہر شکل، ہر پہلو پر محنت کرتا ہے، نماز کی بروقت ادائیگی سے لے کر نمازِ تراویح کی پابندی، روزے کے پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اہتمام کے ساتھ سحر وافطار کے جملہ آداب کی بجا آوری، صدقہ وخیرات، زکوٰۃ کی ادائیگی، انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے غربا، مساکین اور مقروض افراد کی حاجت روائی نیز حقوق اللہ اور حقوق العباد کے جملہ لوازمات اور عبادات کے تمام آداب بھر پور جوش وخروش سے انجام دیتا ہے، سب سے اہم بات یہ کہ ان کے اعمال میں تصنع، بناوٹ اور ریا کاری کی ہلکی سی رمق بھی دیکھنے کو نہیں ملتی... بابا جی ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ وہ لمحہ آن پہنچا جس کا مجھے انتظار تھا اور وہ جیدی میاں کے بے ساختہ پن پر مبنی چبھتے ہوئے سوالات تھے جو تلخ زمینی حقائق اور عملی زندگی کے بھیانک پہلوؤں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ موقع پاتے ہی جیدی میاں نے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی اور استقبالِ رمضان کی آڑ میں ہونے والی مختلف وارداتوں کی نشاندہی شروع کر دی۔ وہ کہنے لگا کہ دُنیا کی حرص وہوس، طمع، لالچ، مال وزر کی محبت اور جاہ وحشم کے حصار میں جکڑے ہمارے ہی بھائی رمضان کی آمد سے خوب مال بناتے ہیں، ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں، منافع خوری اور گراں فروشی کے ریکارڈ اپنے نام کرتے ہیں۔ اس مقدس مہینے کے آغاز سے چند روز قبل اشیائے خورونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں اور عام لوگ بنیادی اشیائے ضروریہ خریدنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ منافع خوری اور ملاوٹ سمیت ناجائز کمائی کے سب حربے آزمائے جاتے ہیں۔ کچھ افراد تصنع، بناوٹ اور ریا کاری کے لیے سماجی شخصیات، سیاسی قائدین، کاروباری عمائدین اور ہم پلہ احباب اور رشتہ داروں کے لیے پُرتکلف افطار پارٹیوں کا اہتمام کرتے ہیں جس میں روحانی بالیدگی کے بجائے دُنیاوی رکھ رکھاؤ کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ بابا جی یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے: جیدی میاں! تم ہمیشہ جلدی کر جاتے ہو، یہ سارے لوگ ہی دراصل اس دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں میں احبابِ شیطان کہتا ہوں کیونکہ انھوں نے آخرت کے بدلے دُنیا خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان سے کہیں بہتر انسان امریکا،

کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ میں وہ سٹور مالکان ہیں جو رمضان المبارک پر اشیائے خور ونوش کی قیمت آدھی کر دیتے ہیں۔ بابا جی یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھ کر ہمیں جانے کی اجازت بخشی...

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی، جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

□□□
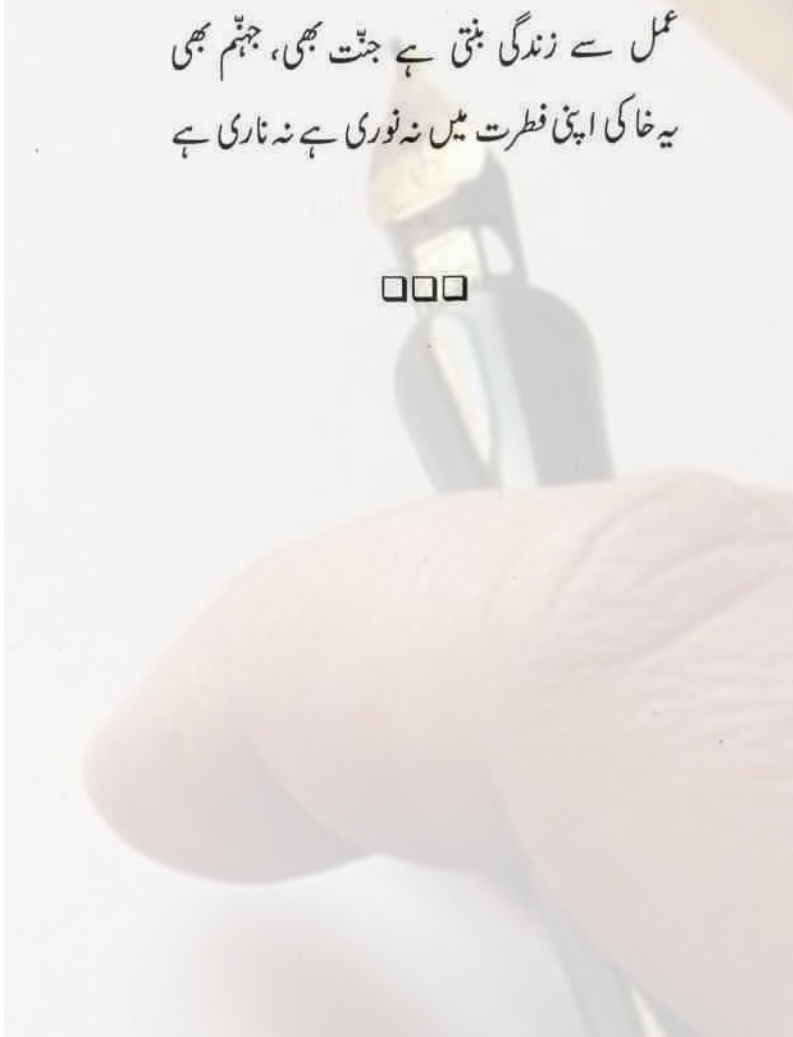
21جوڑے

اگر آج ارسطو حیات ہوتا تو 'المیہ' کی تعریف میں رد و بدل عین ممکن تھا۔ وہ اس دور میں مروجہ رسومات کو دیکھ کر المیہ کی تعریف کچھ یوں کرتا ''ایک انسان کا جذبات سے عاری ہو کر دوسرے انسان کے متعلق سوچنا المیہ ہے۔'' یا اس کے لفظ ہوتے ''معاشرتی المیہ انسانی خودغرضی سے جنم لیتا ہے۔'' اگر ہم معاشرے اور معاشرتی رسوم و رواج کا عمیق مشاہدہ کریں تو علم ہو گا کہ ہم نے بذاتِ خود معاشرے کو کچھ ایسی روایات میں جکڑ رکھا ہے جو ہمارے لیے وبال بن چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان سے انحراف کو تیار نہیں۔ جہیز بھی ایسی ہی ایک لعنت ہے جس نے معاشرے میں شادی جیسے بنیادی اور فطری عمل کو انتہائی پیچیدہ اور مشکل بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس رسم کو بقا دینے میں لڑکے کا خاندان، بالخصوص لڑکے کی ماں سرِفہرست ہے۔ لڑکے کی ماں مختلف گھروں میں جا کر اپنے بیٹے کا دام لگاتی ہے کہ کوئی ہے جو منہ مانگے جہیز، زمین اور بینک بیلنس کے بدلے اس کا بیٹا خرید لے اور پھر جہاں سب سے زیادہ جہیز ملنے کی امید ہو یا جس لڑکی کا تعلق دولت مند خاندان سے ہو، وہاں بات پکی کر دی جاتی ہے۔ لڑکے والے تو شادی کی تاریخ طے کر کے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے بعد لڑکی کے گھر والوں کی پریشانی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں کئی دردناک مناظر نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔ کچھ روز قبل مَیں فیملی کے ساتھ کپڑوں کی خریداری کے لیے ایک شاپنگ مال میں موجود تھا۔ ایک بچی، جس کی عمر بیس، بائیس سال ہوگی، اپنے والدین کے ہمراہ مال میں داخل ہوئی۔ میری نظر بچی کے ساتھ آنے والے بزرگ پر پڑی جن کے پیروں میں خستہ حال چپل ان کی زبوں حالی کا پتا دے رہی تھی۔ جس طرح ہمارے ہاں اکثر بزرگوں کو باآوازِ بلند بات کرنے کی عادت ہوتی ہے، اسی طرح وہ بزرگ مال میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز میں گفتگو کرنے لگے ''پتری ایتھے شیواں بہت مہنگیاں نیں، اسی پورے 21 جوڑے لینے نے اجے'' (بیٹا یہاں چیزیں بہت مہنگی ہیں۔ ابھی تو ہم نے اکیس جوڑے خریدنے ہیں۔) اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ہونہ ہو، یہ جہیز کی خریداری کے لیے آئے ہیں کیونکہ اکیس جوڑوں والی رسم ہمارے ہاں جہیز کے لیے مخصوص ہے۔ لڑکی کی ماں بضد تھی کہ ہم بیٹی کے لیے اسی مال سے خریداری کریں گے۔ اسی دوران بچی نے سامنے لگے کچھ جوڑوں کو غور سے دیکھا اور پھر منتخب شدہ جوڑے پر لگے پرائس ٹیگ کو غور سے دیکھ کر ایسے تاثرات دینے لگی جیسے اسے کچھ پسند نہیں آ رہا، کچھ دیر بعد وہ خاندان مجھے گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر بغیر کچھ خریدے شاپنگ مال سے باہر نکل گیا۔

ہم بچپن سے ایک جملہ لکھتے، پڑھتے، بولتے اور سنتے چلے آ رہے ہیں کہ جہیز ایک لعنت ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی ایک سوچ جنم لیتی ہے کہ ''بیٹی پرایا دھن ہے۔'' جیسے جیسے بیٹی کی عمر بڑھتی ہے، یہ سوچ بھی جوان ہوتی جاتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ اکثر خواتین جب خریداری کے لیے گھر سے نکلیں تو کچھ نہ کچھ ایسا ضرور خرید لاتی ہیں جو بیٹی کو جہیز میں دیا جا سکے۔ کبھی پتیلیوں کا سیٹ تو کبھی کوئی ڈنر سیٹ، کبھی کمبل، تو کبھی کام والا جوڑا۔

جہیز کے مروجہ اصول بھی عجیب و غریب ہیں۔ کم سے کم 21 جوڑوں کا ہونا لازم ہے اور کپڑوں سے میچنگ جوتے بھی لازمی قرار دیے جاتے ہیں۔ چھ کمبل، چھ رضائیاں، کم سے کم اور اگر ناک اونچی رکھنی ہے تو یہ تعداد اٹھارہ تک جا پہنچتی ہے۔ علاوہ ازیں گدے، کھیس، دریاں،

تکیے، بیڈ شیٹس اور نجانے کیا کیا۔ برتنوں کی تو ایک طویل فہرست ہے، پتھر کا سیٹ، شیشے کا سیٹ، چائنا بون کا سیٹ، مختلف طرح کے مگ، ٹی سیٹ، گلاس سیٹ، پھر الیکٹرانکس اشیا، جن میں فریج، اوون، واشنگ مشین، اے سی اور LED سے لے کر سوئچ بورڈ اور کیبل تک تمام چیزیں جہیز میں دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بات کریں فرنیچر کی تو اس کی تفصیل کے لیے جگہ کم پڑ جائے گی۔ شادی بیاہ کے موقع پر لڑکے والوں کے پروٹوکولز الگ ہی ہوتے ہیں۔ لڑکے کے گھر والوں کے لیے بہترین جوڑے اور ساس کے لیے سونے کی انگوٹھی یا جھمکے نہ ہوں تو شروع کے چار دن جو دلہن کے ناز نخرے اٹھائے جاتے ہیں، سسرال والے وہ بھی نہیں اٹھاتے اور ہر دوسری بات کے ساتھ بیچاری لڑکی کو طعنے دے کر بے حال کر دیا جاتا ہے۔ وہی ساس، جو بہو کو کم جہیز لانے پر طعنوں مارتی ہے، جب اپنی بیٹی کی شادی کی باری آئے تو اس کے سسرال کی طرف سے ایسے سلوک پر احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ یہ ہمارا مجموعی رویہ ہے کہ ہمیں صرف اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی نظر آتی ہے، ظلم صرف وہ ہے جو ہم پر کیا جائے جبکہ دوسروں کے ساتھ جو سلوک ہم کرتے ہیں، انھیں رسم و رواج کا نام دے کر ہم بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی پر سسرال کی طرف سے زیادہ پابندیاں نہ ہوں، اسے میکے آنے جانے کی مکمل آزادی ہو اور سسرال کی طرف سے اس کے معاملات میں دخل اندازی بالکل نہ ہو مگر وہی ماں اپنی بہو کے لیے ایک بالکل مختلف سوچ رکھتی ہے۔ بہو کا فرض ہے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات کے لیے ساس سے مشورہ کرے۔ ساس کا ہر حکم فرض سمجھ کے بجا لائے حتیٰ کہ پہننے، اوڑھنے کے لیے بھی ساس سے مشاورت لازمی کرے۔ یہی حال بہو کی طرف سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ لڑکی چاہتی ہے کہ جب وہ میکے سے سسرال جائے تو بھابھیاں اسے مکمل پروٹوکول دے کر اس کے آگے پیچھے پھریں، اس کے بچوں کے ناز نخرے اٹھائے جائیں اور میکے والے اس کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں مگر وہی لڑکی سسرال میں خاوند کی بہنوں کو دردِ سر سمجھتی ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ نندوں کی آمد پر سر منہ لپیٹ کر سو رہے۔ اگر اس کے بچے میکے جا کر اُدھم مچائیں تو وہ امید رکھتی ہے کہ بھابھی اف تک نہ کہے

بلکہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ کھیلنے دیجیے، بچے ہی تو ہیں۔لیکن جب معاملہ نند کے بچوں کا ہوتو ماں کوفون کر کے بتایا جارہا ہوتا ہے کہ ''نند کے فلاں بچے نے میرے جہیز کی فلاں شے خراب کی تو میں نے بھی اس کے رخسار پر انگلیاں چھاپ دیں۔'' یہ وہ رویے ہیں جو ہم نے خود تشکیل دے کر اپنے لیے زندگی کو مشکل بنالیا ہے۔عجب دور ہے کہ محض شادی کی تیاری کے لیے تین، تین سال کا وقت لیا جاتا ہے۔لڑکی کے والدین کے یہ تین سال کس اذیت میں گزرتے ہیں، کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔لڑکی کی ماں کمیٹیاں ڈال کر فرنیچر اور برتن خریدتی ہے جبکہ بھائی اور باپ سسرالی فرمائشیں اور باراتیوں کے کھانے پینے کے بندوبست میں قرض اٹھاتے ہیں۔اس کے بعد لڑکے والے سینکڑوں باراتیوں سمیت لڑکی کی رخصتی کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔اگر بیٹی کو لاکھوں کا جہیز دے دیا جائے، سسرال والوں کے تقاضوں کے مطابق ان کی خواہشات کا مکمل خیال رکھا جائے تو بھی فرمائشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔رخصتی کے ایک روز بعد اگر بیٹی کے سسرال عالیشان ناشتہ نہ پہنچایا جائے تو بھی بیٹی کو طعنے ملتے ہیں کہ تمھارے گھر والوں نے تمھارا بوجھ سر سے ایسے اتارکہ اب تمھیں پوچھا تک نہیں۔سسرال میں شوہر کے دور کے رشتے داروں میں بھی خوشی غمی کے موقع پر لڑکی والے نہ پہنچ سکیں تو لڑکی کا جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے۔

اگر بدقسمتی سے لڑکی کے دیور کی شادی زیادہ بڑے خاندان میں ہوجائے تو بھی پرانی بہو کو احساسِ محرومی کا شکار کر دیا جاتا اور وہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو کر اپنی جان کو روگ لگا بیٹھتی ہے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ لڑکی اور لڑکا اللہ کی دین ہے اور اللہ کے کاموں پر کسی کا زور نہیں چلتا، بیٹی کی پیدائش پر بہو کو اشاروں ہی اشاروں میں باور کرایا جاتا ہے کہ اگر اگلی بار بیٹا پیدا نہ ہوا تو تمھارے شوہر کی دوسری شادی کرادی جائے گی۔لڑکی جہیز میں لائے اکیس جوڑوں کے ساتھ اپنی زندگی کے اگلے اکیس سال حالات سے لڑتے، طعنے سنتے اور مختلف مسائل میں مبتلا ہو کر گزار دیتی ہے۔ان اکیس سالوں میں وہ چار یا پانچ بچوں کی ماں بھی بن چکی ہوتی ہے۔اس عرصے میں ساس کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور طاقت اسے منتقل ہو جاتی ہے۔طاقت کا مرکز تو بدل جاتا ہے مگر سوچ

نہیں بدلتی۔ پھر یہی بہو جب اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کرتی ہے تو کسی نہ کسی گھر کو اکیس جوڑوں اور بے شمار جہیز کی پریشانی میں مبتلا کر کے لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے ملنے والی سونے کی انگوٹھی کے متعلق سوچنے لگتی ہے۔
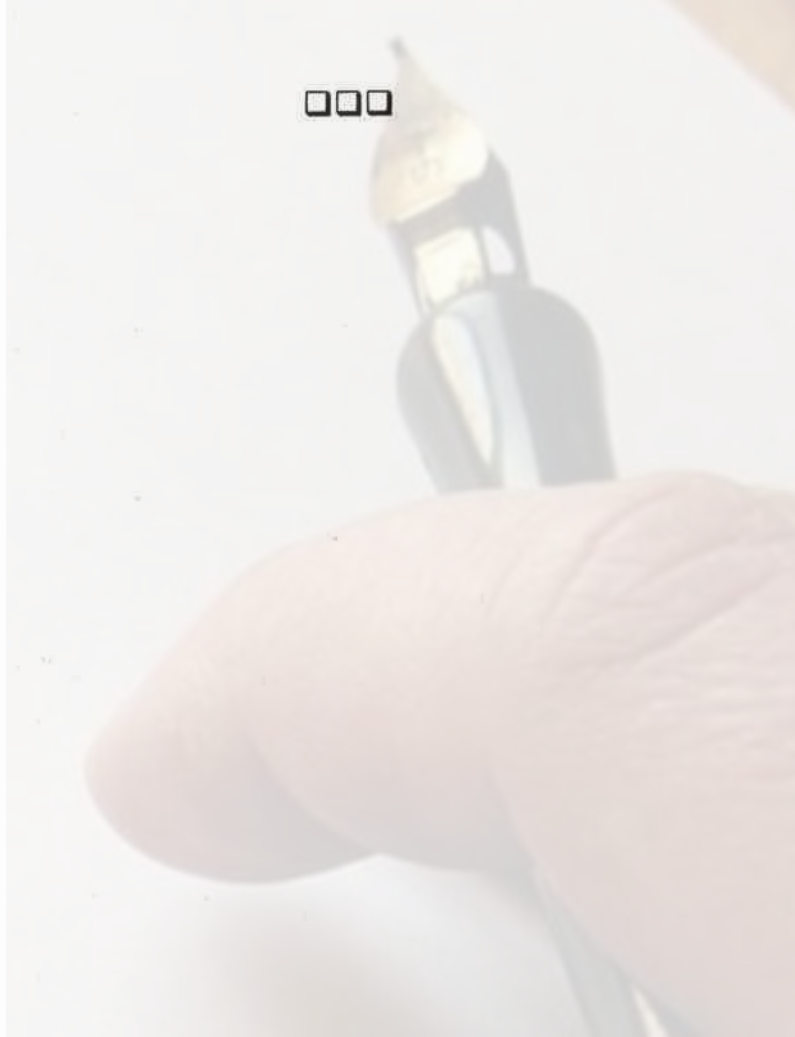
لِٹل ایکسٹرا

کامیاب لوگوں اور ان کی کامرانیوں کا عمیق جائزہ لے کر تحقیق کرنے والوں کی اکثریت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تاریخِ انسانی میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں نے ہمیشہ اپنے لیے مشکل راستوں کا انتخاب کیا، دوسروں سے ہٹ کر سوچا، جب کچھ مختلف کر گزرنے کی ٹھان لی تو زندگی نے اُن کے مصمم ارادوں اور عظیم مقاصد کی تکمیل کی راہوں سے کانٹے ہٹا کر انھیں گل و لالہ سے آراستہ کر کے کامیابی کی شاہراہوں میں بدل دیا۔ ان عہد ساز شخصیات پر ہونے والی تحقیق نے ثابت کیا کہ ہمیشہ وہ مختلف کرنے کی جستجو میں مصروف رہے اور منفرد طرزِ فکر اپنا کر بڑی کامیابی کی طلب میں جہدِ مسلسل سے آگے بڑھتے رہے۔ وہ گرے تو پھر اٹھ کر، سنبھل کر انھی راستوں پر چل دیئے اور اپنی نظریں اسی منزلِ مراد پر جمائے رکھیں جہاں افق کے پار، ستاروں سے آگے اِک نئے جہان کی تلاش میں انھوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اُن سب قابلِ تحسین ہستیوں کی قدرِ مشترک تھی۔ دوسروں سے ذرا مختلف سوچنا اور تھوڑا سا زیادہ کرنا۔ اے لِٹل ایکسٹرا! اگر آپ نے کبھی گھوڑوں کی دوڑ یا ڈربی ریس کو قریب سے دیکھا ہو تو فِنش لائن عبور کرتے ہوئے آخری لمحات میں لگ بھگ دس گھوڑے اور اُن کے سوار بظاہر ایک ہی لمحے میں لائن پر پہنچتے نظر آتے ہیں مگر

کامیابی سے ہمکنار ہونے والا خوش نصیب گھوڑا دوسروں سے تھوڑی سی زیادہ محنت اور قوت کو بروئے کار لا کر کامیابی کا سہرا اپنے ماتھے پر سجا لیتا ہے۔ یہی جذبہ زندگی کے ہر میدان میں ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور اس حکمتِ عملی سے آپ بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ بھی یہ ٹھان لیں کہ آپ نے عام لوگوں کی روش سے ہٹ کر ذرا سا زیادہ کرنا ہے تو یقیناً آپ بھی میدانِ عمل میں کامرانیاں سمیٹ کر کچھ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس پر دوسرے محض رشک ہی کر سکتے ہیں۔

میں اسے اپنی خوش بختی ہی کہوں گا کہ بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں میرے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ میں ان سے سبق سیکھ کر اپنی ذاتی زندگی اور کارِ سرکار کی انجام دہی میں رہنمائی حاصل کرتا ہوں۔ ہمیشہ اپنے اردگرد پر نظر دوڑاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ بہتری کی گنجائش کہاں ہے، وہ کیا ہے جو آج تک نہیں کیا گیا۔ وہ کیا ہے جو میں کر سکتا ہوں یا مجھے کرنا چاہیے۔ گزشتہ دسمبر میں مجھے ایف بی آر میں کمشنر سرگودھا تعینات کیا گیا تو جاتے ہی میں نے اپنے لیے مشکل ٹارگٹ چن لیے۔ میں نے اپنے دفتر کے دروازے ٹیکس گزاران، عام سائلین، تاجر برادری، وکلا اور شعبۂ صحافت سے وابستہ دوستوں کے لیے کھول دیئے، اپنی ٹیم میں شامل افسران اور رفقائے کار کی مشاورت سے ان کے لیے اہداف مقرر کیے اور پھر ان کی مکمل رہنمائی کر کے اُن اہداف کا حصول ممکن بنانا شروع کر دیا۔ میں نے یہ طے کر لیا کہ ایف بی آر اور عوام کے مابین بدگمانی کا خاتمہ کرنا ہے، بڑھتے ہوئے فاصلے کم کرنے ہیں اور باہمی اعتماد کی فضا کو بحال کرنا ہے تاکہ وہ اپنی آمدن اور مالی حیثیت کے مطابق ٹیکس ادا کریں جس سے شاید وہ پہلو تہی کرتے آئے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے سرگودھا، خوشاب، میانوالی اور بھکر کے چار اضلاع پر مشتمل اپنے زون میں ٹیکس گزاروں کا اعتماد جیتنے کے لیے میں نے ہر ضلع میں ہفتہ وار جامع مساجد میں کھلی کچہری منعقد کرنے کا اعلان کیا اور پھر باری باری ان اضلاع میں جمعہ کی نماز کے وقت امام مسجد اور خطیب کی اجازت سے نمازیوں کو ٹیکس کی اہمیت اور قومی معیشت کی مضبوطی میں ٹیکسز کی کلیدی

حیثیت کو اجاگر کرنا شروع کیا، لوگ خوشگوار حیرت سے میری باتوں کو توجہ سے سننا شروع ہو گئے۔ میں نے منبرِ رسول پر کھڑے ہو کر قومی ذمہ داری کی انجام دہی میں اپنے حصے کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے میری گزارشات کو توجہ سے سنا۔ اس کے ساتھ ہی چاروں اضلاع میں موجود افسران اور ان کی ٹیموں کو کاروباری علاقوں کا مکمل سروے کرنے کا ایک مربوط نظام وضع کر کے دیا تا کہ ان افراد کو ٹیکس کے دائرہ کار میں لایا جا سکے جو اپنے کاروبار میں دن دُگنی، رات چوگنی ترقی تو کر رہے تھے مگر وطنِ عزیز کے خزانے میں اپنا حصہ ڈالنے سے گریزاں تھے۔ ہم نے صرف پانچ ماہ کی قلیل مدت میں تقریباً 20 ہزار نئے ٹیکس گزاران کا اضافہ کیا۔ اعتماد کا تعلق بڑھا تو جون میں گزشتہ سال کے مقابلے میں تین گنا زیادہ انکم ٹیکس اور دو گنا سیلز ٹیکس اکٹھا کیا گیا اور پورے زون میں بد دیانتی، دھونس یا بدزبانی کی ایک بھی شکایت نہیں ملی۔

نئے مالی سال کا آغاز ہوا تو میں نے اپنے ٹیم میں شامل افسران کو ان کی شاندار کارکردگی پر ایک سادہ مگر پُروقار تقریب میں انعامی سندِ امتیاز کے ساتھ ساتھ شاباش دی اور اگلے اہداف پر مکمل طور پر بریف کیا۔ ہمارا سب سے نمایاں ہدف تھا سالانہ گوشواروں کے حصول میں چلائی جانے والی بھرپور مہم۔ ضلع کی معروف سیاسی، سماجی اور کاروباری شخصیات کے مختصر وڈیو میسج کے ذریعے عوام تک اپنا پیغام مؤثر انداز میں لے جانے کی حکمتِ عملی اپنائی تو پتا چلا کہ پاکستانی قوم کے ہیرو اور مایہ ناز بلے باز محمد حفیظ کی شادی سرگودھا کے ایک معروف گھرانے میں ہوئی ہے۔ فوراً محمد حفیظ سے رابطہ کیا جنھوں نے ویسٹ انڈیز سے ہی ایک خوبصورت آگاہی پیغام ریکارڈ کر کے ہمیں بھیج دیا جس میں اہلِ وطن سے اپنا سالانہ انکم ٹیکس گوشوارہ جمع کرانے کی اپیل شامل تھی۔ یہ ادارے کی تاریخ میں کسی بھی قومی ہیرو کی طرف سے دیا جانے والا پہلا پیغام تھا جو دِنوں میں ہی وائرل ہو گیا۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں مجھے اسلام آباد میں ڈائریکٹر میڈیا تعینات کیا گیا تو میں نے بلا تاخیر اور بلا تامل پہلے ہی دن چیئرمین ایف بی آر ڈاکٹر محمد اشفاق سے قومی ہیروز کے پیغامات پر مبنی آگاہی مہم چلانے کی اجازت منظور کرا لی۔ سیلولر کمپنیوں کے ذریعے ملک بھر کے موبائل

صارفین کو انکم ٹیکس گوشوارے داخل کرانے کا میسج بھجوانے کے احکامات کی بھی منظوری لی گئی۔ علاوہ ازیں ملک کے تقریباً سبھی ٹی وی چینلز اور قومی اخبارات پر ایک بھرپور آگاہی مہم کا آغاز بھی کر دیا گیا مگر جس طرح ہمارے قومی ہیروز نے اس آگاہی مہم کو چار چاند لگائے اور ہمارا پیغام عام آدمی تک پہنچانے میں ہماری بے لوث خدمت کی، اس پر وہ سب دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔ ایک طرف شان شاہد، مہوش حیات، عائشہ عمر اور احسن خان جیسے فلمی ستارے شامل ہوئے تو دوسری جانب پاکستانی کرکٹ ٹیم کے تقریباً تمام موجودہ کھلاڑی اور سابقہ آل راؤنڈر وسیم اکرم، عبد الرزاق، راشد لطیف اور سرفراز احمد نے بھی اس مہم میں حصہ لیا، پھر اپنے سہیل احمد عزیزی جیسی ہر دلعزیز شخصیات ہیں تو ڈاکٹر محمد امجد ثاقب اور انصار برنی جیسے سماجی رہنما بھی ہیں، عہد ساز جہانگیر خان ہیں تو انور مقصود اور بشریٰ انصاری کے پیغامات نے بھی سوشل میڈیا پر دھوم مچا رکھی ہے۔ سب سے منفرد پیغام پاکستان کے ممتاز عالمِ دین اور کروڑوں پاکستانیوں کے پسندیدہ مولانا طارق جمیل نے بھی ریکارڈ کرایا اور محض دس دنوں میں ملک کے طول و عرض میں ایف بی آر اور سالانہ گوشواروں کی آواز گونجنا شروع ہو گئی۔ جگہ کی قلت کے باعث میں کئی قد آور شخصیات کا نام نہیں لکھ پا رہا مگر ان سب کی خدمات ٹیکس مہم کو کامیاب بنانے میں اپنی جگہ اہم ہیں۔ یہ بلا شبہ ایف بی آر کی تاریخ میں سالانہ انکم ٹیکس گوشواروں کے بارے میں چلائی جانے والی سب سے ہمہ گیر، مقبول ترین اور مضبوط و مربوط مہم بن گئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی ذرا مختلف سوچنے اور تھوڑا سا زیادہ کرنے سے اتنا زیادہ فرق پڑ جاتا ہے کہ وہ ہمارے فہم و ادراک کی سبھی حدیں پار کر جاتا ہے۔ اے لٹل ایکسٹرا دراصل زمانے سے ہٹ کر چلنے اور کچھ منفرد کرنے کا ایک خوبصورت نظریہ ہے جسے اپنا کر آپ بھی وہ کچھ کر گزریں جو آج تک نہیں ہوا۔

❑❑❑

تیرہ کا درجن

تین دوست حصولِ علم کے لیے گاؤں سے شہر روانہ ہوئے، تینوں نے اس سلسلے میں ایک ہی شہر کا انتخاب کیا اور خوب دل لگا کر علم حاصل کرنے لگے۔ جب وہ اپنے اپنے شعبے میں مہارت حاصل کر چکے تو واپسی کا قصد کیا۔ گاؤں کے راستے میں ایک دریا آتا تھا، جسے عبور کرنے کے لیے وہ کشتی میں سوار ہو گئے۔ اپنے اپنے شعبے پر مہارت اور علم نے ان کے اندر تکبر پیدا کر دیا تھا اور وہ احساسِ برتری کے نشے میں جھومتے، گاتے منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کی نظر سادہ لوح ملاح پر پڑی تو ایک نوجوان، جو فلسفہ پر گرفت رکھتا تھا، حقارت سے ملاح سے استفسار کرنے لگا ''بتاؤ کشتی پانی میں کیسے تیرتی ہے اور اس کی کیا منطق ہے؟'' ملاح نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر یہ سوال پوچھنے والا متکبرانہ لہجے میں گویا ہوا، ''اگر تم زندگی بھر علمِ فلسفہ نہیں سیکھ سکے تو تم نے عمر ضائع کر دی ہے۔'' کچھ دیر بعد دوسرے دوست نے سوچا کہ کیوں نا وہ ملاح سے اپنے مضمون کے متعلق سوال کر کے اپنی علمی برتری ظاہر کرے۔ یہ شخص علمِ فلکیات پر مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ملاح سے پوچھا ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ چاند گرہن کب لگتا ہے؟'' ملاح نے ایک بار پھر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے سر جھکا لیا اور دل ہی دل میں مسافروں کی علمیت کا قائل ہو گیا، اس نوجوان نے کہا،

''تم نے اپنی پوری زندگی بیکار گزار دی اور علم فلکیات تک نہ سیکھ سکے۔'' اب تیسرے نوجوان نے سوچا کہ کیوں نا وہ بھی کوئی ایسا سوال پوچھے جس سے ملاح چاروں شانے چت ہو جائے۔ یہ فارسی زبان کا ماہر تھا، اس نے ملاح سے کہا ''فارسی کے مشہور شاعر رودکی کو تو سن رکھا ہو گا تم نے؟'' ملاح کو اپنی کم علمی پر تاسف ہوا کہ وہ ایک مشہور شاعر کے متعلق بھی نہیں جانتا۔ اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا، ''نہیں جناب! میں نے نہیں سنا۔'' اس سے پہلے کہ اس تیسرے شخص کے چہرے پر تکبر کے آثار نمودار ہوتے، کشتی دریا کے بیچ منجدھار میں پھنس کر اپنا توازن کھونے لگی۔ ملاح اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرنے کے باوجود کشتی کو نہ سنبھال سکا تو چیختے ہوئے اس نے پوچھا، ''کیا تم تینوں کو تیرنا آتا ہے؟'' تینوں نے نفی میں سر ہلا دیا، اس پر ملاح یہ کہتے ہوئے دریا میں کود گیا کہ ''افسوس تم تینوں نے اپنی زندگیاں ضائع کر دیں، اب موت کو مرحبا کہو اور اپنے علمی تکبر کا تعفن زدہ کفن لپیٹ کر احساسِ برتری کے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاؤ۔''

کچھ لوگوں میں احساسِ برتری حد سے تجاوز کر جاتا ہے، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایسے لوگ جب تک سامنے والے کو اس کی کم علمی کا مکمل یقین نہ دلا لیں اور اپنی علمی برتری ثابت نہ کر دیں، تب تک ان کی تشفی ممکن نہیں ہوتی۔ یہ تکبر کا ایک پہلو ہے، تکبر جس رنگ میں بھی ہو، انسانی روح کو بے رنگ کر کے چھوڑتا ہے۔ چاہے یہ تکبر نرگسیت کے بانی نارسیس کے دماغ میں جا گھسے اور اسے خود پسندی کا ایسا تحفہ بخش دے کہ وہ پانی میں اپنا عکس تکتے تکتے فنا ہو جائے یا پھر فرعون کے ماتھے کی رگوں پر پھڑ پھڑائے اور اسے خود کو طاقتور کہنے پر مجبور کر دے، دونوں صورتوں میں زہرِ قاتل ہے، اس کا انجام سوائے ذلت کے اور کچھ نہیں۔ ابلیس کے دماغ میں تکبر کا یہ کیڑا گھسا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دھتکار دیا گیا۔ ایک بار ایک متکبر شخص نے مولانا رومؒ سے نصیحت چاہی تو مرشدِ اقبال مولانا نے اُسے عجیب نصیحت کی، ''تھوڑی دیر کے لیے قبرستان جا اور خاموشی سے بیٹھ کر ان بولنے والوں (متکبروں) کی خاموشی کو دیکھ!''

ہم اپنے سروں کو فلک پر پھینک کر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کئی سو میٹر اونچی بلند عمارتیں تعمیر

کر بھی لیں تو ان کی بنیاد زمین پر ہی رکھی جائے گی اور اگر یہ بنیاد کمزور ہو جائے تو عمارت کو زمیں بوس ہونے میں فقط چند ہی لمحے لگیں گے۔ دوسری طرف عاجزی کا مقام یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق جب خاتم النّبیین نبی کریم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے استفسار کیا کہ میرے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: عاجزی۔

تکبر وہ راستہ ہے جس کی رہنمائی کے لیے جگہ جگہ ابلیس، فرعون اور نارسیس جیسے کردار موجود ہیں۔ جس طرح پیڑ کو دیمک لگ جائے تو وہ آہستہ آہستہ کھوکھلا ہونے لگتا ہے اور پھر ایک دن زمیں بوس ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح تکبر انسان کی صلاحیتوں، روحانی بصیرت، باطنی بصارت اور دل کے نور کو آہستہ آہستہ کھوکھلا اور مدھم کر دیتا ہے۔ یہ انسان کو احساسِ برتری میں مبتلا کر کے ایک کمتر درجے کے انسان میں بدل دیتا ہے۔ تکبر کی آگ انسان کے مٹی سے تخلیق شدہ جسم کو ہمیشہ کے لیے آگ کا لباس پہنا کر اُسے شیطانی قافلے کا مسافر بنا دیتی ہے اور وہ تفاخر اور غرور کے مرض میں بری طرح مبتلا ہو کر دوستوں، رشتہ داروں، رفقائے کار اور عام انسانوں سے کٹ جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ رسوائیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور پھر ذلت بھری زندگی اس کا معمول بن جاتی ہے۔ دولت، حُسن، جوانی، کامیابی، شہرت، اولاد، مال و زر کی فراوانی، علم و فضل، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت بھی تکبر کی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس عالمِ آب و گِل میں تکبر کا آغاز ابلیس سے ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے ظالموں میں سے ہو گیا۔ کبریائی محض اللہ کریم ہی کے شایانِ شان ہے اور اسی کا زیور ہے جبکہ عجز و انکساری، حلم و نرم خوئی اور اللہ کی مخلوق سے پیار و محبت انسانی کردار اور اخلاقی اقدار کی اعلیٰ ترین شکلیں ہیں۔ عجز اللہ تعالیٰ کو بے پناہ پسند ہے اور وہ ہمیشہ جھکنے والوں کو رفعتیں عطا کرتا ہے۔

میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ سفیدے، سنبل، چیڑ، دیودار کے درخت بہت لمبے نظر آتے ہیں مگر اُن پہ پھول لگتے ہیں نہ پھل، نہ ہی کبھی ایسے درختوں کے سائے میں لوگوں کو بیٹھتے دیکھا ہے۔ اس کے برعکس پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ ہمیشہ تقدیسِ نعمت میں جھکے ہوئے زمین کے

قریب تر نظر آتے ہیں۔ جھکی ہوئی ٹہنیاں عاجزی کا استعارہ بن کر سبق سکھاتی ہیں کہ ہمیں تکبر کے منہ زور گھوڑے کو عاجزی کے چابک مار کر اپنے قابو میں رکھ کر دین و دُنیا میں اپنی فلاح کو یقینی بنانا ہے وگرنہ انا پرستی کے حصار کا شکار ہو کر متکبر انسان کے نصیب میں دونوں جہاں کی شکست لکھ دی جاتی ہے۔ اس دُنیا میں ذلت و رسوائی اور خدا اور اس کی مخلوق کی دھتکار کے مارے یہ بدنصیب اگلے جہان کو بھی گنوا بیٹھتے ہیں اور یوں دونوں جہان ہارنے والے یہ گھمنڈی لوگ ہمارے لیے نشانِ عبرت بنا دیئے جاتے ہیں۔

واصف علی واصف نے عاجزی و انکساری کے پیکر صاحبِ کرم لوگوں کی خصوصیات خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہیں، فرماتے ہیں ''میں نے جب بھی کوئی ایسا شخص دیکھا جس پر رب کا کرم تھا تو اسے عاجز پایا۔ پوری عقل کے باوجود بس سیدھا سادہ سا بندہ، بہت تیزی نہیں دکھائے گا، الجھائے گا نہیں، راستہ دے دے گا۔ بہت زیادہ غصہ نہیں کرے گا، آسان بات کرے گا۔ میں نے ہر صاحبِ کرم شخص کو مخلص دیکھا، اخلاص سے بھرا ہوا، غلطی کو مان لیتا ہے، معذرت کر لیتا ہے، ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جس پر بھی کرم ہوا ہے میں نے اسے دوسروں کے لیے فائدہ مند دیکھا اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کی ذات سے کسی کو نفع ہو رہا ہو اور اللہ آپ کے لیے کشادگی کا راستہ روک دے، وہ اور زیادہ کرم کرے گا۔ میں نے ہر صاحبِ کرم کو احسان کرتے دیکھا ہے، حق سے زیادہ دیتا ہے اور اُس کا درجن تیرہ کا ہوتا ہے، بارہ کا نہیں۔ اللہ کے کرم کے پہیے کو چلانے کے لیے آپ بھی درجن تیرہ کا کرو اور اپنی زندگی میں اپنے حصے سے زیادہ احسان کر دیا کرو۔ نہیں تو کیا ہوگا... حساب پہ چلو گے تو حساب ہی چلے گا۔''

□□□

نان فائلرز ہوشیار!

وطنِ عزیز کو ربِ کریم نے بے پناہ معدنی، قدرتی اور انسانی وسائل سے نواز رکھا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے قدرتی حُسن سے مالا مال دلآویز مناظر ہوں یا آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑی چوٹیاں، برف کی چادر اوڑھے ہوئے پہاڑ ہوں یا دل موہ لینے والے جھرنوں اور آبشاروں کی سرسراہٹ، میدانی علاقوں کے سرسبز و شاداب کھیت کھلیانوں سے مہکتے ہوئی سرزمین ہو یا اپنی پھلتی پھولتی فصلوں کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوتے محنت کش کسان، نہری نظام کے وسیع و عریض سلسلے اور ان کے نتیجے میں سیراب ہونے والے لاکھوں ایکڑ پر مبنی ہمارا شعبۂ زراعت ہو یا کپڑے کی صنعت، چمڑے، آلاتِ جراحی اور کھیل کود سے منسلک دیگر صنعتوں کے اَن گنت مراکز، روہی تھل کے ریتلے ٹیلے ہوں یا جنوب میں پھیلے رومانوی داستانوں کو جنم دینے والے صحرا، ہمارا ملک دُنیا کی ہر نعمت سے نہ صرف مالا مال ہے بلکہ یہ پیارا وطن اس جہاں میں ہم سب کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص انعام سے کم نہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ان تمام تر انعاماتِ خداوندی اور بے شمار وسائل کی موجودگی کے باوجود پاکستانی معیشت کی کشتی ہمیشہ اندرونی و بیرونی قرضوں کے جان لیوا منجدھار میں گھری رہتی ہے اور بے یقینی اور عدمِ استحکام کی تلاطم خیز موجیں اسے ہر دم اپنے خوفناک حصار میں جکڑے رکھتی

ہیں۔ اس کے برعکس اقوامِ عالم میں کئی ممالک کم قدرتی وسائل رکھنے کے باوجود ترقی اور خوشحالی کی دوڑ میں ہم سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔

اس پریشان کن صورتِ حال کی چند بڑی وجوہات میں سے ایک ہماری ٹیکس ٹو جی ڈی پی کی شرح میں کمی یا آسان الفاظ میں قومی آمدن کا محدود ہونا اور اس میں خاطر خواہ اضافے کا فقدان ہے۔ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح 44 سے 45 فیصد ہے اور گزشتہ چند سالوں میں فرانس اور ڈنمارک اوّل پوزیشن کے حصول میں ایک دوسرے کے مدمقابل نظر آتے ہیں۔ برطانیہ میں ٹیکس بلحاظ ملکی مجموعی پیداوار 33 فیصد ہے جبکہ افریقہ جیسے براعظم میں بھی یہ شرح 25 فیصد سے تجاوز کرتی نظر آتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہمارے ہمسایہ ممالک بھی اس لحاظ سے ہم سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے اگلی صف میں نیپال موجود ہے جہاں یہ شرح 19.4 فیصد ہے، اس کے بعد بھوٹان ہے جو 16 فیصد سے زائد شرح کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے جبکہ بھارت اور سری لنکا میں یہ شرح 12 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ ہم 10.5 فیصد کے ساتھ پانچویں نمبر پر ہیں اور ہمارے بعد صرف بنگلہ دیش اور افغانستان ہیں جہاں یہ شرح 9 فیصد ہے۔ یہ بحیثیت قوم ہمارے لیے انتہائی تشویش ناک صورتِ حال ہے کیونکہ اس شرح کے ساتھ ہم اپنی معیشت کو خود انحصاری، خودمختاری اور خوشحالی کی طرف جاتا نہیں دیکھ سکتے۔

یہاں پر سب سے اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج بھی ہم بحیثیت قوم بے یقینی اور اضطراب کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ قرضوں کا بوجھ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے، مہنگائی میں ہوشربا اضافے نے عام آدمی کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے، غریب ہر نئے دن کے ساتھ مزید غریب ہوتا جا رہا ہے اور لاکھوں افراد ہر سال خطِ غربت سے نیچے گر کر بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ حکومت نے بے گھروں کے لیے پناہ گاہیں اور بھوک و افلاس کے مارے ہوئے بدنصیب افراد کے لیے لنگر خانے تو کھول دیئے مگر اس اندوہناک کہانی کے پیچھے کارفرما عناصر اور اسباب کا کھوج لگانا بھی نہایت ضروری ہے کہ آخر

ہم یہاں تک کیسے پہنچے؟ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کورونا وبا کے باوجود ملک میں کاروں، موٹرسائیکلوں اور ٹریکٹروں کی خرید و فروخت میں ریکارڈ اضافہ ہوا، تعمیراتی شعبے کو ملنے والے مراعاتی پیکیج اور ٹیکسوں کی چھوٹ کے سبب ملک میں سیمنٹ، سٹیل اور اس شعبے سے وابستہ لگ بھگ تین درجن صنعتوں میں تیزی دیکھنے کو ملی مگر عام آدمی کے حالات میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ یہاں پر تھوڑی دیر رک کر سوچیں تو اس گتھی کو سلجھانا آسان ہو جاتا ہے۔ ملک میں موجود اشرافیہ ملکی وسائل اور ٹیکس کے نظام کو یرغمال بنا کر اپنے مال و دولت اور آمدن کے مقابلے میں یا تو سرے سے ٹیکس ادا نہیں کرتی یا پھر اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق بہت کم ٹیکس دیتی ہے۔ دولت کی اس غیر مساوی تقسیم اور وسائل پر محض چند فیصد مخصوص طبقے کی اجارہ داری کے خاتمے اور پاکستان کو قرضوں کے پہاڑ کے نیچے سے نکالنے کا واحد راستہ ملک میں رائج ٹیکس نظام کو شفاف، منصفانہ اور غیر جانبدار بنانا ہے۔ ہر شخص اپنی آمدن، وسائل اور اثاثہ جات کے تناسب سے قومی خزانے میں حصہ ڈال کر اپنی قومی ذمہ داری سے عہد برآ ہو کر اسے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکتا ہے۔ قومی محصولات سے جمع ہونے والی رقم نچلے طبقے پر خرچ کر کے اور بنیادی سہولتیں فراہم کر کے اسے اوپر اٹھایا جا سکتا ہے مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ بائیس کروڑ کی آبادی کے ہمارے ملک میں محض تیس لاکھ افراد اپنا سالانہ انکم ٹیکس کا گوشوارہ جمع کراتے ہیں۔ اس میں گیارہ لاکھ ایسے فائلرز ہیں جو اپنی آمدن قابلِ ٹیکس نہ دکھا کر ٹیکس ادا نہیں کرتے، 9 لاکھ وہ ہیں جو 5 ہزار یا اس سے بھی کم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور باقی ماندہ 10 لاکھ افراد میں بیشتر تنخواہ دار ہیں جن کا ٹیکس، ادائیگی کے وقت ہی کاٹ لیا جاتا ہے لہٰذا رضا کارانہ طور پر اپنی آمدن اور وسائل کے مطابق پورا اور بروقت ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد انتہائی محدود ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ریٹیل سیکٹر کا کاروباری حجم اٹھارہ سے بیس ٹریلین ہے مگر اس میں صرف تین ٹریلین کے لگ بھگ ٹیکس نیٹ میں ہے اور اس کی بڑی وجہ ہماری معیشت کا غیر رسمی اندازِ کاروبار اور کیش کا لین دین ہے۔ یہ صورتِ حال مزید برداشت نہیں کی جا سکتی۔

خوش آئند امر یہ ہے کہ اب ملکی قیادت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ٹیکس کی وصولی اور اس کے لیے ایک شفاف نظام کا قیام لازم وملزوم ہیں، لہٰذا یہی وجہ ہے کہ گزشتہ مالی سال میں ایف بی آر نے ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ 4 ٹریلین کا نفسیاتی ہدف نہ صرف عبور کیا بلکہ کورونا وبا کی موجودگی اور اس کے خوفناک اثرات کے باوجود 4745 ارب روپے کے محصولات اکٹھے کر کے سب کو حیران کر دیا۔ اسی رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے رواں مالی سال کے پہلے دو ماہ، جولائی اور اگست میں ہدف سے زائد ٹیکس جمع کیا گیا اور 850ارب سے زیادہ رقم وصول کر کے اس مالی سال کے خطیر ریونیو ٹارگٹ 5829ارب کی جانب تیزی سے بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ ٹیکس ٹو جی ڈی پی شرح میں اضافے کے لیے اور ٹیکس نیٹ میں زیادہ سے زیادہ افراد شامل کرنے کے لیے ایک مربوط، مضبوط اور شفاف حکمتِ عملی ترتیب دی گئی ہے جس کا کلیدی نکتہ ٹیکنالوجی کے استعمال کی مدد سے قابلِ بھروسہ معلومات کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر نان فائلرز کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہے جو گزشتہ سات دہائیوں سے اس ملک کے وسائل اور حکومتی سہولتوں سے تو مستفید ہوتے رہے ہیں مگر انھوں نے یا تو سرے سے ٹیکس ادا نہیں کیا یا پھر اپنی آمدن اور کاروباری حجم کے مقابلے میں بہت کم ٹیکس ادا کیا ہے۔ ایسے ٹیکس نادہندگان کو ٹھوس شواہد کی بنا پر پکڑنا اور اُن سے ٹیکس وصول کرنا ایف بی آر کی نئی حکمتِ عملی کا بنیادی ستون ہے۔ اس حکمتِ عملی کو کامیابی سے آگے بڑھانے کے لیے چند روز قبل ضروری قانون سازی مکمل کر لی گئی اور اب نان فائلرز کو مزید چھوٹ نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب قابلِ ٹیکس آمدن رکھنے والے افراد کو مقررہ تاریخ سے پہلے ٹیکس جمع کرانے کی تنبیہ کی جا رہی ہے بصورتِ دیگر انھیں ہزار روپے یومیہ جرمانے کے علاوہ دو سال تک قید بھی سنائی جا سکتی ہے۔ مزید برآں اُن کے بجلی اور گیس کے کنکشن کاٹ دیے جائیں گے، حتیٰ کہ فون سم بھی بند کر دی جائے گی۔ ریٹیل سیکٹر کے حقیقی کاروباری حجم کو دستاویزی صورت دینے اور سیل پوائنٹ پر خریداروں سے وصول ہونے والے ٹیکس کی چوری روکنے اور اسے قومی خزانے تک محفوظ انداز میں پہنچانے کے لیے پوائنٹ آف سیل کا ایک خودکار نظام لاگو کیا جا چکا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ

مندرجہ بالا اقدامات کسی سزا کے پیرائے میں نہیں ہیں بلکہ ٹیکس کے نظام کو مضبوط بنانے، قومی خوشحالی اور ہر کسی کو اس کے حصے کا صحیح اور جائز ٹیکس ادا کرنے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ حالات و واقعات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اب شاید ہمارے ملک میں نان فائلرز اور ٹیکس نادہندگان کو مزید مہلت نہ ملے۔

غزہ کے معصوم فاتحین

سرزمینِ فلسطین کی مذہبی اہمیت، روحانی فوقیت اور تاریخی حقیقت کئی صدیوں پر محیط ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی فلسطینی مسلمان یروشلم (القدس) پر اسرائیلی غاصبانہ قبضہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہ اس پر اپنا حق چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ اُن کے اس جائز مطالبے کو اب اقوامِ عالم زیادہ دیر نظر انداز نہیں کرسکتیں اور اس قضیے کا سیاسی اور قانونی حل بہت جلد نکالنا ہوگا تاکہ نہ صرف خطے میں امن بحال کیا جاسکے بلکہ عالمی امن کو درپیش سنگین خطرات سے بھی نمٹا جاسکے۔ بہت سے مستند حوالوں کے مطابق سرزمینِ فلسطین انبیا و رسل علیہم السلام کا مرکز، مسکن اور مدفن رہی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس خطہ ارضی میں واقع بابرکت شہر بیت المقدس کو ''سام بن نوح'' نے آباد کیا تھا اور 1013ء قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے فتح کیا تھا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیت المقدس تمام عالمِ اسلام کا قبلہ اول رہا ہے اور خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کے بعد مسلمانوں کا تیسرا مقدس ترین مقام مسجد اقصیٰ ہی ہے، جس کی طرف رخ کر کے مسلمان تقریباً سولہ ماہ تک نماز ادا کرتے رہے۔ اسی مقام سے ہمارے آقا و مولیٰ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفرِ معراج کا آغاز ہوا تھا اور یہیں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی تھی۔ اسی لیے

بیت المقدس کی حرمت، بقا اور تحفظ کے لیے ہر مسلمان اپنا تن، من دھن قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

تاجِ برطانیہ نے جہاں تقسیمِ ہند کے موقع پر متنازع ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے کشمیر جنت نظیر کو پاکستان کے بجائے بھارت کے حوالے کرنے کا مذموم منصوبہ بنایا تھا بالکل اسی طرح پہلی جنگِ عظیم کے دوران 1917ء میں برطانوی سامراج نے بدنامِ زمانہ بالفور ڈیکلیریشن کے ذریعے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا اور فلسطین کی سرزمین پر آگ اور خون کے کھیل کی داغ بیل ڈال دی۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد اس ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے امریکا اور برطانیہ نے مل کر خطۂ فلسطین پر اسرائیل کا قیام یقینی بنایا اور یوں عرب اسرائیل تنازع کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ باقی کسر 27 نومبر 1947ء کی یو این قرارداد کے ذریعے پوری کر دی گئی جب فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کر کے اسرائیل کے قیام پر قانونی مہر ثبت کر دی گئی مگر فلسطینیوں اور عرب ممالک نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسی طرح مئی 1948ء میں پہلی عرب سرائیل جنگ کا آغاز ہوا جس میں عرب ممالک کو اکثریت کے باوجود شکست کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ طاقتور عالمی طاقتیں اسرائیل کی مالی، سیاسی اور فوجی معاونت کر رہی تھیں۔ قیام کے وقت اسرائیل کے پاس فلسطین کا محض 6.5 فیصد رقبہ تھا مگر اسے آبادی سے کہیں زیادہ رقبہ الاٹ کر دیا گیا اور 1948ء کی جنگ میں یہودیوں نے مزید کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا جس میں بیت المقدس کا مغربی حصہ بھی شامل تھا۔ یہاں پر اہم نکتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصل اہمیت بیت المقدس کے مشرقی حصے کو حاصل ہے کیونکہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے تمام مقدس مذہبی اور تاریخی مقامات اسی حصّے میں واقع ہیں جن میں مسجدِ اقصیٰ بھی شامل ہے۔ 1967ء میں دوسری عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل نے شام کے علاقے گولان کی پہاڑیوں، مصر کے صحرائے سینا اور غزہ کے علاوہ مشرقی بیت المقدس پر بھی اپنا قبضہ جما لیا مگر اس غیر قانونی تسلط کو آج تک اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قوانین کے تحت درست اور جائز قرار نہیں دیا جا سکا۔ دراصل یہی معاملہ مسئلہ

فلسطین کی بنیادی وجہ بھی ہے اور اس کی تاریخی اہمیت کی دلیل بھی۔

ہر سال مقبوضہ فلسطین کے مسلمان رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں بیت المقدس میں کثیر تعداد میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں اور ہر سال اسرائیلی فوج اُن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے جس سے کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ اس سال بھی حسبِ روایت اسرائیلی فوج نے طاقت اور اختیارات کا بے دریغ استعمال کیا اور فلسطینی مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ میں عبادت سے محروم رکھنے کا ہر ہتھکنڈا آزمایا مگر ستائیسویں شب رمضان المبارک کو وہ سب رکاوٹیں عبور کر کے قبلۂ اول میں عبادت کے لیے پہنچ گئے۔ عینی شاہدین کے مطابق پچھتّر ہزار سے زائد فلسطینی اس رات عبادت میں مصروف تھے کہ اسرائیلی فوجی مذموم مقاصد اور ناپاک بوٹوں سمیت مسجدِ اقصیٰ میں گھس گئے اور فلسطینی مسلمانوں پر ظلم کرنے لگے جس سے کشیدگی بڑھی اور باقاعدہ جھڑپیں شروع ہو گئیں اور معاملہ بڑھتے بڑھتے جنگ کی طرف چلا گیا۔ اسرائیلی فضائیہ نے پوری طاقت کے ساتھ غزہ کے رہائشی علاقوں پر شدید بمباری شروع کی اور گیارہ روز تک فضائی اور زمینی حملوں کے نتیجے میں معصوم، نہتے اور گھروں میں محصور فلسطینی زندگی کی بازی ہارنے لگے۔ گیارہ روزہ جنگ میں 232 فلسطینی شہید ہوئے جن میں 65 معصوم بچے، 35 خواتین اور 19 بزرگ شامل تھے۔ البتہ اسرائیلی بمباری اور جنگی جنون بری طرح ناکام ہوا۔ اسرائیل نے اس دوران سنگین جنگی جرائم کا ڈھٹائی کے ساتھ ارتکاب کیا، بین الاقوامی قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور بنیادی انسانی حقوق کا اعلامیہ مذاق میں اڑا دیا۔

حالیہ کشیدگی نے ایک مرتبہ پھر اسرائیل، امریکا اور عالمی امن کے نام نہاد ضامنوں کے گٹھ جوڑ کو بُری طرح بے نقاب کیا ہے۔ اسرائیل نے بربریت، سفاکیت اور ظلم وستم کی بدترین مثال قائم کی مگر اس کے باوجود امریکا اس کی پشت پناہی کرتا رہا اور اس کی سرکوبی یا سرزنش کے بجائے اُلٹا حماس کے راکٹ حملوں کی مذمت کرتا رہا بلکہ اسرائیلی بمباری کو حقِ دفاع کا نام دیا گیا۔ کویت نے اس دہشت گردی کو سکیورٹی کونسل میں اٹھانے کی کوشش کی تو قرارداد امریکا نے ویٹو کر دی اور

مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے سے روک دیا بلکہ جنگی جنون کی مزید حوصلہ افزائی کے لیے امریکا نے اسرائیل کو تہتر کروڑ پچاس لاکھ ڈالر فوجی امداد دینے کا اعلان بھی کیا جو طاقت اور اختیارات کا شرمناک استعمال ہے۔ ظالم کو مظلوم اور معصوم نہتے فلسطینیوں کو ظالم کہا گیا اور اس بیانیے کو مغربی میڈیا، خبر رساں ادارے اور سوشل میڈیا پر عام کیا گیا۔ فلسطینی معصوم بچوں کے قتلِ عام کی کئی وڈیوز کو ویب سائٹس سے ہٹا دیا گیا، سوشل میڈیا کے کئی اکاؤنٹس معطل کر دیئے گئے اور پوری کوشش کی گئی کہ اسرائیلی فوج کی دہشت گردی کو دُنیا کے سامنے سیلف ڈیفنس میں کی گئی کارروائی ثابت کیا جا سکے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اسرائیل کی بربریت، معصوم لوگوں پر فوج کشی اور فضائی بمباری کی پوری دُنیا میں مذمت ہوئی، سنسر شپ کے باوجود سوشل میڈیا پر شہری آبادی پر اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں زمین بوس ہوئی عمارتوں، تڑپتی انسانی جانوں، شدید زخمیوں اور نہتے شہریوں پر گولہ باری کے مناظر پوری دُنیا میں دیکھے گئے۔ ان دل لرزا دینے والے واقعات کے ردِعمل میں برطانیہ، یورپ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور خود امریکا کے سو سے زائد شہروں میں عوام سڑکوں پر نکل آئے اور معصوم افراد کی شہادت اور اسرائیل کے سنگین جنگی جرائم کے خلاف احتجاج کیا۔ او آئی سی اور جی سی سی نے خود کو محض مذمتی بیانات تک محدود رکھا مگر پاکستان نے ہمیشہ کی طرح فلسطینی بھائیوں کی نمائندگی کا حق ادا کیا اور شاندار سفارتکاری سے اس سفاکیت کو امریکا، یورپ اور اقوامِ متحدہ کے سامنے اجاگر کیا۔ قومی اسمبلی میں متفقہ قرارداد کی منظوری سے لے کر یومِ فلسطین منانے تک اور پھر ترکی، چین اور ایران کے بھرپور تعاون سے اقوامِ متحدہ کے جنرل اسمبلی کے ہنگامی اجلاس بلانے اور وہاں پر پاکستانی وزیر خارجہ کی قابلِ تحسین تقریر نے غزہ میں اسرائیلی جارحیت کی قلعی کھول دی۔ اسرائیل عوامی ردِعمل اور حماس کے راکٹ حملوں کے سامنے بے بس دکھائی دیا اور گیارہ روزہ کشیدگی کے بعد اچانک یکطرفہ اور غیر مشروط جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ یوں اس جنگ بندی کو فلسطینی مسلمان اپنی اخلاقی برتری اور شدید مزاحمت کی فتح قرار دے رہے ہیں جو دراصل غزہ کے معصوم شہدا کے

عزم وحوصلے کا نتیجہ ہے، جن کی ننھی لاشوں نے اسرائیل کی بربریت کا بھانڈا پھوڑ کر رائے عامہ بدل ڈالی اور یوں تاریخ میں پہلی مرتبہ اس ناجائز ریاست کا مکروہ چہرہ دُنیا کے سامنے مکمل طور پر بے نقاب ہوگیا۔

□□□
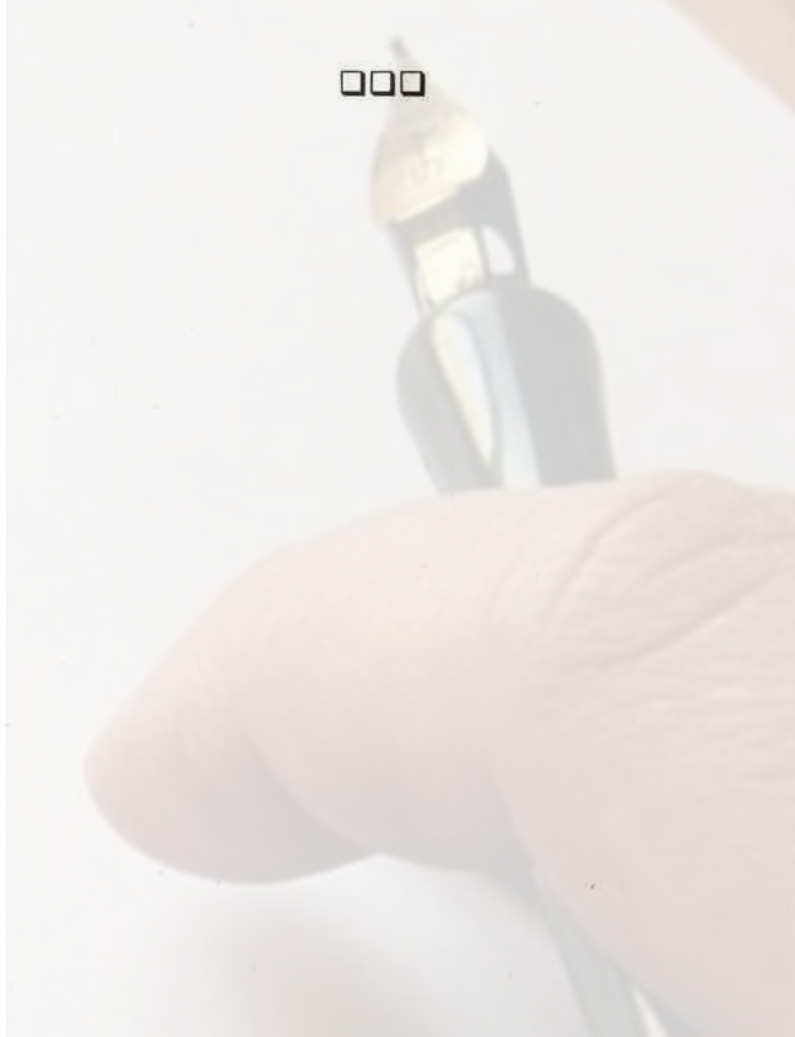
شعبِ ابی طالب سے صدائیں

نبوت کے ساتویں سال جب سرزمین عرب پر کفر و الحاد اور جرم و جہالت کے اندھیرے مدھم پڑ گئے، مکہ کی ریتلی زمین پر آفتابِ نبوت پوری آب و تاب سے چمکنے لگا اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ توحیدِ الٰہی کا پیغام عام کرنے لگے تو ٹھیک اسی وقت ابوجہل کے ماتھے پر جہالت کی سیاہی مزید گہری ہونے لگی۔ حضرت امیر حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جیسے بہادر انسان اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے غیور نوجوان اپنے دل نورِ ایمان سے منور کر کے قافلۂ اسلام میں شامل ہو چکے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پہلے ہی اپنی پوری وجاہت کے ساتھ اسلام کے ہراول دستے میں موجود تھے۔ نجاشی نے مسلمانوں کی روشن دلیلوں کے سامنے ہاتھ اٹھا دیئے اور مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دے کر کفار کے ناپاک عزائم خاکستر کر دیئے تو مشرکینِ مکہ کے کفر کی شہنائی توحید و رسالت کے نغمات میں ڈوبنے لگی۔ اسلام کا پرچار عام ہونے لگا اور اہلِ ایمان خانہ کعبہ میں بلاخوف عبادت کرنے لگے تو کفارِ مکہ کے دل میں نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے لیے بغض اور کینہ شدت اختیار کر گیا۔ کفار نے ہر صورت میں فروغِ اسلام کا راستہ روکنے کی ٹھان لی۔ ابوجہل کی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں بامِ عروج کو چھونے لگیں اور وہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے خون

کا پیاسا ہو گیا۔

ابوجہل کفارِ مکہ کے سرداروں کو لے کر حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب کے پاس جا پہنچا، ان سے رسولِ اکرم ﷺ کی حوالگی کا مطالبہ کر ڈالا اور معاوضہ بھی ادا کرنے کی پیشکش کر دی۔ اس پر حضرت ابوطالب شدید برہم ہوئے اور صاف انکار کر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے فرطِ جذبات میں نوے اشعار پر مشتمل بہت دردناک قصیدہ لکھا، جسے قصیدۂ لامیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس قصیدہ کے ایک شعر میں وہ کفارِ مکہ کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے کعبہ کے رب کی قسم، تمھیں میرے بھتیجے تک پہنچنے سے پہلے بنو ہاشم کی تلواروں، نیزوں اور تیروں سے ٹکرانا ہوگا اور ہاں میں تمھارا مطالبہ اس وقت مانوں گا، جب میرے بھتیجے کے چاروں طرف ہمارے قبیلے کے سارے نوجوانوں کی لاشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوں گے۔ اپنے اس مذموم منصوبہ کی ناکامی پر کفارِ مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور قریش کی اعلیٰ مجلس کے رکن منصور بن عکرمہ کے قلم سے ایک عہدنامے پر دستخط کیے، جسے صحیفۂ قریش کا نام دیا گیا اور دستخط شدہ عہدنامہ کعبے کی چھت پر لٹکا دیا گیا۔ کفار نے قسم کھائی کہ محمد اور ان کے حامیوں سے تمام تر تعلقات اور سماجی رابطے کلی طور پر منقطع کر دیئے جائیں۔ محمد کے دشمنوں کو سرآنکھوں پر بٹھایا جائے اور آپ کے ساتھیوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا جائے، یہاں تک کہ وہ محمد عربی کا ساتھ چھوڑ دیں۔

ایک طرف قریشِ مکہ کا جھوٹی طاقت کا زُعم، جاہل حکومت کا نشہ اور دُنیاوی اقتدار کا طنطنہ تھا تو دوسری طرف توحید و رسالت پر یقینِ محکم، صراطِ مستقیم پر استقامت کی دولت سے مالامال دینِ حق کی سربلندی کے لیے پُرعزم اہلِ ایمان کا قافلہ جو پورے جوش اور ولولہ کے ساتھ دینِ اسلام کے فروغ کے لیے سرگرمِ عمل تھا۔ مسلمان یہ طے کر چکے تھے کہ اب جو بھی آزمائش، ابتلا یا مصائب آئیں وہ اللہ کے نبی ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ خطرات کو بھانپتے ہوئے اور کفارِ مکہ کو اپنے بھتیجے کے خون کا پیاسا دیکھ کر حضرت ابوطالب نے بنو ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو مکہ چھوڑ کر قبیلے کی آبائی زمین پر واقع گہری، مگر محفوظ گھاٹی شعبِ ابی طالب میں پناہ لینے کا حکم دے دیا، اُدھر ابوجہل

کی سربراہی میں شعبِ ابی طالب کی طرف جانے والے واحد راستے پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے اور اہلِ ایمان کی طرف کھانے پینے کا سامان پہنچانے کی ہر کوشش کو راستے میں ہی ناکام بنا دیا جاتا۔ اس گہری گھاٹی میں محصوری کے یہ تین سال یوں بسر ہوئے جیسے کسی شہرِ مدفون پہ وقت گزرے۔ حضرت ابو طالب محمد ﷺ کی حفاظت اور سلامتی یقینی بنانے کے لیے ساری رات خود پہرہ دیتے اور ان کے بستر پر اپنے کسی بھائی یا بیٹے کو سلا دیتے۔ جاڑے کا موسم ان کے جسم کی تمام ہڈیاں لرزا دیتا، مگر یہ حرفِ شکایت زبان پہ نہ لاتے؛ حتیٰ کہ جب شیر خوار بچے دودھ کی حسرت دل میں لیے پیاسے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے اور ان کی چیخیں مکہ میں بھی سنی جاتیں تو ان کی مائیں تڑپ جاتیں، لیکن یہ اہلِ ایمان کیسے عجیب لوگ تھے جن کی آنتیں بھوک سے سکڑ جاتیں، مگر اُن کا اللہ پہ توکّل مزید پختہ ہو جاتا اور محمد ﷺ سے محبت مزید گہری ہوتی جاتی۔ صرف حج کے ایام میں اس محاصرے میں نرمی ہو جاتی تو آپ ﷺ حج پہ آنے والے اہلِ ایمان کو درسِ تبلیغ دیتے، مگر قریشِ مکہ ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتے اور تبلیغِ اسلام کے عمل میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالنے کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے۔ ایک طرف یہ قافلہ بھوک سے بے حال، عالمِ مجبوری میں درختوں کی چھال اور پتے جلا کر اس کی راکھ پانی کے ساتھ نگلنے پر مجبور تھا تو دوسری طرف مشرکینِ مکہ عیش و عشرت کی تمام حدیں پھلانگ رہے تھے۔ بدترین بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے فرزندانِ اسلام کے کراہنے کی صدائیں پتھر دل مشرکینِ مکہ کے کانوں سے ٹکرا کر بے اثر لوٹ آتیں۔

تین صبر آزما برسوں پر محیط اس خوفناک لاک ڈاؤن میں اہلِ ایمان کی بے مثال استقامت خدا کو پسند آ گئی اور آزمائش کے خاتمے کا آسمانی فیصلہ آن پہنچا۔ حضرت ابو طالب محمد ﷺ کا چیلنج لے کر کفارِ مکہ کے پاس آئے کہ میرے بھتیجے کا کہنا ہے کہ دیمک نے اُس عہد نامے کو چاٹ کھایا ہے، جسے تحریر کرتے وقت تم تکبر کی ساری حدیں پار کر گئے تھے۔ دیمک نے صرف اللہ کے نام کو باقی چھوڑا ہے، جاؤ اور دیکھو، اگر اُن کی بات سچی ہے تو تم محاصرہ اٹھا لو گے اور اگر جھوٹی ہے تو میں انھیں تمھاری شرائط پہ تمھارے حوالے کر دوں گا۔ کفارِ مکہ بہ خوشی رضامند ہو گئے اور عہد نامے کو

دیکھنے کے لیے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا تو چکرا کر رہ گئے کہ عہد نامے میں اللہ کے نام کے سوا کوئی حرف بھی موجود نہیں تھا اور اسے مکمل طور پہ دیمک چاٹ گئی تھی۔ یوں شعبِ ابی طالب کا محاصرہ ختم ہوا۔ بالآخر بنیٔ ہاشم اور بنو عبدالمطلب صبر و رضا کا جھنڈا تھامے سربلندیٔ اسلام کی فتح کے ساتھ واپس مکہ آ کر آباد ہو گئے۔

کورونا وبا کے باعث نافذ لاک ڈاؤن میں عوام بے چینی اور اضطراب کا شکار ہیں، ان کا اضطراب اور پریشانی بجا ہے، لیکن اگر ماضی میں جھانکیں تو ہمیں روشنی کی ایسی کرنیں مل جائیں گی، جن کو ہم مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں۔ شعبِ ابی طالب کی ہی مثال لے لیں۔ دیکھیں کہ دُنیا کے سب سے کامل انسان نے خوف، بے چینی اور اضطراب میں کیسا طرزِ عمل اختیار کرنے کا درس دیا؟ یہ کہ برے حالات میں بھی صبر اور استقامت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس سبق کو پیشِ نظر رکھیں، تو لاک ڈاؤن سے لاحق ہونے والی پریشانیاں بے معنی محسوس ہونے لگیں گی۔ کورونا ایک قدرتی آفت ہے، جس میں ہمیں ثابت قدم رہنا ہے، تبھی ہم سرخرو ہو سکیں گے۔

❑❑❑

ملاوٹ

یہ ستم ظریفی ہے کہ وطنِ عزیز میں ملاوٹ کا رجحان اس قدر رواج پا چکا ہے کہ اس اخلاقی گراوٹ کو جیسے قبولیت کا درجہ مل گیا ہو۔ بحیثیت قوم ہماری کچھ ذمہ داریاں بنتی ہیں اور کچھ حقوق بھی ہیں۔ بعض اوقات جھنجھلاہٹ باقاعدہ غصے میں بدل جاتی ہے کہ آخر قوم سوال کیوں نہیں کرتی، ہمیں عمدہ چیز کی پہچان کیوں نہیں ہے، یہ استحصال کیوں خاموشی سے سہا جاتا ہے؟ روپیہ پیسہ کم یا زیادہ ہونا بری بات نہیں مگر فکر و دانش کا کم ہو جانا واقعتاً پریشانی کا باعث ہے۔ ہم نے شاید سوچنا ترک کر دیا ہے اور یہ معاشی و معاشرتی رویہ ہماری نسلوں کی ذہنی و جسمانی صحت پر شدید مضر اثرات مرتب کر رہا ہے۔ پچھلے سال خیبر پختونخوا کے ایک ایسے شہر میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں گھروں اور ہوٹلوں کی چھتوں پر استعمال شدہ چائے کی پتی کو خشک کیا جا رہا تھا۔ یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ استعمال شدہ پتی خشک کر کے کیمیکل سے رنگنے کے بعد مہنگے داموں بازار میں بیچ دی جاتی ہے۔ یہ ایک شہر کی مثال ہے۔ غور کریں تو روزمرہ اشیائے خورونوش میں کیا خالص رہ گیا ہے؟ دودھ کو لے لیں، کتنی قسم کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ پانی کی آمیزش تو اب بے ضرر لگنے لگی ہے۔ کیمیکلز والا دودھ ہمارے بچے بھی پیتے ہیں، معصوم بچے بھی ہمارے مذموم مقاصد اور حرص و ہوس کی

بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی بے حس ہو گئے ہیں۔ ذاتی مفاد کا سوچتے سوچتے یہ بھول گئے ہیں کہ بے حسی کی جو فصل ہم نے کاشت کی ہے، اس سے انسانی زندگی کو کتنے سنگین خطرات لاحق ہیں۔ ہم کیا اپنے اپنے جزیرے آباد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ایک مشہور ڈاکٹر (برین سرجن) جس کے ہاتھ اللہ نے ہنر دیا تھا کہ وہ دماغ جیسے پیچیدہ عضوِ بدن کے علاج میں مہارت رکھتا تھا، کا قصہ سب کو معلوم ہے کہ وہ اپنے کام میں یکتا تھا مگر روپے پیسے کا لالچ بھی اسی درجہ کا تھا۔ مریض پیشگی رقم جمع کراتا تو ہی ڈاکٹر صاحب اس کا علاج کرتے۔ غریب یا کمزور معاشی حیثیت والوں کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھنے کی شاید توفیق عطا نہ ہوئی تھی۔ ایک دن شعبۂ حادثات سے کال آئی کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں ایک نوجوان زخمی ہے، دماغ پر چوٹ لگی ہے، فوری آپریشن ناگزیر ہے، ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت اپنی فیس جمع ہونے کی تصدیق چاہی مگر اجنبی بے ہوش مریض کی فیس کس نے ادا کرنا تھی۔ لہٰذا آپریشن نہ ہوا اور مریض جانبر نہ ہو سکا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کو گھر سے کال آئی کہ بیٹے کی کار کو حادثہ پیش آیا ہے، وہ آپ کے ہسپتال میں لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہوش سے بیگانہ ہو گیا کیونکہ سامنے اکلوتے جوان بیٹے کی لاش پڑی تھی۔

دولت کمانا سب کا حق ہے، مگر کیسے، یہ جاننا بہت ضروری ہے۔ ملاوٹ صرف اجناس یا ضرورتِ زندگی کی اشیا تک محدود نہیں ہے۔ انسان، جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ کچھ ضرورتیں جسم کی ہیں، کچھ روح کی۔ کھانا پینا جسمانی ضرورت ہے، غذا زندگی کو دوام بخشتی ہے، اس کا خالص، طیب اور حلال ذرائع سے حاصل کرنا اہم بلکہ ناگزیر ہے۔ بشری جبلتیں انسان کو کمزور کر دیتی ہیں۔ بھوک، پیاس، نیند، نفسانی خواہشات بلاشبہ طاقتور جبلتیں ہیں۔ ازل سے انسان ان جبلتوں کے ہاتھوں مار کھاتا آیا ہے۔ زمانۂ جدید نے سوچوں کو بھی آلودہ کر دیا ہے۔ یہ ایک ترتیب ہے۔ پہلے سوچ آتی ہے، پھر عمل بنتا ہے اور آہستہ آہستہ عادت اور پھر فطرت۔ انسان اپنے آپ سے نہیں بچ سکتا۔ فطرت کی غلامی اخلاق کے اعلیٰ اوصاف کو اس سے متعارف ہی نہیں ہونے دیتی۔ سوچوں میں ملاوٹ آ جائے تو یہ انتہائی مہلک ثابت ہوتی ہے اور انسانیت کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں

کو روند ڈالتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم جسمانی اور روحانی، دونوں طرح کے انحطاط اور زوال کی لپیٹ میں ہیں۔ اس کے اسباب چاہے انفرادی ہوں یا اجتماعی، ذمہ داری ہر ایک کو لینا پڑے گی۔ ہمیں اپنے خدوخال کی مجموعی کیفیات اور ڈھانچے کو جانچنے کے بعد اس میں ضروری تبدیلیاں لانا پڑیں گی۔ خوش فہمیاں نہیں پالنی چاہئیں، اپنا جائزہ خود لینا ہوگا۔ مہذب معاشروں کو پڑھ کر، سمجھ کر ہمیں اپنے معاشرتی ڈھانچے کو نئے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ یہ اعلیٰ معاشرتی اقدار کو نہ صرف متعارف کرانے کا وقت ہے بلکہ ان پر عمل کرنے اور کروانے کا بھی وقت ہے۔ ملاوٹ سے پاک معاشرے کی بنیاد سچائی، امانت اور دیانت جیسے اعلیٰ ترین اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی رویوں میں جھلکنی چاہیے۔ در و دیوار پر بے ہنگم اشتہارات اور جھوٹے دعوے قوم کے جذبات کے ترجمان ہرگز نہیں، انھیں بند کرانا ہوگا۔ قوانین پر گلی محلہ کی سطح پر عمل درآمد ضروری ہے اور پاکیزہ خیالات کے اظہار اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ میں ایک سمجھدار خاتون عدالت پہنچ جاتی ہے کہ ایک بین الاقوامی کاسمیٹکس کمپنی کے شیمپو کے اشتہار میں کہا جاتا ہے کہ یہ بالوں کو گرنے سے روکتا ہے مگر مستقل استعمال پر نتیجہ برعکس نکلا ہے۔ کمپنی کو نہ صرف ہرجانہ ادا کرنا پڑتا ہے بلکہ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی کر کے مال فروخت کرنے کا مقدمہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں صارف کے حقوق!

دیکھتے دیکھتے روایات تبدیل ہو گئیں۔ ہم اصل سے دور اور مصنوعی زندگی کے عادی ہو گئے۔ سادہ خالص خوراک کو ملٹی نیشنل کارپوریشنز کو کامیاب کرنے کے لیے مضرِ صحت قرار دے دیا گیا۔ نوجوان نسل کو قدرتی اور خالص دیسی اشیا کی پہچان اور ذائقہ تک بھول گئے اور ملک کا قیمتی زرِمبادلہ امپورٹ پر خرچ ہونے لگا۔ وطنِ عزیز سے دودھ، دہی، لسی کا کلچر سرے سے ختم ہو گیا۔ سرمایادارانہ نظام کی چکی میں عوام یوں پسے گئے کہ اصل سے جدا ہو کر گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ گاؤں کے لوگوں نے بھی دیسی دودھ بیچ کر تیل کا پیک خرید لیا۔ جنگلی شہد محنت سے تلاش کیا اور شہروں میں بیچ کر بچوں کے لیے چپس اور پاپڑ خرید لیے۔ سفاکیت کی انتہا تو یہ ہے کہ موت

وحیات کی کشمکش میں مبتلا مریضوں کو دوا بھی خالص میسر نہیں۔ دو نمبر کمپنیوں کی بھرمار ہے اور میعاد ختم ہو جانے کے بعد لیبل تبدیل کر کے چیزیں بیچی جا رہی ہیں۔ اب ''ریپلیکا'' کا دور چل رہا ہے، گھٹیا مال اس خوبصورت نام کے ساتھ عزت پانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس کھیل کا خاتمہ کیسے ہو؟ زرعی زمینیں مافیا نے کوڑیوں کے مول لے کر اربوں کما لیے اور معاشرے کے معاشرتی و معاشی اور تہذیبی توازن کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ فضا آلودہ، پانی پینے کے قابل نہیں، مشروم کی طرح اگنے والے نو دولتیوں کی ایک کلاس اس طرح بھیس بدل کر عزت و وقار حاصل کر چکی ہے کہ اب غریب ہونا معاشرتی عیب بن گیا ہے۔ ریڑھی بان سے لے کر مل مالکان تک، ہر کوئی ملاوٹ کی لت میں پڑ چکا ہے اور حرص و ہوس کی اتھاہ دلدلوں میں مال و زر کے انبار لگانے میں مصروف ہے۔

امام احمد بن حنبل ﷫ سے ایک خاتون نے ایک اہم مسئلے پر رہنمائی چاہی۔ وہ عورت سوت کات کر بازار میں فروخت کرتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ ''میں رات کو سوت کاتتی ہوں، دن میں دیگر کام ہوتے ہیں اور میرا چرخہ گھر کی چھت پر ہے، کیونکہ میں چاند کی روشنی میں کام کرتی ہوں، رات کے وقت میری گلی سے بادشاہ کی سواری گزرتی ہے جس کے شمع دان پورے ماحول کو روشن کر دیتے ہیں، جو سوت اس روشنی میں کاتا جاتا ہے اس کا معیار چاند والی روشنی سے اچھا ہوتا ہے، کیا میں ان دونوں کو الگ الگ قیمت پر فروخت کر سکتی ہوں؟'' سمجھنے کی باتیں ہیں، غور و خوض کا وقت ہے، ذاتی اور قومی وقار اور مہذب دنیا میں ہمارا تعارف ہماری اجتماعی سوچ اور عمل کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ قوموں کی برادری میں ہمارے اسلاف نے جو عزت اور جو مقام حاصل کیا تھا، جس کا ذکر علامہ اقبال نے اپنی نظم شکوہ میں کیا، اسی کو دوبارہ پانے کے لیے وہی اعلیٰ اقدار اپنانے کا وقت ہے۔ آئینہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ خالص اور پاکیزہ رزق، بقول بانو قدسیہ، سات نسلوں تک اثر دکھاتا ہے اور ساتویں نسل تک اگر رزق ملاوٹ اور ناجائز ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو تو نسلوں میں جنون آ جاتا ہے۔ ملاوٹ کو اگر عام فہم انداز میں لیا جائے تو محبت بھی پوری اور خالص دستیاب نہیں

ہے۔ ہم شہروں میں رہنے والوں نے اپنا رنگ ڈھنگ تبدیل کیا تو دیہی معاشرتی سماجی تہذیب و تمدن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خیر نہ برکت، محبت نہ صفائی، طہارت نہ ذائقہ، اور مال کا زیاں بے شمار۔ آج سے سوچ کا روشندان کھولیں اور تازہ ہوا کا جھونکا اندر آنے دیں، اچھا لگے گا۔
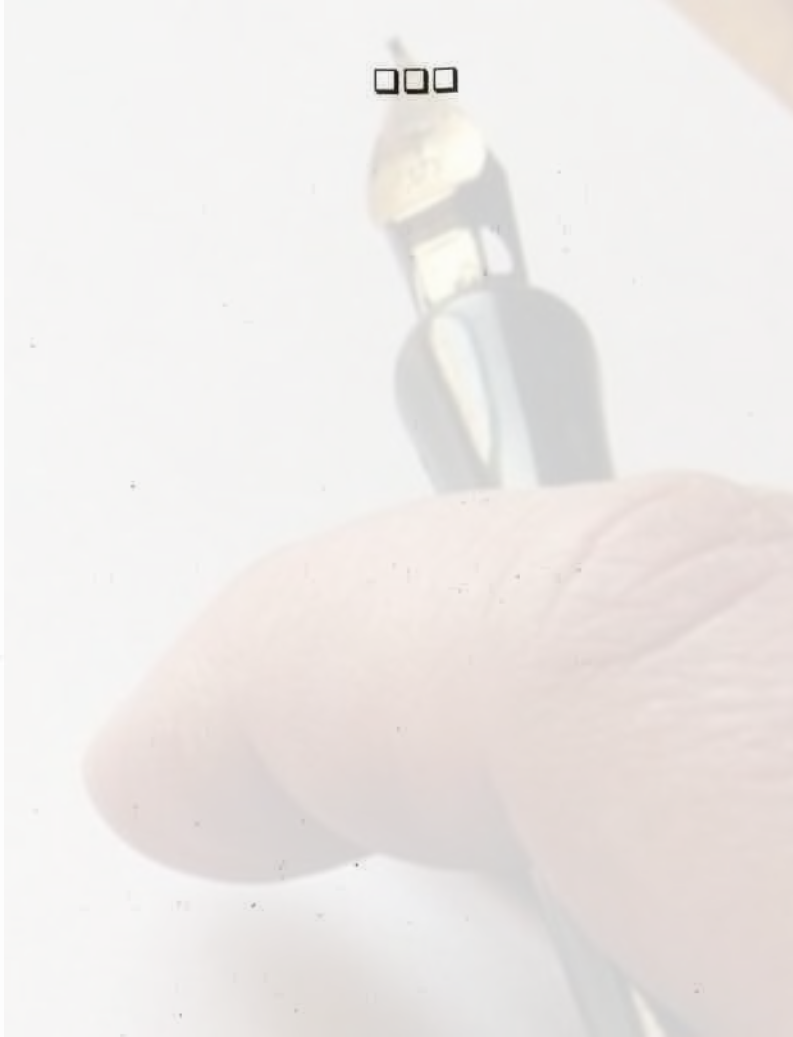
کامیابی کے کڑے امتحانات

انسانی زندگی کا ارتقا مختلف مراحل سے عبارت ہے۔ بہت سی ضروریاتِ زندگی اور اصولوں سے ناواقف بنی نوعِ انسان نے خود کو بھوک، موسموں کی شدت اور جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے گھر، خوراک اور کچھ بنیادی نوعیت کے ہتھیار، ذاتی حفاظت اور شکار کے شوق میں بنائے، اسی طرح اس نے کچھ سادہ طرز کی معاشرتی اقدار متعارف کرائیں۔ انہی کے نتیجے میں لباس، زبان، رسم ورواج اور تمدن نے جنم لیا۔ اپنے خوف، وحشت اور دیگر نفسیاتی رویوں کے زیرِ اثر اس نے کبھی سورج، کبھی آگ اور کبھی شجر وحجر کو معبود بنایا مگر انسان کی سرشت میں جستجو اور جاننے کی صلاحیت ازل سے ودیعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔ سیکھنے سکھانے، علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے اور کائنات کی وسعتوں کو چیر کر ستاروں پر کمند ڈالنے کا شوق ہر انسان کی فطرت میں شامل کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم بنی نوعِ انسان کے ماتھے کا جھومر اور راستوں کی قندیل بنا؛ یعنی انسان کی تعمیر وترقی، بڑھوتری اور کامیابی کا زینہ تعلیم وتربیت کی شعوری کوشش اور جہدِ مسلسل سے جڑا ہے۔ اسی تناظر میں اگر ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو ہر بچہ ماں کی گود سے غیر محسوس طریقے سے سیکھنے سکھانے کا

عمل شروع کر دیتا ہے۔ عموی طور پر پانچ سال کی عمر میں بچہ کچھ ہوش سنبھالتا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کے جن مراحل سے گزرتا ہے ان کو ہم پانچ ادوار میں منقسم کرتے ہیں۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑعمری اور پھر بڑھاپا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطری طور پر بے حد صلاحیتوں کے ساتھ دنیا میں بھیجا اور ہر فرد کو انواع واقسام کے اوصاف عطا کیے۔ سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ سونے کی طشتری میں سجا کر کچھ نہیں پیش کیا جاتا۔ محنت، مسلسل کاوش اور جدوجہد کے ساتھ کامیابی کو مشروط کر دیا گیا ہے۔ یہاں شعور، آگاہی اور سمت کا تعین کرنا لازم ہوتا ہے اور منزل کی طرف سفر کے آغاز سے پہلے مقاصد اور اہداف چنے اور منتخب کیے جاتے ہیں۔ کچھ حد تک ابتدائی سطح پر انسانوں کی درجہ بندی بھی ہوجاتی ہے جو جبلّتوں کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں کا ادراک کر لیتے ہیں۔ وہ جسمانی ضروریات، خواہشات اور ترجیحات کے ساتھ روحانی اور ذہنی ضروریات اور تقاضے پورے کرنے کے بھی اہداف مقرر کرتے ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی قدروں سے روشناس ہو کر فکروعمل کی شاہراہ کے مسافر بنتے ہیں۔ یہی وہ خوش نصیب ہیں جو دنیا میں کامیاب وکامران اور سرخرو قرار پاتے ہیں۔ یہاں سمجھنے کا باریک نکتہ یہ ہے کہ عقل کسی کی میراث نہیں اور آگاہی کسی کے گھر کی خادمہ نہیں۔ اگر کوئی شخص تن آسانی اور بنیادی جبلتوں پر ہی اکتفا کر لے اور محض خواہشات کا تابع غلام بن کر ان کو کل جہاں سمجھ بیٹھے تو وہ شاید زندگی میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

کامیابی کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، اس کا کوئی شارٹ کٹ ہے یا یہ کامیابی کے زینے پر درجہ بدرجہ منزل کی جانب بتدریج سفر ہے، راستے میں کتنے پڑاؤ آتے ہیں، کتنے ہمسفر بچھڑتے اور کتنے راہی ادھورے خواب لے کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور منزل تک رسائی کے راستے میں کتنی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، کتنی بار ٹوٹنا، خود کو سمجھانا اور حوصلہ دے کر ہر روز نئے عزم، جوش اور تازہ ولولے کے ساتھ آگے بڑھنا پڑتا ہے تب جا کر خوابوں کی تعبیر پانے کا پُرلطف لمحہ نصیب ہوتا ہے۔ اپنی امنگوں، خواہشات اور آرزوؤں کے نخلستان میں پھول کھلتے دیکھنا

ہر شخص کو کہاں نصیب ہوتا ہے اور اپنے خوابوں کے جہاں میں زندگی گزارنا اور کارزارِ حیات سے عزت و آبرو کے ساتھ گزر جانا کیا ہر شخص کے لیے آسان عمل ہے؟ ہرگز نہیں! محض خوش بخت انسان ہی مقدر کے سکندر بنتے ہیں۔

ہمارے جیسے پسماندہ معاشرے میں محض چند خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھیں اپنی محنت اور صلاحیت کی بنیاد پر حاصل ہونے والی کامیابی اور اس کے ثمرات سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہو۔ ورنہ اکثر کو تو ان کے اپنے ہی نئے امتحان اور کڑی آزمائشوں میں الجھا دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ افسوس اور عجیب ہے کہ ہمارے معاشرے میں منفی رویے اور رجحانات اس طرح رواج پا گئے ہیں کہ اقدار تبدیل ہوگئی ہیں۔ عزت، محبت اور دعاؤں کی جگہ بغض، کینہ، حسد اور نفرت کے جذبات نے لے لی ہے۔ منافرت اور جھوٹی شان و شوکت اور بات بات پر الجھنے اور غصے سے عام سی بات پر ردِعمل ان کی ذاتی رقابت اور حاسدانہ چالوں کو بے نقاب کرتا نظر آتا ہے۔ ظلم تو یہ ہوا کہ گھروں سے لے کر کالج، یونیورسٹی تک اور اعلیٰ تربیتی ادارے بھی ان منفی رجحانات کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ نمبروں کی دوڑ میں دوسروں کو پیچھے چھوڑنے کی دھن نے نوجوانوں کو خود غرض اور پست سوچ کے تابع کر دیا ہے۔ اسی طرح رقابت کی آگ نے رشتوں کو نگل لیا ہے۔ خون کے رشتے حسد و رقابت میں حدود کو پامال کرتے نظر آتے ہیں۔ کاروبارِ حیات میں کامیاب لوگوں کے بے شمار حاسدین بنا کسی وجہ کے مخالفت میں الجھے مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایسے میں منفی رجحان نے پورے ماحول کو زہر آلود کر دیا ہے۔ ہم سب اندر سے اکیلے ہو کر کھوکھلے اور مطلب پرست رشتوں کا بھرم رکھتے رکھتے ہلکان ہو چکے ہیں۔ ایسے میں نفسیاتی طور پر ہم سب دباؤ میں ہیں۔ یقیناً بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ کی تقسیم سے لڑ رہے ہیں، جو ان کے پاس ہے اس پر اکتفا کرنے کے بجائے کامیاب لوگوں سے رقابت کا روگ پال لیتے ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ترقی اور خوشحالی کے لیے خرچ کرنے کی بجائے کامیاب لوگوں کے ساتھ مخاصمت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس مہذب دنیا نے اپنی اخلاقیات، روایات اور انسانی رویوں پر بہت کام کیا ہے۔ وہ انسانی کردار، انفرادی صلاحیت اور شخصی احترام کو مانتے ہیں۔ وہ خاندان، حسب نسب، برادری، ذات پات اور معاشی حیثیت کے تعصب سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں اور ہر شخص کی عزت وتوقیر کو مقدم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں محنت، لگن، ذاتی کوشش اور صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھنے والوں کے راستے میں کانٹے نہیں بچھائے جاتے اور نہ ہی انھیں حسد، بغض، کینہ اور عداوت کا شکار بنایا جاتا ہے بلکہ صرف میرٹ اور پرفارمنس کو اولین حیثیت دی جاتی ہے جس کے سبب آج وہاں نوجوان کم عمری کے باوجود بڑی بڑی کمپنیوں کے سربراہان کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ انسانی قابلیت اور کردار ہی آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کرتے ہیں اور آگے بڑھنے والوں کو کامیابی وکامرانی کی مسندِتوقیر عطا کی جاتی ہے۔ یہی تہذیب یافتہ معاشروں کی کامیابی کا راز ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی سماجی رویے اور انسانی قدریں اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی ہیں۔ پسند ناپسند، برادری، حسد اور ذاتی بغض وکینہ ہمارے معاشرتی بگاڑ میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں، قابل اور باصلاحیت لوگوں کو کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی نت نئے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے راستے میں ہر روز نئی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں، کانٹے بچھائے جاتے ہیں، الزامات لگائے جاتے ہیں اور اُن کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اونچی اڑان والے عقابوں کو کرگس کے جہاں میں دھکیلا جاتا ہے اور ہماری اجتماعی ناکامیوں اور پسماندگیوں میں اس پست سوچ اور تعصّبانہ طرزِ فکر کا بہت بڑا کردار ہے۔ عملی زندگی کے کڑے امتحانوں سے گزر کر کامیاب ہونے والوں کو کامیابی کے بعد بھی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے مگر محنت سے کامرانی کا تاج اپنے سر پر سجانے والے یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کامیابی کی شاہراہ پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں کہ کامیابی کی قیمت چکانا پڑتی ہے، حاسدین اور کم ظرف لوگوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے اہداف کا تعاقب کرنا اور اپنے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنا زیادہ مقدم

ہے۔ یہی بنیادی فرق انھیں دوسروں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ بقولِ شاعر:

حریف کوئی نہیں دوسرا بڑا میرا
سدا مجھی سے رہا ہے مقابلہ میرا

❑❑❑
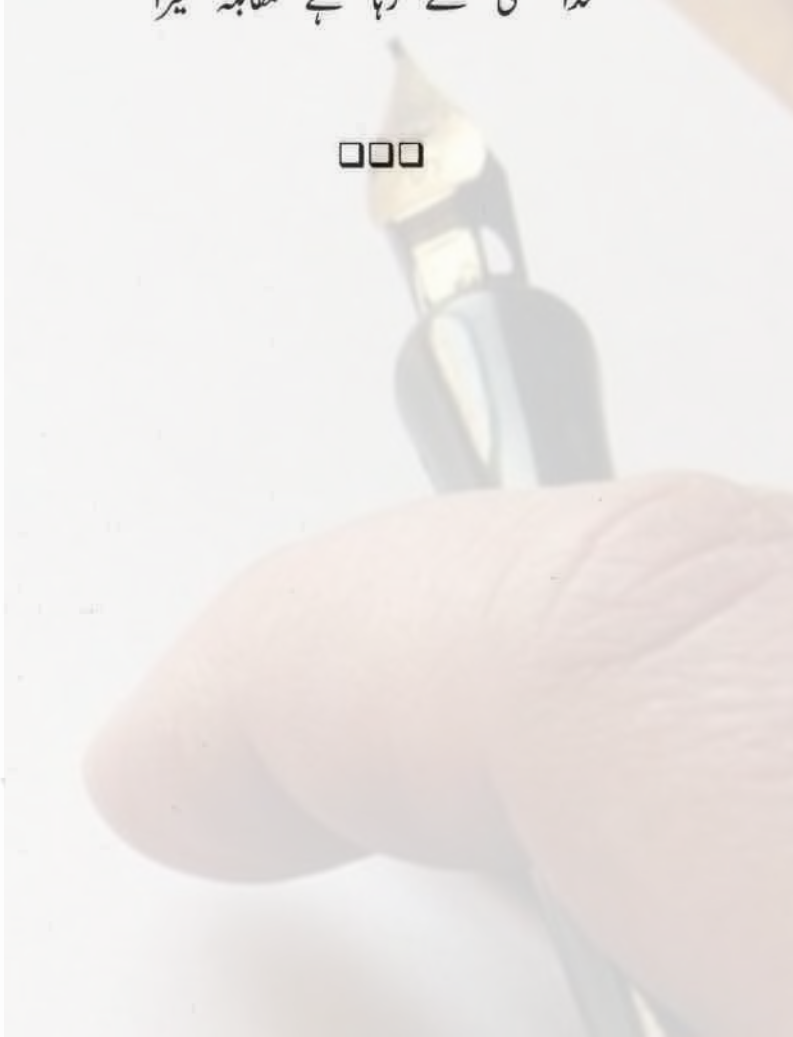
مہمانِ خصوصی

ایک روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسمبلی میں اپنے خطاب کے دوران سکول کے سالانہ معائنہ کا بتایا اور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (ڈی ای او) صاحب کی آمد کا ذکر کیا اور زور دیا کہ اُن کے دورہ کو کامیاب بنانے کے لیے جملہ سٹاف، اساتذہ کرام اور طلبہ مل کر دن رات کام کریں اور پندرہ دنوں میں بہترین تیاری کر کے اس کڑی آزمائش میں سرخرو ہو کر ادارے کا نام روشن کریں۔ اسمبلی کے فوراً بعد پہلے پیریڈ میں ہی کام شروع ہو گیا اور ہمارے استادِ محترم نے مجھ سمیت زمیندار گھرانوں کے طلبہ کے ذمے دیسی انڈے اور دیسی مرغ اکٹھے کرنے کا کام سونپ دیا۔ بکرے کا گوشت دوسری کلاس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا تو کسٹرڈ اور کھیر کی ایک اور جماعت کی ڈیوٹی لگا دی گئی۔ یوں آنے والے مہمانِ ذی وقار کے لیے ایک پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ہمارے اساتذہ اس پر متفق تھے کہ جتنا اچھا اور لذیذ کھانا ہوگا اتنا ہی شاندار تاثر پڑے گا اور ڈی ای او صاحب ادارے کے بارے میں بہترین ریمارکس لکھیں گے۔ لہٰذا ہر روز تکلفات کا سلسلہ مزید پھیلتا رہا اور کھانے کے آخر میں کیلے، سیب، مالٹے شامل کر لیے گئے اور دودھ پتی کا انتظام بھی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ درختوں کی کانٹ چھانٹ، گھاس کی کٹائی، صفائی ستھرائی اور درختوں کے

تنوں کو سفیدی اور لال رنگ سے رنگنے کا عمل بھی تیزی سے شروع ہو گیا۔ سکول کا سارا ریکارڈ جس میں لاگ بک، رجسٹر حاضری معلمین، رجسٹر داخل خارج، سکول فنڈ کے رجسٹرز نیز ہر کلاس کا رجسٹر حاضری شامل تھے، سب کے اوپر تازہ کور چڑھا کر ان پر کٹے ہوئے مارکر سے جلی حروف میں رجسٹر کا نام لکھا گیا۔

اگلے ہی روز معائنہ کو عملی لحاظ سے کامیاب بنانے کے لیے خصوصی ہدایات دی گئیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہر کلاس کے مانیٹر اور کلاس انچارج کو اپنے کمرے میں بلا کر ایک مربوط حکمتِ عملی سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ معزز مہمان کی کلاس میں آمد پر جب سوالات پوچھے جائیں تو کلاس کا ہر طالب علم ہاتھ کھڑا کر کے لہرائے، بالخصوص پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے طلبہ یہ عمل زیادہ تندہی سے انجام دیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ کلاس کے دو تین ذہین اور لائق طلبہ ہاتھ کھڑا نہیں کریں گے بلکہ سوال نہ آنے کا ڈراما رچائیں تا کہ ڈی ای او صاحب کی توجہ اس غیر معمولی حرکت کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ انھیں نالائق طلبہ سمجھ کر سوال انھی سے پوچھ لیں اور وہ انھیں جواب دینے میں کامیاب ہو جائیں تو ادارے کے بارے میں تاثر یہ جائے گا کہ اگر نالائق طلبہ کا یہ حال ہے تو باقی جو ہاتھ لہرا لہرا کر اپنی قابلیت کا اعلان کر رہے ہیں اُن کی ذہانت اور اعتماد کا معیار کیا ہوگا۔ یقیناً یہ ایک شاطرانہ چال تھی اور تجربے کی بھٹی میں پکی ہوئی سقہ بند حکمتِ عملی، ورنہ ہر کلاس کے چند ایک قابل طلبہ کے علاوہ عملی استعداد اور ذہانت میں باقی سب کورے ہی تھے اور ہاتھ کھڑا کرنے اور اسے فضا میں لہرانے کے علاوہ وہ کوئی بھی کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگلے پندرہ دنوں میں سالانہ معائنہ کے انعقاد کو کامیاب بنانے کے لیے بہت کام ہوا حتیٰ کہ سکول کے مین گیٹ پر کیلے کے درخت کاٹ کر نصب کیے گئے اور مہمان ذی وقار کی عین آمد پر کبوتر ہوا میں چھوڑنے کا بندوبست بھی کر لیا گیا۔ آئے روز ڈی ای او صاحب کے من پسند کھانوں کا پتہ لگایا جاتا رہا اور پھر وہ دن بھی آ گیا جس کا ہمیں شدت سے انتظار تھا۔ سکول کے معائنے کو کامیاب بنانے میں ہمارے جملہ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی عاجزی، تابعداری اور مرغن کھانوں پر مبنی ضیافت نے اہم

کردار ادا کیا اور ڈی ای او صاحب نہایت خوش وخرم واپس لوٹے۔ یوں زمانۂ طالب علمی کے پہلے مہمانِ خصوصی، اس کی شان وشوکت، وجاہت، تمکنت اور پروٹوکول کو دیکھ کر میرے دل میں بھی اس خواہش نے ڈیرے ڈال لیے کہ وہ دن کب آئے گا کہ میری آمد اور استقبال کی تیاری بھی اسی شد و مد سے ہو اور اس سے بڑھ کر مرغن کھانوں پر مبنی ضیافت کا اہتمام بھی ہو تو وارے نیارے ہو جائیں۔

پھر گورنمنٹ کالج لاہور کا زمانہ طالب علمی آیا تو یہاں آئے روز کسی نہ کسی مہمانِ خصوصی کی آمد ہوتی جن میں صوبائی اور وفاقی وزرا، گورنر پنجاب، قومی کھلاڑی، شعرا اور ادیب، ڈراما نگار اور ٹیلی ویژن کے اداکار شامل تھے۔ یوں اُن کے استقبال اور پروٹوکول میں گل پاشی، پھولوں کے ہار، استقبالیہ بینرز اور تعریفی الفاظ کا چناؤ دیکھ کر دل میں خواہش رقص کرنے لگتی اور ہم حسرت سے اُن قابلِ قدر ہستیوں کو تکتے رہتے۔ سر فضل حسین ریڈنگ روم اور بخاری آڈیٹوریم میں طرح طرح کی رنگا رنگ تقریبات منعقد ہوتیں تو ان میں شریک مہمانانِ گرامی کی اکثریت اُن شخصیات کی ہوتی جو عام طور پر ٹی وی پر نظر آتے تھے تو دل میں کچھ بڑا کرنے اور نمایاں مقام پر پہنچنے کی آرزو مزید مضبوط ہو جاتی۔ کالج کی ایک سو پچیس سالہ تقریبات بڑی شاندار تیاریوں کے ساتھ منعقد کی گئیں تو ان دنوں مہمانوں کا میلہ سجا رہا۔ ہر لمحے نئی شخصیات، نیا چہرہ اور نیا مہمانِ خصوصی تو یوں لگتا کہ دُنیا صرف خاص لوگوں کے پروٹوکول کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور عوام تو محض تالیاں بجانے اور واہ واہ کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ مگر جوں جوں ماہ وسال کا سلسلہ آگے بڑھا، ہم ذہنی طور پر پختہ ہونے لگے اور زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوئے تو معلوم ہوا کہ مہمانِ خصوصی بننا اتنا آسان کام نہیں بلکہ اس مقام کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور شبانہ روز کاوشوں کا ثمر بھی۔

گزشتہ دو دہائیوں سے درجنوں تقریبات میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کا موقع ملا اور سرکاری، غیر سرکاری پروٹوکول سے استفادہ بھی ہوا تو پتہ چلا کہ مہمانِ خصوصی اور دلہا میں کئی قدریں

مشترک ہیں۔ دونوں تقریب میں شریک ہر فرد کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں، کیمرہ لائٹس میں مرکزی حیثیت کے حامل، ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور ہوتی ہیں۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں، استقبالیہ شاندار ہوتا ہے، کئی لوگ ہاتھ ملانا سعادت سمجھتے ہیں، تصاویر اور سیلفیاں مزید اہمیت کو اجاگر کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ دونوں کو سٹیج پر مرکزی نشست پر بٹھایا جاتا ہے، دونوں ہی نہایت شرمیلے نظر آتے ہیں، زیادہ توجہ اور عزت ملنے پر کچھ کچھ حیران بھی اور پریشان بھی۔ دونوں اپنی حرکات وسکنات نپی تلی اور سوچ سمجھ کر کرتے ہیں تو کئی معاملات میں مجبورِ محض کی تصویر نظر آتے ہیں۔ سر پر کھجلی بھی کرنی پڑے تو کئی مرتبہ سوچتے ہیں کہ سامنے بیٹھے لوگ کیا کہیں گے۔ ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو اسے اٹھانے کا تکلف بھی بہت جتن سے کرتے ہیں۔

مگر مہمانِ خصوصی بننے کے سب سے بڑے نقصانات یہ ہیں کہ ایک تو اپنی آخری تقریر سے پہلے اُسے سب مقررین کی لمبی لمبی تقریریں سننا پڑتی ہیں، جاگتے رہنا پڑتا ہے بلکہ کئی مقررین کیونکہ مہمانِ خصوصی کی خاص توجہ کے لیے بار بار ان کو مخاطب کرتے رہتے ہیں تو سٹیج پر سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ سامعین کی اکثریت بالخصوص عقبی نشستوں پر براجمان لوگ اس نعمتِ خداوندی سے سرفراز ہو کر خوابِ خرگوش میں مدہوش خراٹے بھر رہے ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ بے ہودہ تقریر بھی ہو رہی ہو تو اسے بھی داد دینا پڑتی ہے کیونکہ مقرر آپ کا نام بڑے ادب سے لے لے کر آپ کو مخاطب کرتا ہے اور یہ بھی باور کرواتا ہے کہ اس نے آپ کی آخری تقریر بھی سننی ہے، لہٰذا حفظِ ما تقدم کے طور پر دادِ تحسین نہ چاہتے ہوئے بھی دینا پڑتی ہے۔ اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ صدارتی خطبے سے پہلے اس موضوع پر بہت کچھ بول دیا جاتا ہے اور مہمانِ خصوصی کے کہنے کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں اور کام کی ساری باتیں پہلے ہی کر دی جاتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چونکہ پُرتکلف کھانے اور صدارتی خطبے کے درمیان زیادہ رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی اور برتنوں کی آوازیں سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہیں، لہٰذا مہمانِ خصوصی کی بے مزہ گفتگو میں دلچسپی کم ہی رہ جاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات کھانا لگتے ہی آخری نشستوں پر بیٹھے

سامعین اٹھ کر سلاد پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر لیتے ہیں تو مجبوراً مہمانِ خصوصی کو اپنا عالمانہ خطبہ ختم کرنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کھانا ختم ہو جائے اور وہ بھوکا گھر واپس جائے۔

اپنے محسن و مربی پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی ''مہمانِ خصوصی'' کے تصور اور تعریف دونوں سے سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ''یہ دُنیاوی جاہ و حشم، مقام و مرتبہ، سیاسی و سماجی شان و شوکت کسی کو خاص بنانے کے لیے کافی نہیں بلکہ یہ دُنیاداری، ریاکاری اور فریبِ نظر سے زیادہ کچھ نہیں۔ خاص تو وہی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا، پرہیز گاری میں ربِ کائنات کے حضور جھک گیا اور خوشنودیٔ الٰہی کے حصول کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ وہ اس جہاں میں خاص ہے اور اگلے جہاں میں کامیاب۔ یہ خاص و عام کی تقسیم وسائل کے ارتکاز اور بندر بانٹ کی پیداوار ہے اور محض دھوکا ہے۔'' علامہ اقبال نے بھی تو کہا ہے...

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

□□□

خوشحال کسان، خودمختار پاکستان

بلاشبہ کسبِ حلال کمانے والا اللہ کا دوست ہے اور محنت کش کے مٹی آلود ہاتھ خالقِ کائنات کو بہت پسند ہیں۔ حلال ذرائع سے رزق کمانا مشکل کام ہے شاید اسی لیے لوگ آسان راستہ تلاش کرتے ہیں اور مشقت سے کنی کتراتے ہیں۔ البتہ ہمارے کسان اپنی شبانہ روز محنت سے زمین سے سونا پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ کھیت کھلیان سے عشق میں مبتلا ہیں۔ اس نہ ختم ہونے والے رومان کی وجہ سے وہ مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر اس میں سے اپنے اور اہل خانہ کے لیے سامانِ رزق تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف دیہی آبادی کا پیٹ پالنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں بلکہ شہری آبادی کی غذائی ضروریات بھی پورا کرتے ہیں۔ وسطی پنجاب کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولنے اور ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں حاصل کرنے کے سبب میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسبِ حلال کے ذرائع میں سے سب سے مشکل اور کٹھن ذریعۂ معاش زراعت ہے۔ ہماری زرعی معیشت زمین سے جڑی ہوئی ہے جہاں بچے، بوڑھے، مرد اور خواتین سب مل کر سخت مشقت سے دو وقت کی روٹی کماتے ہیں۔ موسم کی شدت سے بے نیاز ہو کر دسمبر کی سرد ترین راتوں

ہیں کسان برفیلے پانیوں میں اتر کر اپنے کھیت سیراب کرتا ہے اور کڑکتی دھوپ میں بھی وہ کھیتی باڑی میں مسلسل مشغول نظر آتا ہے۔ فصلوں کی بوائی ہو یا کٹائی، وہ جہدِ مسلسل، عملِ پیہم اور یقینِ محکم کی عملی تصویر بن کر ہر دم مصروف دکھائی دیتا ہے۔ خواتین اس سارے عمل میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ کھانا پکانے سے لے کر گھر کے دیگر کاموں کے علاوہ وہ کھیتی باڑی میں بھی مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ گھریلو اخراجات اور روز مرہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ مرغیاں اور بکریاں پالتی ہیں، انڈے اور دودھ بیچ کر نقد رقم کا بندوبست یقینی بناتی ہیں۔ وہ سال بھر اپنی سبزیاں خود اگاتی ہیں اور اس طرح مردوں پر اضافی معاشی بوجھ نہیں پڑنے دیتیں۔

آج بھی پاکستان کی آبادی کی واضح اکثریت دیہات میں مقیم ہے اور اس کی ورک فورس کا دو تہائی حصہ براہِ راست یا بالواسطہ زراعت سے ہی وابستہ ہے۔ شعبۂ زراعت اور لائیو سٹاک مل کر ہماری مجموعی پیداوار میں ایک تہائی حصہ ڈالتے ہیں۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تمام تر شہری ترقی اور صنعتی انقلاب کے باوجود ہماری معیشت میں زراعت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب بھی پاکستان کے معاشی حالات بحرانی کیفیت سے دوچار ہوں تو ہمارے خود ساختہ مبصرین اور سوشل میڈیا دانشور پاکستانی معیشت کو دیوالیہ قرار دینے میں پل بھر کی بھی دیر نہیں لگاتے۔

مختلف چینلز پر سنسنی خیز اور ہیجان آمیز بیانات میں ملک کو معاشی دیوالیہ کہنے والے صاحبانِ یقیناً ہمارے محنت کش کسانوں کے اپنی مٹی کے ساتھ جڑے رومان سے لاعلم ہیں۔ انھیں کہاں معلوم کہ جب تک ہمارے کھیت کھلیان سرسبز ہیں، زرعی اجناس کی پیداوار جاری ہے اور اشیائے خورد ونوش میسر ہیں، پاکستان میں معاشی بحران تو آ سکتا ہے، خدانخواستہ دیوالیہ ہونے کی صورتِ حال کبھی پیش نہ آئے گی۔ تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے کسان بھائیوں کے اَن گنت مسائل کے حل اور بے پناہ مشکلات کے ازالے کے لیے کبھی بھی کوئی تسلی بخش اقدامات نہیں کیے گئے بلکہ ان کے ساتھ مسلسل ظلم و زیادتی کا سلوک روا رکھا گیا اور ان کے استحصال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔

جو افراد دیہی معاشرے کے رہن سہن سے آگاہ ہیں یا دیہات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ یقیناً گواہ ہیں کہ کس طرح کسان رات کو سانپوں اور بچھوؤں سے لڑائی لڑ کر اپنی فصلوں کو پانی لگاتا ہے اور ویرانے میں موجود اپنے جانوروں کی حفاظت کے لیے اللہ پر توکل کر کے سو جاتا ہے۔ مرغوں کی اذان کے ساتھ صبحِ کاذب کے وقت ایک مرتبہ پھر یقینِ کامل اور امیدِ واثق کا استعارہ بن کر ایک نئی صبح کا آغاز کرتا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ نہ تو اسے اس کے خوابوں کی تعبیر مل پاتی ہے اور نہ ہی اس کی فصلِ گل میں خوشیوں کے پھول کھل پاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باغِ تمنا میں نت نئی آرزوؤں کے بیج بوتا ہے مگر اس کی معاشی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔ ہم سب بخوبی آگاہ ہیں کہ نہ تو اسے اس کی فصل کی پوری قیمت وصول ہوتی ہے اور نہ ہی وقت پر ادائیگی ہو پاتی ہے۔ اس کی محنت کا ثمر کھانے والے آڑھتی اور بیوپاری کروڑوں پتی بن جاتے ہیں مگر اس غریب کے دن نہیں پھرتے اور نہ ہی مالی آسودگی اس کے گھر کا رخ کرتی ہے۔ یوں مڈل مین ہی ساہوکار بن جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے کسان کو لوٹ کر خود مالا مال ہو جاتا ہے۔

اکثر آڑھتی حضرات نے اجناس خریدنے کے ساتھ ساتھ کھاد، بیج اور زرعی ادویات کا کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے۔ وہ ایک طرف تو زرعی اجناس کا سٹاک خرید لیتے ہیں اور دوسری طرف نقد ادائیگی کے بجائے کسان کو اگلی فصل کے لیے درکار کھاد، بیج اور زرعی ادویات بیچ کر خطیر منافع کما لیتے ہیں۔ اس طرح وہ بے بس اور لاچار محنت کش کسانوں کو اپنے معاشی جال میں بری طرح جکڑ کر اس کا مسلسل استحصال کرتے رہتے ہیں اور حکومت تماشائی بن کر اس لوٹ کھسوٹ کے عمل کی بیخ کنی نہیں کر پاتی اور نہ ہی کسان کو مڈل مین کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے کوئی قابلِ عمل پروگرام یا منصوبہ شروع کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کسان جہاں پچاس سال پہلے کھڑے تھے، آج بھی وہیں نظر آتے ہیں۔

یہ خوش آئند امر ہے کہ موجودہ حکومت نے کسان کے استحصال کی روک تھام کا اصولی فیصلہ کر لیا ہے اور اسے مڈل مین کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے اک مربوط حکمتِ عملی وضع

کر کے ٹھوس اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ چینی مافیا کے خلاف کارروائی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس طاقتور طبقے سے نمٹنے کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملا ہے۔ اس حکومتی فیصلے کا براہِ راست فائدہ گنے کی فصل کی پوری قیمت اور بروقت ادائیگی کی شکل میں ہوا جس سے ہمارے کسان بھائیوں کو خاطر خواہ منافع بھی ہوا اور یکمشت نقد رقم ہاتھ لگی جو اس کی خوشحالی اور مالی آسودگی کے سفر کا آغاز ہے۔ چند ہفتے قبل وزیراعظم سے کسانوں کے نمائندہ وفد نے ملاقات کی جنھوں نے حکومتی اقدامات پر وزیراعظم کا شکریہ ادا کیا۔ وفد کے ارکان نے تسلیم کیا کہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار وہ وزیراعظم ہاؤس مدعو کیے گئے اور اُن کے دیرینہ مسائل کے حل پر حکومتی توجہ مبذول نظر آتی ہے۔ حالیہ بجٹ میں بھی کسانوں کو زرعی آلات، کھاد اور بیج کے حصول کے لیے بلاسود قرضوں کی فراہمی کے لیے خطیر رقم مختص کی گئی ہے اور بینکنگ سیکٹر کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات جاری کر دی گئی ہیں تاکہ کسانوں تک اس سہولت کو بلاامتیاز پہنچانے میں وہ بھی اپنا کردار ادا کریں۔ یہ اقدامات کسان کو مالی طور پر خودمختار بنانے اور مڈل مین کے معاشی استحصال سے آزاد کرانے کے لیے یقیناً کارگر ثابت ہوں گے جس سے ملکی معیشت میں زرعی شعبے کا کردار بڑھے گا اور ہمارا ملک نہ صرف فوڈ سکیورٹی کو یقینی بنا سکے گا بلکہ زرعی اجناس کو برآمد کر کے قیمتی زرِ مبادلہ بھی کما سکے گا اور خوشحالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ دُنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک ملکی وسائل کا خطیر حصہ نچلے طبقے کے مالی تحفظ پر خرچ کرتے ہیں۔ وقت آن پہنچا ہے کہ دیہی آبادی کی مالی آسودگی اور معاشی تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ آسان قرضوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ کسان کی اجناس اور لائیو سٹاک کو انشورنس کے ذریعے محفوظ بنایا جائے تاکہ قدرتی آفات، موسم کی بے رحمی اور بیماریوں سے ہونے والے قابلِ تلافی نقصان کا ازالہ ممکن بنایا جا سکے۔ ہمارے حکومتی ایوانوں اور پالیسی ساز اداروں کے ذمہ داران اس بات کا ادراک کر لیں کہ خوشحال کسان ہی خودمختار پاکستان کا ضامن بن سکتا

ہے ورنہ ہم کشکول لیے در بدر بھٹکتے اور معاشی خودمختاری عالمی مالی اداروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور رہیں گے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بہت پہلے کہا تھا...

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن

❑❑❑
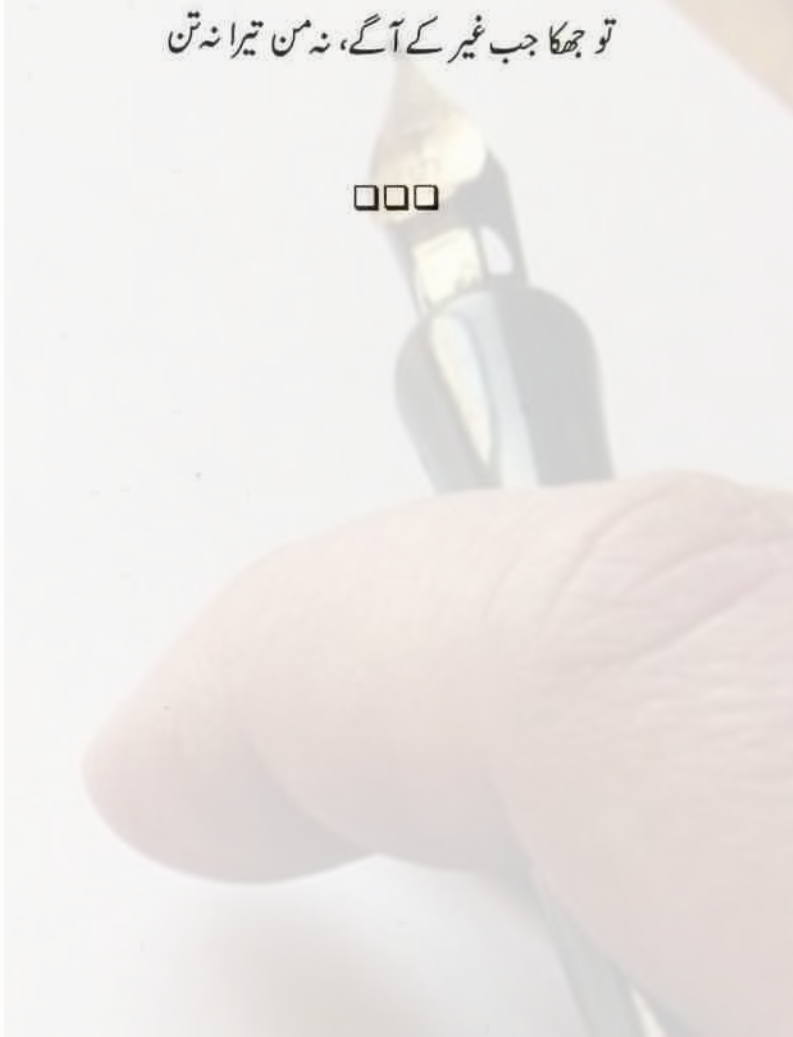
گریباں چاک

انسانی رویوں کی داستانیں تاریخ کے اوراق میں درج ہیں مگر افسوس کہ ہم تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ اگر انسانی تاریخ کا عمیق جائزہ لیا جائے تو انسان نے دنیا کو علوم وفنون، ادب، انجینئرنگ، طب، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب وتمدن کا ایسا متنوع ورثہ عطا کیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں قوموں نے مختلف علوم وفنون کی طرح ڈالی، جدید و قدیم کے امتزاج سے معاشرہ اور معاشرتی ادارے متعارف ہوئے۔ بنی نوعِ انسان نے آئین و قانون بنا کر مہذب معاشروں کی بنیاد رکھی۔ یہ ہمارے اسلاف ہی تھے جنھوں نے جدید علوم متعارف کرائے۔ سقوطِ قرطبہ کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، علومِ مشرق اور علومِ مغرب۔ الفارابی اور بوعلی سینا سائنس، طبیعات، کیمیا اور علمِ ریاضی وفلسفہ کے علمبردار بنے اور انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اولین ترجیح بنایا۔ تحقیقاتی کتب کا خزانہ سپین کی لائبریری سے سمیٹ لیا گیا اور مشرقی علوم وفنون میں امام غزالی اور ابن خلدون کے نظریات کو اپنی زندگیوں میں قابلِ تقلید بنا لیا گیا۔ دنیا ارتقا کے راستے پر گامزن رہی، معاشی اور اقتصادی نظام وجود میں آیا۔ انسان نے

بھوک، بیماری، موسموں کی شدت اور باہمی اختلافات یہاں تک کہ عالمی جنگیں اور ایٹمی حملے تک سہے۔ ادوارِ زمانہ میں خوشی اور غم کا ایک حسین امتزاج رہا۔ آپسی تعلقات کی نوعیت بھی اسی طرح متاثر ہوتی رہی اور اب ہم تاریخ کے دھارے پر سفر کرتے ہوئے انتہائی ترقی یافتہ دور میں آن پہنچے ہیں جہاں سائنسی ایجادات اور دریافتیں بامِ عروج پر ہیں۔ ذرائع رسائل وابلاغ ترقی کی انتہا کو چھو رہے ہیں اور دنیا سمٹ کر موبائل فون کی چپ میں آ گئی ہے مگر یہ شاید انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ حسد و رقابت جیسے منفی رجحان اور اثرات کو قابو کرنے میں اکثر توازن کھو دیتا ہے۔ جب معاشرہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا تو بے شمار مسائل میں گھر جاتا ہے۔ ان مسائل میں بڑا مسئلہ علم وفہم کا فقدان اور صبر وتحمل جیسے اعلیٰ وارفع اوصاف کی کمیابی ہے۔ بدقسمتی سے عدم برداشت وہ زہرِ قاتل ہے جس نے پاکستانی معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ سوچ وفکر، نظریاتی اختلافات، فکری مباحث، دوسرے کی رائے کا احترام، مذہبی رواداری اور جہالت کے سبب پاکستان کے شہری اپنی معاشرتی زندگی میں عدم تحفظ اور انحطاط کا شکار ہو رہے ہیں۔

یہ ایک خوفناک رویہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ اہم بات یہ ہے اسے تبدیل کیسے کیا جائے، اس کی شدت میں کمی کیسے لائی جائے، انتہا پسندانہ سوچ کو کس طرح اعتدال پسندی کی جانب موڑا جائے؟ جتنی بھی جسمانی بیماریاں ہیں ان کی علامات اور مختلف تحقیقاتی مراحل سے گزار کر تشخیص کی جاتی ہے مگر روحانی اور نفسیاتی مسائل معاشرتی رویوں اور گھریلو ماحول کے سبب جنم لیتے ہیں۔ پہلی چیز موروثیت ہے، پھر ماحول اور ناہموار رویے، معاشرتی وطبقاتی کشمکش، غیر منصفانہ برتاؤ، اقتصادیات، تربیت کا فقدان، خوف، بھوک، معاشی عدم مساوات اور دیگر بے شمار نامساعد حالات۔ بچہ ماں باپ سے سیکھتا ہے یا خاندان سے۔ اگر گھر میں اونچی آواز سے بات کرنے کا چلن ہو اور آداب کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا جاتا ہو تو وہی بچہ جب معاشرے میں نکلے گا تو چیخ کر بات کرے گا کیونکہ اس نے ایسا ہی دیکھا اور یہی سیکھا ہے۔ سقراط کی درسگاہ کا پہلا اصول ہی برداشت تھا۔ ایک خاص حد تک آواز کو بلند کرنے کو برداشت کیا جا سکتا

ہے مگر ہاتھ اور بات میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اگر ماضی قریب میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو ذہن میں لایا جائے تو موٹروے سانحے میں ملوث پسماندہ ذہن اور جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سفاک درندے، مینارِ پاکستان والے واقعے میں، مشہور ہونے کی کوشش میں مصروف عقل و دانش سے عاری ٹک ٹاکر، کبھی مندر گرانے کی کوشش، کہیں مسجد اور گوردوارے میں نامناسب فوٹوگرافی اور اب سیالکوٹ کا اندوہناک واقعہ، یہ ہمارے معاشرے کی چند قابلِ نفرت مثالیں ہیں جو اجتماعی معاشرتی کردار کو مسخ کرنے کا سبب بنی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ سوچ کا دھارا تبدیل کرنے کا فکری عمل شروع کیا جائے اور بوسیدہ تعلیمی نظام کو بہتر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں جو فہم وفراست، فکر اور مقصدِ حیات کو سمجھنے اور سیکھنے میں مددگار ہوں۔ یہ کوئی مشکل عمل نہیں۔ مذہبی رواداری اور اس کی عملی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

شیخ سعدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ غلہ فروش کی دکان سے غلہ خرید کر لائے۔ گھر آ کر دیکھا کہ ایک چیونٹی بھی ساتھ آ گئی ہے۔ آپ کا دل بے قرار ہو گیا کہ میری وجہ سے یہ چیونٹی بے گھر ہو گئی ہے چنانچہ وہ چیونٹی کو پکڑ کر دکان پر چھوڑ آئے۔ مخلوقِ خدا کو تکلیف پہنچانا، اذیت سے دوچار کرنا، کسی بھی مذہب اور معاشرے میں روا نہیں۔ اشفاق احمد فرماتے ہیں کہ عظیم ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مشکل ترین لمحات میں کڑواہٹ کا مزہ چکھنے کے باوجود بھی خود کڑوے نہیں ہوتے۔ زندگی انھی لوگوں کی وجہ سے خوبصورت لگتی ہے۔ امریکا کے شہر بوسٹن کے مرکزی علاقے میں کیتھیڈرل چرچ آف سینٹ پال ہے۔ اس کی وجہِ شہرت اس کی تاریخ نہیں بلکہ وہ رشتہ ہے جو پچھلے بیس سالوں سے یہاں کے لوگوں نے آپس میں بنا رکھا ہے۔ یہاں کی مقامی یونیورسٹیوں کی مسلمان کمیونٹی کو باجماعت نماز کے لیے کوشش کے باوجود جگہ نہ مل سکی تو چرچ کے منتظمین سے رابطہ کیا گیا۔ انھوں نے بخوشی اس مطالبے کو مان لیا۔ خاص بات یہ کہ اس چرچ میں عبادت کے لیے بینچ فکس نہیں ہیں جیسے دیگر گرجا گھروں میں نصب ہوتے ہیں۔ مسلمان جب نماز کے لیے آئیں تو

صفیں بچھا لیتے ہیں اور عیسائی جب آتے ہیں تو اپنی کرسیاں لگا کر عبادت کرتے ہیں۔ چرچ انتظامیہ نے یہ کہہ کر اجازت دی کہ ہم اور آپ ایک ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو کیوں نا دونوں کو اجازت ہو کہ رب کی عبادت کریں۔ اسی طرح چند برس پہلے برطانیہ کے شہر برمنگھم میں کچھ نوجوانوں نے مشہور برانڈز کے آؤٹ لیٹس پر کپڑے، جوتے اور دیگر استعمال کی اشیا لوٹ لیں۔ وہ بچے لوٹا ہوا مال جب گھروں میں لے کر گئے تو والدین نے ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تمام اشیا مقامی کونسل کے حوالے کر دیں۔ بات یہاں ختم نہیں ہوئی، تھنک ٹینک سوچ بچار کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ برطانیہ کے نظامِ تعلیم، نصاب، اساتذہ، معاشرتی سوچ اور عمل کے ساتھ ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور قیمتوں کو نیچے لانے کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ یہ اشیا ہر سطح کے معاشی درجے کے لوگوں کی قوتِ خرید میں آسکیں اور اس طرح معاشرے کو مایوسی اور معاشی محرومی کے تصورات سے بچایا جا سکے۔

لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ اپنی اپنی ذمہ داری کو سمجھا اور محسوس کیا جائے۔ مسائل ہمارے پیدا کردہ ہیں تو حل بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ ہر فرد کو اپنے آپ کو بدلنا کو ہے، دوسرے کو نہیں۔ جھوٹی اَنا، جھوٹے وقار، مصنوعی عزت، مرتبہ، حرص اور کرپشن سے معاشرے کھوکھلے ہوتے ہیں، انتہا پسندی، دراصل خودغرضی اور بے حسی کی علامت ہے۔ ذات اور پست خیالات سے ابھر کر باہر کی دنیا سے مطابقت رکھنے کے لیے معتدل ماحول اور متوازن سماج کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔

حکومت، سیاسی جماعتوں، ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور مذہبی و دینی گروپس کے ساتھ ساتھ والدین، خاندان اور بین الاقوامی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی شدت سے ضرورت ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ بچوں کی تربیت میں خاندانی روایات، رکھ رکھاؤ، ایثار، قربانی، خدمت، محبت، مہمان نوازی اور مدد جیسی روایات کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ جدت پسندی کے ساتھ تربیت اور رواداری کا بھی درس دیا جائے گا تو شدت پسندی اور عدم برداشت کے

رویوں میں بتدریج کمی واقع ہوتی جائے گی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم فکرِ اقبال سے رہنمائی حاصل کریں، یہ شعر ہمیں خصوصی طور پر اپنا گریباں چاک کرنے پر اکساتا ہے:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

□□□
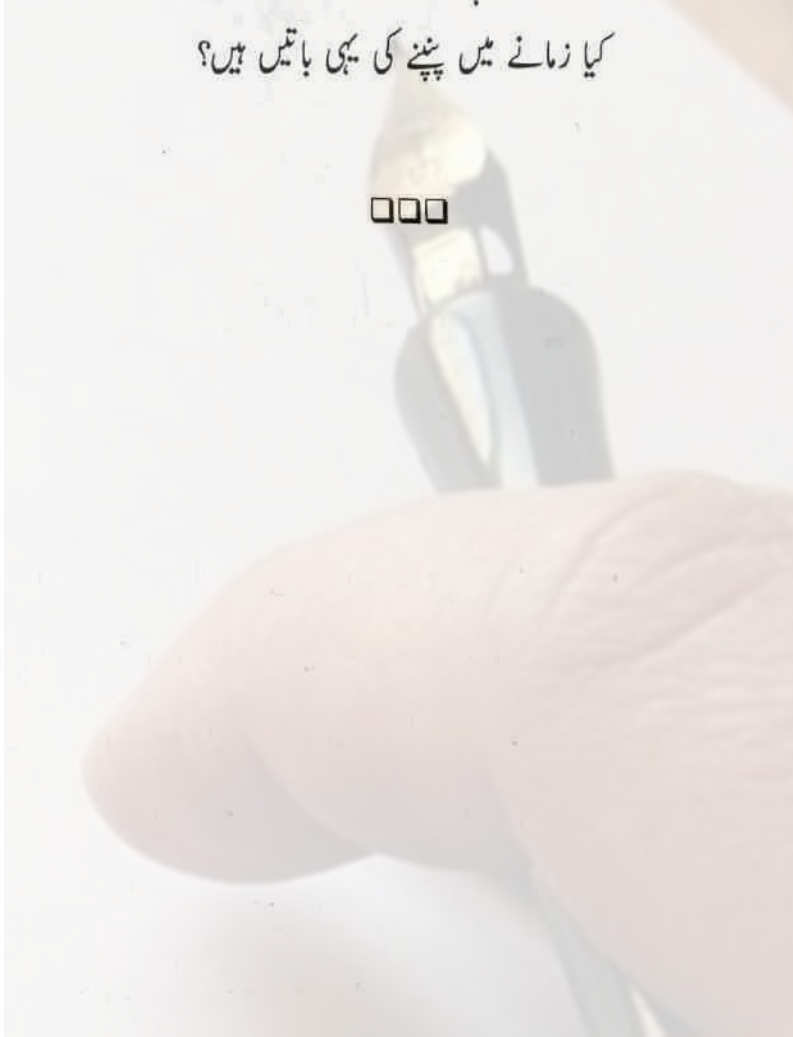
دھرتی ماں کے بیٹے

درختوں کی طرح انسان بھی زمین ہی سے نمو پاتے، پھلتے اور پھولتے ہیں اور اس مٹی سے سامانِ رزق پا کر تناور اور طاقتور درخت بن کر چمنِ زیست میں رنگِ بہار نمایاں کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ انسان کی جڑیں بھی زیرِ زمین گہرے پاتالوں میں پھیل جاتی ہیں اور اسی لیے زمین کی کوکھ سے اس کا رشتہ خاصا گہرا ہوتا ہے۔ درختوں کی طرح انسان بھی پھل، پھول اور سایے کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں اور خود کڑکتی دھوپ میں جل کر دوسروں کے لیے راحت، سکون اور آسائش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ زمین سے جڑے ہوئے لوگ فطرت کی بانہوں میں اٹھکیلیاں کرتے ہیں، پنپتے ہیں اور بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کے قریب رہنے والے درخت پھلوں سے لاد دیئے جاتے ہیں اور ان کی ہر شاخ پر انعاماتِ خداوندی کی بارش ہوتی ہے مگر کئی درخت بانجھ بھی ہوتے ہیں۔ بظاہر قد کاٹھ میں آسمان کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں لیکن نہ ان پر پھول لگتے ہیں اور نہ ہی پھل حتیٰ کہ اُن کے پاس سایے کی نعمت بھی نہیں ہوتی۔ وہ بدنصیب درخت جو زمین سے اپنا تعلق مضبوط نہیں بنا پاتے، تند و تیز ہوا کے جھونکے اکثر ان کی شاخوں کو توڑ دیتے

ہیں، کئی مرتبہ طوفان انھیں جڑوں سے ہی اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ گرے ہوئے درخت کو کاٹ کر ایندھن میں جلا دیا جاتا ہے اور پھر اس کی راکھ ہواؤں میں اڑ کر فضاؤں میں بکھر جاتی ہے اور اس طرح اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر مٹ جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک قول ہے کہ زمین کے قریب رہو کیونکہ زمین پر بیٹھا ہوا شخص گر بھی پڑے تو اسے چوٹ کم لگتی ہے۔

ہم اپنے اردگرد مختلف انواع کے لوگ دیکھتے ہیں۔ کئی پھلدار بھی ہیں اور پھولوں سے مزین بھی، گھنے اتنے کہ ٹھنڈی چھاؤں کی نعمت سے سرفراز اور دوسروں کے لیے سامانِ راحت۔ گفتگو کریں تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں، ماحول معطر ہو جاتا ہے۔ وہ چلیں تو زمانہ ان کے نقشِ قدم کو اپنے لیے نشانِ منزل بنا لیتا ہے۔ اُن کے ہونے سے لوگوں کی زندگیاں بدلتی ہیں، خوشیاں رقص کرتی ہیں اور خوشحالی عام ہوتی ہے اور اُن کے فیض سے ہر خاص و عام فیضیاب ہوتا ہے۔ وہ خیر بانٹتے ہیں، خیر مانگتے ہیں اور صحیح معنوں میں فرشتوں سے بڑھ کر انسان بن کر اپنے قول و فعل سے کائنات کی مانگ میں رنگ بھرتے ہیں۔ یہ مقامِ فیض، یہ صبر و رضا کی نعمت، یہ عجز و انکسار کا انعام ربِ کائنات انھیں ان کے اخلاص، سچائی اور اخلاق کے طفیل عطا کرتا ہے جو انھیں لوگوں کے اور قریب کر دیتا ہے۔ وہ انعاماتِ الٰہی سے سرشار ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت میں مزید جُت جاتے ہیں، زیادہ جھک جاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کے لیے آسانیاں تقسیم کرنا اُن کی زندگی کا واحد مقصد بن جاتا ہے۔ وہ دراصل اپنی دھرتی ماں کے سچے اور سُچے بیٹے بن کر اپنی ماں کا قرض چکانے کی حتی المقدور کوشش کرنے میں مگن ہو جاتے ہیں اور انھی کے دم سے گلشنِ حیات میں بہار ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہشات، ذاتی طمع و لالچ اور خود غرضی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہی کردار انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور وہ انسانوں کی بھیڑ میں یکتا ہو جاتے ہیں۔

ہمارے آس پاس پھیلے ایسے لوگ نظامِ کائنات میں اپنا غیر معمولی حصہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ یہ کوئی آسمان سے اتری مخلوق نہیں بلکہ عام لوگ ہیں مگر اپنے منفرد کام کی وجہ سے خاص ہو

جاتے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں یہ ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستہ یہ لوگ تنخواہ کو اپنے لیے سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں اور پوری طاقت، توجہ اور دیانت سے اپنے طلبہ و طالبات کے روشن مستقبل کو سنوارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یہ بغیر اضافی فیس کے، کمزور شاگردوں کو اضافی وقت دیتے ہیں اور ان پر زیادہ توجہ دے کر انھیں بھی کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بےلوث لوگ حرص و ہوس سے بالاتر ہوتے ہیں۔

شعبۂ طب سے وابستہ ہوں تو یہ غریبوں، بےنواؤں، بےکسوں، یتیموں اور بیواؤں سے فیس نہیں لیتے، ان کا مفت علاج و معالجہ کرنا اپنے لیے باعثِ سعادت گردانتے ہیں۔ یہ جعلی ادویات نہیں بیچتے اور نہ ہی پانی والے ٹیکے لگاتے ہیں۔ یہ خواہ مخواہ ہزاروں روپے کے ٹیسٹ نہیں کرواتے اور نہ ہی مریضوں کو مخصوص لیبارٹری سے خریداری پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ لوگ وکیل ہوں تو غریبوں کے کیس مفت لڑتے ہیں اور ان کے حقوق کے تحفظ اور جائز معاملات کو قانونی پیچیدگیوں سے نکال کر اُن کے لیے عدالتی انصاف کا حصول ممکن بنانے میں اپنی پوری طاقت لگا دیتے ہیں۔ یہ سرکاری نوکری میں ہوں تو اپنی تنخواہ اور دیگر مراعات کے علاوہ کسی کی جیب پر نہ نظر رکھتے ہیں اور نہ ہی حرام کا نوالہ اپنے یا اپنے بچوں کے منہ میں ڈالتے ہیں۔ یہ تھوڑے پر خوش ہو جانے والے، رزقِ حلال سے مالا مال اور قناعت پسندی سے آسودہ حال رہتے ہیں۔ یہ اپنے فرائضِ منصبی صرف ذمہ داری نہیں بلکہ عبادت سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ یہ خیر کی خیرات بانٹتے ہیں۔ یہی غیرت مند بیٹے جب وردی پہن لیں تو وطنِ عزیز کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال بن جاتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ بانجھ درخت، وہ بدنصیب لوگ ہیں جنھیں نہ خیر بانٹنے کی توفیق ملی اور نہ ہی لوگوں کے لیے آسانیاں تقسیم کرنے کی ہمت ہوئی۔ یہ ہمیشہ ذاتی طمع و لالچ کے گرداب میں پھنسے رہے، اکثر وہ حرص و ہوس کی دلدل میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ لوٹ کھسوٹ کو اپنا وطیرہ بنا لیتے

ہیں، پرائے مال پر اپنا حق جتاتے ہیں اور کمزوروں اور بے بسوں پر چڑھ دوڑنا ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ یہ اس فانی زندگی کو اصل حیات سمجھ بیٹھتے ہیں اور منافع خوری سے لے کر ذخیرہ اندوزی تک، چور بازاری سے لے کر ملاوٹ ورشوت ستانی تک، بھتہ خوری اور گراں فروشی سے لے کر ضمیر فروشی تک، یہ کردار کی پستیوں کی نچلی ترین گہرائیوں میں گرنے پر فخر کرتے ہیں۔ مکر وفریب کے تمام ہتھکنڈے آزمانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن جاتا ہے۔ نہ ان کے شر سے اپنے محفوظ رہ پاتے ہیں اور نہ ان کی شیطانی چالوں سے غیر بچ پاتے ہیں مگر آخر میں یہ لوگ دوسروں کے لیے ایک عبرت آموز مثال بن کر رہ جاتے ہیں۔

اپنی دھرتی کا قرض اتارنے، وطنِ عزیز سے محبت کرنے اور اپنے پیارے ملک سے اپنا پیار مزید گہرا کرنے کے کئی انداز ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں پہلو اس کی خوشحالی، خودداری اور خودمختاری میں اپنے حصے، اپنی آمدن اور ذرائع کے مطابق بروقت اور پورا ٹیکس ادا کرنا ہے۔ وطن سے محبت کا یہ انداز دراصل اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس ملک نے ہمیں شناخت دی ہے اور یہی دُنیا بھر میں ہمارا پہلا اور آخری ٹھکانہ ہے۔ ہماری جیب میں موجود شناختی کارڈ اور پاسپورٹ اسی کا دیا ہوا تحفہ ہے اور اس پاسپورٹ کی عزت وآبرو میں اضافہ تبھی ممکن ہے جب ہمارا ملک معاشی طور پر خوشحال ہو جائے اور اندرونی و بیرونی قرضوں کے بوجھ سے نکل کر اپنے سیاسی و معاشی فیصلے خود کرنے کے قابل بن جائے۔ اس سب کا دارومدار ہماری جانب سے ٹیکس کی ادائیگی پر ہے۔

آیئے! اس دھرتی ماں کا قرض چکانے کے لیے اس کے سچے بیٹے بن کر اس کی تعمیر وترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے سبز ہلالی پرچم کو اقوامِ عالم میں سربلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قومی خزانے میں اپنا حصہ ڈالیں۔ ہمارا دیا ہوا ٹیکس ہی ہمارے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود، تعلیم، علاج معالجہ اور سہولتوں پر خرچ ہوتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہوگا جب ہم سب دینے والا ہاتھ آگے بڑھائیں اور قومی خزانے کو بھرنے میں اپنا اپنا حصہ ڈالیں۔ وطن سے محبت ہمارا آئینی فرض بھی

ہے اور قومی غیرت کا تقاضا بھی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے بغیر تو ہم سب مٹی کی مورتیں ہیں اور بقول شاعر...

مٹی کی مورتوں کا ہے میلہ لگا ہوا
آنکھیں تلاش کرتی ہیں انسان کبھی کبھی

❑❑❑
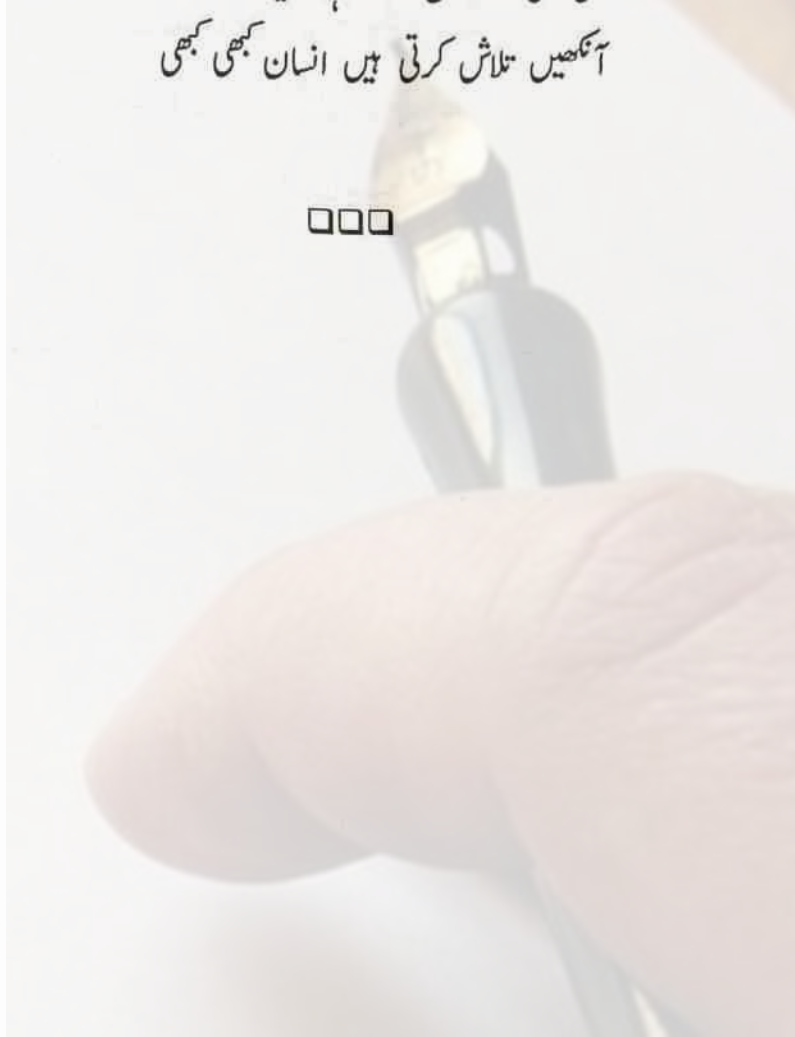
مفلسی

جب میں طفلِ مکتب تھا تو حضرت علیؓ کا یہ قولِ صادق پڑھا کہ ''غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔'' اس وقت ایامِ نادانی تھے تو لفظِ غربت کو محض مال وزر کے ترازو میں تولتا رہا۔ مالی تنگدستی اور روپے پیسے کی کمی میں ہی مفلسی نظر آئی مگر جیسے جیسے ماہ وسال کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، علمی سطح میں اضافہ ہوا اور ذہنی پختگی بھی آنے لگی۔ تجربات اور مشاہدات نے اپنا رنگ جمایا اور اس تصور کے مفاہیم اور معانی مجھ پر آشکار ہونے لگے۔ کبھی کبھی میں خود پر ہنستا کہ میں کس زاویے سے سوچ رہا تھا جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ اپنی زندگی کے تجربے کے بعد میں نے مفلسی کو ایک بالکل الگ زاویے سے دیکھا۔ عملی زندگی میں مجھے بہت سے ''مفلسوں'' سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بظاہر خوشحال، ثروت و دولت سے مالا مال مگر پھر بھی بری طرح بدحال ہیں۔ یہ سب اپنی نوعیت کے انوکھے مفلس ہیں۔ میں ان کے احوال ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھوں گا اور آپ کے دل میں ان کے لیے ہمدردی کی ہلکی سی رمق بھی پیدا نہیں ہوگی۔

میں کئی کروڑ پتی آسودہ حال کاروباری شخصیات سے واقف ہوں جن کی ماہانہ آمدنی لاکھوں میں ہے لیکن یقین جانیے کہ ان صاحبانِ خدا کے پاس اپنی اولاد کے لیے پورے دن میں تیس

منٹ تک کا وقت نکالنا بھی ناممکن ہے، نتیجتاً وہ اولاد کی محبت اور ہمدردی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بچے انھیں محض پیسہ کمانے والی مشین سمجھتے ہیں اور ان کی شکل نظر آتے ہی انھیں صرف اپنی ضروریات سے آگاہ کرتے ہیں۔ کوئی نئے موبائل فون کا مطالبہ کرتا ہے تو کسی کی نظر نئے ماڈل کی گاڑی پر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان حضرات کی اپنے بچوں سے کوئی بات چیت نہیں ہوتی۔ ایک کاروباری سا تعلق، سطحی سے جذبات اور نہایت کمزور سے معاملات ان کی زندگی کے معمولات بن جاتے ہیں۔ میں اکثر ان کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر دکھی ہوتا ہوں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ ان سے بڑا مفلس کون ہوگا جو اپنی زندگی کے سچے اور سُچے رشتوں سے محروم ہوں۔

پھر میں ایسے رشوت خور افسران سے بھی واقف ہوں جن کی جیبیں سنہری نوٹوں سے بھری رہتی ہیں اور پیٹ ایسے باہر نکل رہا ہوتا ہے جیسے جہنم کی آگ ابھی سے پیٹ میں جمع کر رکھی ہو۔ ان کے چہرے پر ایسی بے رونقی ہوتی ہے کہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بظاہر یہ کافی مال کما چکے ہوتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں یہ ایک ''کامیاب'' زندگی گزار رہے ہوتے ہیں مگر یہ ذہنی سکون اور روحانی پاکیزگی سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے، خوشیاں روٹھ جاتی ہیں اور مختلف انواع و اقسام کی پریشانیاں ان کا گھیرا تنگ کیے رکھتی ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ آپ تو کافی مال کما چکے ہوں گے اور ابھی تک مصروفِ عمل ہیں، آپ کو زندگی میں کوئی مالی پریشانی درپیش نہیں آئی اور اس لحاظ سے آپ کا شمار خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوتے ہیں کہ آئے روز ایک نیا نقصان ان کا منتظر ہوتا ہے۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ کل ایک پارٹی سے پچاسی ہزار بطور ''نذرانہ'' لیے اور آج صبح چالیس لاکھ والی گاڑی کا انجن اچانک بیکار ہو گیا۔ یہ سن کر میرے ذہن میں فوراً باباجی کی وہ بات گردش کرنے لگی ''حرام کماتے ہم ہیں اور لگواتا اللہ سائیں خود ہے اور ایسی ایسی جگہ لگوا دیتا ہے جہاں ہم ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کرنا چاہتے لیکن وہ ہماری مجبوری بنا دیتا ہے۔ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی بغیر محنت کے کمایا ہوا حرام کا مال ایسی جگہ پہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا رقم کیسے آئی اور کہاں خرچ ہوئی،

معیارِ زندگی بھی وہی رہتا ہے۔ اگر کبھی بلند بھی ہو جائے تو زندگی میں ایسی ایسی بے سکونیاں اور پریشانیاں شامل کر دی جاتی ہیں کہ انسان پناہ کی تلاش میں اجل سے جا ملتا ہے لیکن وہ پریشانیاں وہیں کی وہیں موجود رہتی ہیں۔''

اسی طرح دُنیاوی اعتبار سے مال و دولت کے انبار ہونے کے باوجود کئی حضرات اللہ تعالیٰ کی دیگر نعمتوں سے فیض یاب نہیں ہو پاتے۔ ابھی چند دن پہلے میری ملاقات بظاہر ایک روشن ستارے سے ہوئی جس کے ماتھے پر سیاہ داغ تھا جو اس کی تمام خوبصورتی پر حاوی ہو کر اسے بدنما بنا رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ سنایئے صاحب! خوب گزر رہی ہوگی۔ مال و دولت اور شہرت کی بلندی آپ کے گھر کی باندی بنی ہوئی ہے۔ یہ سن کر وہ زخمی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ اس جیسا مفلس شخص شاید ہی کوئی ہوگا۔ میں نے حیرت سے دریافت کیا ''ارے آپ اور مفلس؟'' وہ کہنے لگا کہ اس کے پاس دولت اور شہرت تو ضرور ہے مگر نیک نامی نہیں۔ مزید کہا کہ اسے سب جانتے ہیں لیکن جس حوالے سے جانتے ہیں وہ حوالہ کسی باوقار انسان کا نہیں ہو سکتا۔ منشیات کے مکروہ دھندے میں ملوث ہونے کے باعث وہ ترس گیا ہے کہ وقار اور کردار کی عظمت اس کے نصیب میں آئے، وہ جو کہے لوگ اسے حقیقت مان لیں، وہ جو کچھ کرے، لوگ اس پر واہ واہ کہہ اٹھیں اور اسے داد و تحسین دیں مگر یہ ہو نہیں سکا اور نہ ہی ہو پائے گا۔ وہ مزید کہنے لگا کہ اس کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی عزت اور نیک نامی نہیں ہے، گویا اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے اس کا غم میں ڈوبا یہ جملہ سنا تو ایک بار پھر بابا جی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی ''دولت آنی جانی شے ہے، پر عزت کے جانے کے بعد اس کی واپسی ناممکن ہے، ہر شے پر سمجھوتا ہو سکتا ہے سوائے عزت کے۔''

میں اس بدنصیب شخص کے پاس سے ایک عجب دکھ کے ساتھ اٹھا اور دل میں صد ہزار مرتبہ اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے ان لوگوں کی صف میں شامل کر رکھا ہے جن کے پاس عزت اور وقار کی انمول دولت کے بیش بہا خزانے ہیں۔ میں اس اظہارِ تشکر کے ساتھ ایک دوست

کے گھر پہنچا جو بہت بڑا زمیندار ہے اور تقریباً آدھا گاؤں اس کی ذاتی اراضی پر مشتمل ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ایک غریب رشتہ دار کی چند کنال زمین پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت یہ غاصب شخص دُنیا کا مفلس ترین آدمی محسوس ہوا جو بے پناہ دولت رکھتے ہوئے بھی کسی دوسرے کے حق پہ نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ ایک مرتبہ پھر بابا جی ذہن کے کسی گوشے میں ابھرے اور گویا ہوئے ''کسی کی جان، مال اور عزت پر شب خون مارنے والے ایک دن ذلت کے اندھیروں میں مارے جاتے ہیں اور دونوں جہاں کی رسوائی ان کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔'' یہ بات ذہن میں آتے ہی میں ایک جھرجھری لے کر اٹھا اور اس شخص کی حرص و ہوس پر کڑھتا ہوا وہاں سے چل دیا کیونکہ مجھے ایک دوست کی عیادت کے لیے ہسپتال جانا تھا۔

اب کی بار میں جس شخص کے سامنے موجود تھا اس میں ایسا کوئی عیب نہ تھا جو گزشتہ لوگوں میں موجود تھے۔ یہ ایک اعلیٰ کردار کا حامل باضمیر شخص تھا جس کے پاس رزقِ حلال وافر مقدار میں موجود تھا اور جو رشتوں کا احترام کرنا جانتا تھا، ہمہ وقت مخلوقِ خدا کو راضی کرنا اس کا مقصدِ حیات تھا، یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں جب اس سے مخاطب ہوا تو اس کی سرد آہ آسماں سے ہو کر میری سماعتوں سے ٹکرائی جو مجھے بے چین کر گئی۔ کراہتے ہوئے کہنے لگا کہ بھلا اس جیسا مفلس شخص بھی کوئی ہو گا جو ایک خیراتی ہسپتال چلا رہا ہے مگر خود ایک ایسی پُراسرار بیماری کا شکار ہو گیا ہے جس کا علاج تو کیا تشخیص تک نہیں ہو پا رہی۔ ایک بار پھر بابا جی کی آواز سنائی دی لیکن اس بار وہ روبرو موجود تھے۔ انھوں نے مریض کی تندرستی اور جلد صحت یابی کی دعا کی اور مجھے وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم ہسپتال سے نکل کر قریب ہی چائے کے ایک ڈھابے پر آ بیٹھے۔ میں نے بابا جی کی طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے دریافت کیا ''بابا جی آج کے دور میں حقیقی مفلس کون ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے ''میری نظر میں جو شخص اپنے یار کے ساتھ بیٹھ کر ہر قسم کی ذہنی فکر سے آزاد ہو کر ایک کپ چائے نہیں پی سکتا، وہ حقیقی مفلس ہے۔'' یہ سن کر میں چونک گیا کیونکہ میں بیٹھا

تو بظاہر بابا جی کے ساتھ ہوا تھا لیکن میرا مکمل دھیان موبائل فون کی سکرین کی طرف تھا۔ میں احساسِ ندامت سے پانی پانی ہوگیا، فوراً موبائل آف کر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ نظیر اکبر آبادی کا یہ شعر اس موضوع کا خوبصورت انداز میں احاطہ کرتا ہے...

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی

❑❑❑

زندگی سے ڈرتے ہو!

بس سٹاپ پر کھڑے پسینے سے شرابور ایک بیروزگار نوجوان نے اُکتائی ہوئی نظر گھڑی پر ڈالی اور بیزاری سے اُس سمت دیکھنے لگا جہاں سے مطلوبہ بس کی آمد متوقع تھی۔ یہ جولائی کا ایک گرم ترین دن تھا اور نوجوان کو انٹرویو کے لیے پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اسی اثنا میں ایک کار اس کے پاس آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے اگلا دروازہ کھولا اور نوجوان کو گاڑی میں بیٹھنے کی پیشکش کی۔ ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ اگر آپ اس نوجوان کی جگہ ہوتے تو کیا یہ آفر قبول کر لیتے؟ کیا ردِعمل ہوتا آپ کا؟ یقیناً آپ کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے! مثلاً یہاں اور بھی لوگ موجود ہیں تو یہ آفر مجھے ہی کیوں کی گئی؟ کہیں اس ہمدردی کے پیچھے کوئی مجرمانہ سوچ یا گھناؤنی سازش تو نہیں؟ آپ کے ذہن میں اغوا برائے تاوان اور انسانی سمگلنگ کے کئی قصے گھومنے لگتے اور آپ یقیناً ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو کر یہ آفر ٹھکرا دیتے لیکن اس نوجوان کا رویہ ملاحظہ کیجیے! اس نے جیب سے موبائل نکالا، گاڑی کی نمبر پلیٹ کی تصویر لی اور اسے ایک انتہائی پُراعتماد دوست کو اس پیغام کے ساتھ وٹس ایپ کر دی ''میں نے اس گاڑی میں لفٹ کی

پیشکش قبول کر لی ہے اور اب اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوں۔'' اس کار والے شخص کے مسکراتے ہوئے ہونٹ اچانک سکڑ گئے اور مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ نوجوان نے فوراً موبائل کا فرنٹ کیمرہ آن کیا اور یہ کہتے ہوئے سیلفی لینے لگا، ''انکل یہ تصویر میں فیس بک پر اَپلوڈ کر رہا ہوں کہ یہ وہ عظیم ہستی ہے جس نے مجھے اس کڑکتی دھوپ سے نجات دلا کر ایئر کنڈیشنڈ کار میں بٹھایا اور بلاغرض مجھ غریب کی مدد کی۔'' جی ضرور! لفٹ دینے والے شخص نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد نوجوان شکریہ ادا کرتا ہوا کار سے اتر گیا اور یوں اپنی ذہانت سے ایک انجانے خوف کو شکست دینے میں کامیاب رہا لیکن اگر اس کی جگہ میں اور آپ ہوتے تو شاید بس کا انتظار ہی کرتے رہ جاتے۔

یہ انجانا خوف ہماری خوداعتمادی کا سب سے خطرناک دشمن اور کامیابی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم اہم فیصلہ کرنے، بڑے خواب دیکھنے اور کچھ نیا کرنے میں اکثر ناکام اس لیے رہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں ہمارے اندر یہ انجانا خوف گھات لگائے موجود رہتا ہے۔ صبح کی سیر کے وقت گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اگر کوئی زہریلا کیڑا ہمارے پاؤں پہ کاٹ لے تو ہم گھاس کی تراش خراش کے بجائے صبح کی سیر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ سال ہا سال اگر کسی بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے سے گزرتے رہیں اور کسی روز ہمیں کوئی یہ کہہ دے کہ اس درخت پر آسیب کا سایہ ہے تو ہم یا وہ راستہ ہی بدل لیتے ہیں یا مختلف دعاؤں اور آیتوں کا ورد کرتے ہوئے وہاں سے تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے اور خوف ایک آسیب کی طرح ہمیں پیچھے چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے ماہرینِ نفسیات خوف کو ایک بیماری قرار دیتے ہیں لیکن میری نظر میں خوف بیماری نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو کسی خطرے سے آگاہی کے سبب پیدا ہوتی ہے، بیماری اسے ہم خود بناتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم خوف کا سامنا کرنے کے بجائے پوری زندگی پشتو ادب کے

اُس افسانوی کردار کی طرح گزار دیتے ہیں جو ایک جنگل میں بھٹک جاتا ہے، جہاں اس کا سامنا ایک خوفناک بھیڑیے سے ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیے سے خوفزدہ ہوکر ایک درخت پر پناہ لیتا ہے اور پھر اسی درخت کو اپنا مسکن بنا لیتا ہے۔ یہ درخت بھی انتہائی عجیب وغریب ہوتا ہے، یہاں جو بھی خواہش کی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اگر نرم اور گرم بستر کے بارے میں سوچا جائے تو وہ آدمی خود کو اُسی آرام دہ بستر میں پاتا ہے۔ کچھ کھانے کو جی چاہے تو من پسند کھانا فوراً حاضر کر دیا جاتا ہے لیکن ان تمام آسائشوں کے باوجود وہ آزادی کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ اُس میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ درخت سے اتر کر بھیڑیے کا مقابلہ کرے اور آزادی حاصل کر لے۔ پھر ایک صبح جب وہ شخص بیدار ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ درخت لحہ بہ لحہ چھوٹا ہو رہا ہے اور بھیڑیا اُسی تناسب سے بڑھ رہا ہے۔ اب بھیڑیا اور وہ نزدیک آ چکے تھے۔ بالآخر یہ شخص ہمت کرتا ہے اور درخت سے نیچے کُود جاتا ہے۔ بھیڑیا اسے اپنے سامنے پا کر حملہ آور ہوتا ہے لیکن اس سے پیشتر کہ بھیڑیا اسے ہلاک کرے، وہ شخص زمین سے ایک نازک سی شاخ اٹھا کر بھیڑیے کو ضرب لگاتا ہے اور ہاتھی جتنا بھیڑیا چند ہی لمحوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ خوف سے آزادی کی خوشی سے سرشار یہ شخص جب اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس کے چاروں طرف بےشمار درخت ہیں اور ہر درخت پر کسی نہ کسی شخص نے پناہ لے رکھی ہے اور درخت کے نیچے اس کا بھیڑیا کھڑا غرا رہا ہے۔

خوف کا یہی بھیڑیا ہماری خوداعتمادی، صلاحیت، توانائی، ذہانت اور ان تمام خلیوں کو ہلاک کر سکتا ہے جو ہمارے زندگی میں آگے بڑھنے اور کچھ منفرد کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ناکامی کے خوف سے میدان میں اترنے سے پہلے ہی ہار مان لیتے ہیں، یوں اُن میں چھپی خداداد صلاحیتوں کے خزانے ہمیشہ کے لیے خوف کی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کے ماہ و سال جیسے تیسے گزار کر دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر جاتے ہیں۔ کہیں ایک خوبصورت آواز معاشرے کے خوف سے گھر کی چار دیواری میں دم توڑ دیتی ہے تو کہیں ایک

باصلاحیت فنکار خود اعتمادی کی کمی کے باعث سٹیج پر نمودار ہوکر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی طرح مستقبل کے انجانے اندیشے ہمارے حال کو بے حال کر دیتے ہیں۔ لیکن خوف کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جو وہم کے نتیجے میں پیدا ہو، مثلاً کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو گھر کی راہ لیتے ہیں کہ آج کچھ غلط ہونے والا ہے، دودھ زیادہ اُبل جائے تو خواتین پریشان ہوکر خیر و عافیت کی دعائیں مانگنے لگتی ہیں۔ خوف کی وجہ جو بھی ہو، نتائج ہمیشہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ آپ اپنے اندر جنم لینے والے خوف کو اپنے ہاتھوں شکست نہیں دیں گے تو کوئی دوسرا بھی اسے ختم نہیں کر سکے گا۔ خوف کا سامنا کر لیں تو بظاہر پہاڑ جیسی نظر آنے والی مصیبتیں روئی کا گالا ثابت ہوتی ہیں۔ خوف کا یہ بھیڑیا ناکامی، مایوسی، افلاس، جدائی، موت، بیماری اور کبھی کورونا کا روپ دھار کر ہمیں خوفزدہ کرتا ہے اور اگر ہم اس کا سامنا کرنے کے بجائے اس کے حصار میں قید رہیں تو عین ممکن ہے یہ خوف ہمیں کھا جائے۔

خوف نے کئی تاریخی کرداروں کو اپنے خوفناک حصار میں جکڑ کر بڑی بے دردی سے شکار کیا ہے۔ 1929ء کے امریکی صدارتی انتخاب میں ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) صدر منتخب ہونے میں تو کامیاب ہو گیا مگر گریٹ ڈپریشن کے بڑھتے ہوئے آثار کے سامنے اُس کی تمام ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں ناکارہ ثابت ہوئیں۔ وہ اِسی انجانے خوف کا شکار ہو کر کوئی بھی منفرد اور بڑا فیصلہ کرنے میں ناکام رہا اور یوں معاشی بحران روز بروز نہ صرف امریکی معیشت کو تباہ و برباد کرتا چلا گیا بلکہ اس ڈپریشن نے عالمی معیشت کو بھی بری طرح مفلوج کر دیا۔ ہر دوسرے روز جب صحافی امریکی صدر سے کچھ بڑا کرنے کے لیے کہتے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا ''ایک روشن صبح طلوع ہونے والی ہے'' مگر وہ صبح کبھی طلوع نہ ہوئی حتیٰ کہ 1932ء کے صدارتی انتخاب میں ہوور عبرتناک شکست سے دوچار ہوا۔ نومنتخب امریکی صدر ایف ڈی روزویلٹ نے اپنے پہلے خطاب میں امریکیوں کو گریٹ ڈپریشن سے نکالنے کے لیے جو نسخۂ کیمیا دیا وہ خود اعتمادی کو بحال کر کے خوف سے آزادی کا تھا اور اُس کے الفاظ تھے ''ہمیں صرف ایک ہی چیز کا خوف ہے اور وہ ہے

خوف کا۔'' تاریخ نے دیکھا کہ اس جملے نے امریکیوں کے اندر ایک نئی زندگی، نیا ولولہ اور منفرد جذبہ اُجاگر کیا جس کی بدولت روزویلٹ مسلسل چار مرتبہ امریکی صدر منتخب ہونے میں کامیاب رہا حتیٰ کہ امریکی آئین میں ترمیم کرکے اُس کے پانچویں انتخاب کا راستہ روکنا پڑا کہ اب کوئی بھی شخص دو سے زیادہ مرتبہ امریکی صدر منتخب نہیں ہوسکتا۔

❑❑❑
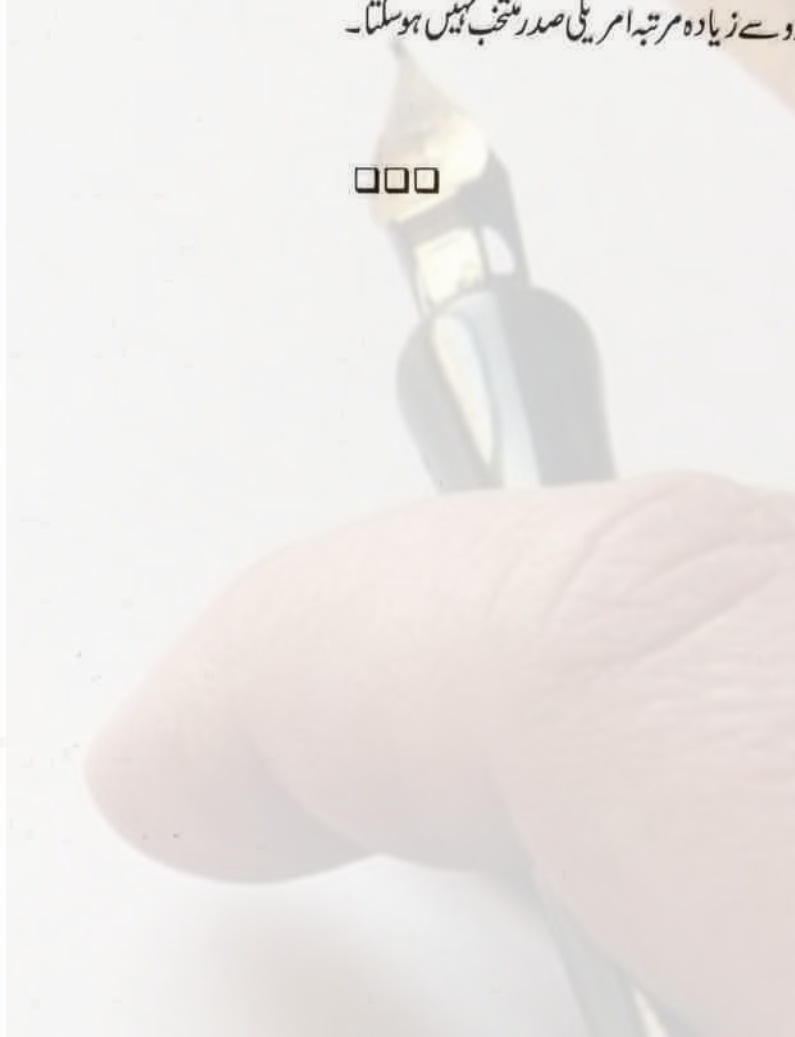
اداس رُت کے گلاب

پولیس بالخصوص پنجاب پولیس ہمیشہ سے ہدفِ تنقید رہی ہے جس کی بڑی وجوہات میں اس ادارے میں رشوت ستانی، سفارش، بدکلامی، جسمانی سزا،عقوبت خانے اور زیرِ حراست ہلاکتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بے پناہ طاقت اور وسیع اختیارات کا ناجائز استعمال بھی پولیس کے لیے شروع دن سے باعثِ ندامت رہا ہے۔ مختلف ادوار میں من پسند افراد کی بھرتی اور پھر جی بھر کے ان چہیتوں کے ذریعے سیاسی مخالفین پر قافیۂ حیات تنگ کیا جاتا رہا اور یوں اس ادارے کی ساکھ اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر کئی سوال جنم لیتے رہے۔ انھی مسائل اور وجوہات کی بنا پر اسے ملک میں امنِ عامہ قائم کرنے میں دشواری کا سامنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں پاکستان ٹیلی وژن کے ڈراموں میں پولیس پر تنقید اور تضحیک بامِ عروج پر جا پہنچی۔

مشہورِ زمانہ ڈراما ''اندھیرا اجالا'' میٹرک پاس ڈائریکٹ حوالدار کرم داد کی کارستانیوں کی بدولت شہرت کی بلندیوں پر پہنچا اور انسپکٹر جعفر حسین کی اداکاری نے پولیس کلچر کی حقیقی معنوں میں عکاسی کا حق ادا کر دیا۔ رہی سہی کسر ''ففٹی ففٹی'' نے نکال دی۔ اس پسِ منظر میں 1997ء میں پنجاب حکومت نے پولیس کلچر کو یکسر تبدیل کرنے کا اصولی فیصلہ کیا اور تھانے کی سطح پر پڑھے لکھے

نوجوان انسپکٹر تعینات کر کے پولیس اور عوام کے درمیان بڑھتی ہوئی عدم اعتمادی کی خلیج کو کم کر کے باہمی تعاون اور مثالی تعلقات قائم کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے شفاف میرٹ پر مبنی تین سو انسپکٹرز کی بھرتی کا عمل شروع کیا گیا جو اپریل 1998ء میں مکمل کیا گیا اور پھر پولیس کالج سہالہ میں مثالی تربیت کی فراہمی اولین ترجیح نظر آئی۔ ''سہالہ یاترا'' کے مصنف محمد آصف رفیق اور راقم الحروف اسی منزل کے مسافر ٹھہرے۔

میں نے لگ بھگ اڑھائی سال بطور لیکچرر انگلش گورنمنٹ کالج کمالیہ خدمات سرانجام دینے کے بعد 22 جولائی 1998ء کو شعبہ تعلیم کو خیر باد کہا اور اگلے ہی روز فیصل آباد پولیس میں بطور انسپکٹر حاضری دے دی۔ تقریباً دو ماہ بعد ایک سال کی پیشہ ورانہ تربیت کے لیے پولیس کالج سہالہ روانگی ہوئی اور میں دوبارہ لاہور منتقل ہو گیا۔ پھر سہالہ اور لاہور کے مابین سفر شروع ہوا اور بڑا ضلع ہونے کے باعث لاہور سے تعلق رکھنے والے ہم پچاس سے زائد کورس میٹ ایک بڑی بس کرایہ پر لیتے اور سیدھا پولیس کالج سہالہ جا پہنچتے۔ کبھی کبھار ویک اینڈ پر سب مل کر اسی طرح لاہور واپس آ جاتے۔ یہ سفر شغل میلے، گپ شپ اور شرارتوں سے عبارت تھا اور یوں ایک تھکا دینے والا لمبا سفر پلک جھپکتے ہی ختم ہو جاتا۔ اس خوشگوار سفر کی سب سے بڑی اور منفرد وجہ ''شاہد اور جیراں'' کی وہ فرضی رومانوی داستان تھی جسے میں نے اور آصف رفیق نے بڑی مہارت، برجستگی اور تخیل کی ہنرمندی آزماتے ہوئے تخلیق کیا۔ اس کہانی میں دیہاتی ثقافت، رومان، شرم و حیا، سادگی، شرمیلا پن، کردار نگاری اور افسانوی نوعیت کے سارے رنگ تھے۔ یوں ''شاہد اور جیراں'' کی کہانی ہمارے لاہور سے سہالہ تک کے سفر کا ایک خوبصورت حوالہ بن گئی۔ میں نے آصف کے اندر کا تخلیق کار پہچان لیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آگے جا کر اس کے قلم میں مزید پختگی اور روانی آئے گی کیونکہ ربِ کریم نے اسے کہانی کو جاندار انداز سے بیان کرنے کی پوری صلاحیت اور ہنرمندی سے نوازا تھا۔

پنجاب بھر سے ہمارے کورس میٹس سہالہ پہنچے اور ہماری پیشہ ورانہ تربیت، پولیس پریکٹیکل ورک اور قانون پر مکمل دسترس کے لیے پولیس سروس کے بہترین اور مایہ ناز افسران کا انتخاب کیا گیا۔ ہماری جسمانی فٹنس کو یقینی بنانے کے لیے پاکستان آرمی کے کمانڈوز اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے ڈرل ماہرین کو مامور کیا گیا۔ ہماری اخلاقی تربیت اور کردار سازی کے لیے سینئر پولیس افسران، علمائے کرام اور مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے دانشوران کو خصوصی لیکچرز کے لیے مدعو کیا جاتا۔ یوں ہماری مثالی تعلیم و تربیت اور شخصیت و کردار کی تعمیر و تشکیل کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی اور ایک سال تک ہم سہالہ کے گرم و سرد موسم میں ایک کٹھن، صبر آزما مگر یادگار قیام کی یادیں سمیٹے بیدیاں روڈ لاہور آن پہنچے جہاں تین ماہ کا ایلیٹ کمانڈو کورس ہمارا منتظر تھا اور ہماری تربیت کا لازمی جزو بھی۔ بارہ ہفتوں پر مبنی یہ کمانڈو کورس بھی ایک شاندار تجربے کے طور پر ہمیشہ ہماری یادوں کا اہم حصہ بن گیا اور ہم جسمانی فٹنس کے سب مراحل طے کر کے اپنے اپنے اضلاع میں پہنچ گئے جہاں عملی تربیت مکمل کر کے ہمیں تھانوں کے مہتمم کے طور پر تعینات کیا جانا تھا۔

یوں 'سہالہ یاترا، ایک طرف مصنف کے حیرت انگیز مشاہدات اور گہری نظر کی بدولت دورانِ تربیت رونما ہونے والے مختلف واقعات پر خوبصورت تبصرہ کرتی ہے تو دوسری طرف پاکستانی معاشرے کے مختلف سماجی اور معاشی مسائل، ناہمواریوں اور دشواریوں کو بھی زیرِ بحث لاتی ہے جو مصنف کے وسیع مطالعہ، ذاتی تجربات، تخیل کی اڑان اور گہرے مشاہدات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انتہائی سنجیدہ موضوع پر بات کرتے کرتے اچانک طنز و مزاح کی وادی میں اتر جاتا ہے اور اپنے نیم خواندہ انسٹرکٹرز کی گلابی اردو کے رنگین لہجوں کو بڑی آسانی سے بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے ہمیں خوشگوار حیرت کے جہان سے بار بار گزرنا پڑتا ہے کہ اچانک سنجیدہ گفتگو کے دوران قہقہوں کا دور شروع ہو سکتا ہے۔ ایک ہی سانس میں سرد و گرم لہجہ اختیار کرنا، قادر الکلام ادیب کی نشانی ہوتی ہے جو ہمیں آصف میں بدرجہ اتم

ملتی ہے۔

ہماری پولیس میں بھرتی کے اشتہار سے لے کر پولیس کالج سہالہ اور ایلیٹ سکول بیدیاں روڈ لاہور کی لگ بھگ پندرہ ماہ پر مشتمل تربیت کے شب و روز کے تمام احوال کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور تخلیقی ہنرمندی کی بھٹی میں پکا کر ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں بھلا اور کون سامنے لاسکتا تھا سوائے آصف رفیق کے، جو''شاہد اور جیراں'' کی کہانی کی تخلیق میں میرا ساتھی مصنف تھا اور جس کے تخلیقی جوہر بہت پہلے سامنے آچکے تھے۔ 'سہالہ یاترا، دراصل پولیس کالج سہالہ کی تربیت پر سب سے پہلا اور مستند حوالہ ہے اور پولیس اور عوام کے درمیان بڑھنے والی خلیج کے اسباب اور وجوہات پر ایک مدلل گفتگو بھی۔ یہ کتاب دراصل ہماری مشترکہ یادوں پر مبنی ایک بیش قیمت اثاثہ ہے اور ان سے جڑے ہمارے خوبصورت رشتوں اور اُن کی سچائی کا ذریعۂ اظہار بھی۔

آصف رفیق نہ جانے کب سے میرا ساتھی ہے۔ دیہاتی پسِ منظر سے لے کر گورنمنٹ کالج لاہور کے اوول گراؤنڈ تک، پولیس کالج سہالہ سے لے کر ایف بی آر تک اور فیصل آباد ریجنل ٹیکس آفس میں میرا سب سے پیارا، بااعتماد ساتھی اور سَچا اور سُچا دوست بھی۔ ہماری بائیس سالہ رفاقت اب رقابت کا روپ دھارنے لگی ہے کیونکہ وہ صاحبِ کتاب بن کر مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ آصف رفیق کی کتاب دراصل ان بائیس سالوں کی ہماری رفاقت، اس سے جڑی خوبصورت یادوں اور پولیس کالج سہالہ اور بیدیاں روڈ کے شب و روز پر مبنی اُن یادگار دنوں کی امانت بھی ہے جو ہم گزار آئے اور جو اَب کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئیں گے۔

سب سے بڑھ کر وہ شہدا جو ہمارے ہمسفر تھے مگر فرض کی ادائیگی کے دوران وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور وہ وطنِ عزیز کی خدمت میں ہمیں بہت پیچھے چھوڑ کر خود شہادت کے عظیم اور قابلِ رشک مرتبے پر فائز ہو گئے۔ آصف کی کتاب میں اُن سب شہدا کو قابلِ تحسین الفاظ میں یادوں کی لڑی میں پرویا گیا ہے جو مصنف کی اپنی دھرتی ماں اور اپنے ساتھیوں سے سچے رشتوں کی

ٹھوس گواہی اور مستند دلیل ہے۔ سہالہ یاترا ہمارے عہدِ شباب کے سنہرے خوابوں اور جواں جذبوں سے شروع ہوکر ڈھلتی عمر کی اداس رُت کے گلاب لمحوں کو امر کرتی ہوئی اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ آصف رفیق کو ڈھیروں مبارکباد اور بے پناہ دعائیں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

□□□
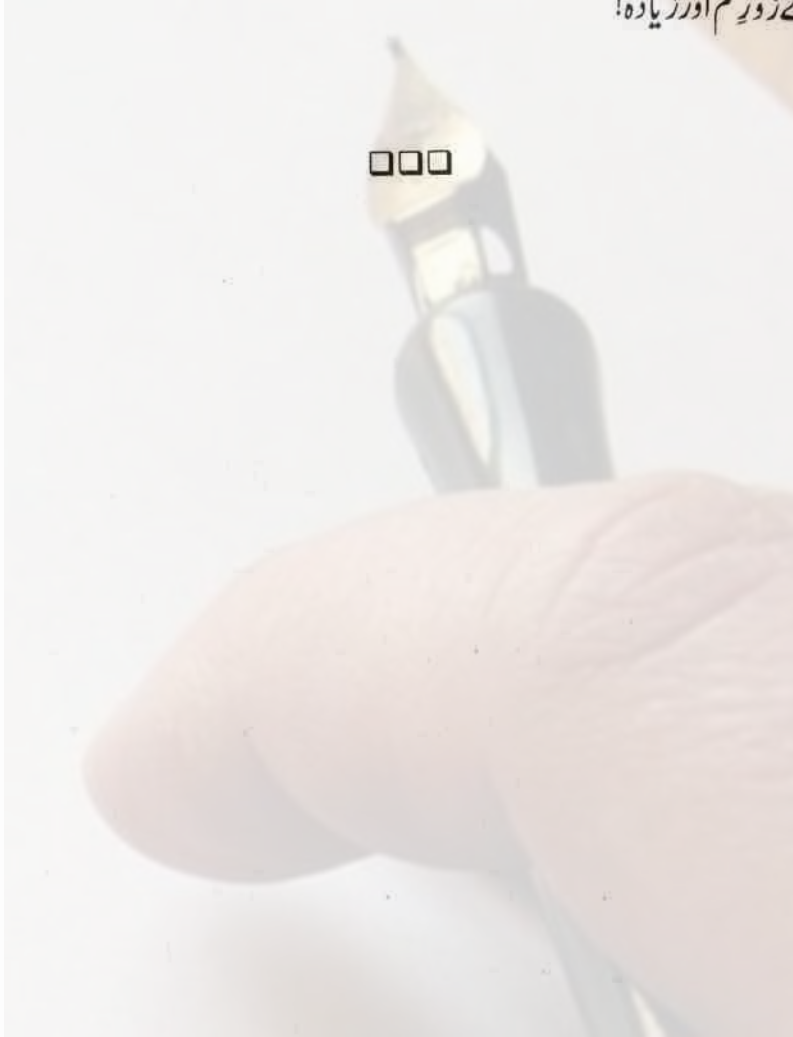
بجٹ کا موسم

ہماری خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے ہمیں چار موسموں سے نواز رکھا ہے اور ہم سال بھر گرمی، سردی، بہار اور خزاں کے منفرد رنگوں سے بھرپور استفادہ کرتے اور اپنی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ اس یگانہ نعمتِ خداوندی کے ساتھ ساتھ ہمیں پانچویں موسم سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور وہ ہے بجٹ کا موسم، جو کم وبیش چار ہفتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا آغاز مئی کے آخری عشرے سے ہو جاتا ہے۔ اس کے اثرات اور مضمرات سال بھر ہماری معاشی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس موسم کے ابتدائی ایام میں بجٹ کی تیاری پورے زور وشور سے اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوجاتی ہے۔ رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے حکومتی وزرا، مشیران، ترجمان اور منتخب ارکان آئے روز عوام دوست بجٹ کی خوشخبریاں پیش کرتے ہیں اور اسے ایک تاریخی بجٹ قرار دینے پر زور دیتے ہیں۔ اگلے عشرے میں جیسے ہی اس کے خدوخال نمایاں ہونے لگتے ہیں، سالانہ اکنامک سروے رپورٹ تیار کر کے میڈیا کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے اور رواں مالی سال میں حاصل کی گئی کامیابیاں قابلِ فخر انداز میں بیان کی جاتی ہیں۔ پھر بالآخر وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جس کا سال بھر انتظار کیا جاتا ہے اور جس کے ساتھ ملک کی اسّی فیصد آبادی کے ارمانوں،

خوابوں اور امیدوں کے چراغ جلتے ہیں۔ آئندہ مالی سال کا بجٹ قومی اسمبلی میں وفاقی وزیرِ خزانہ پیش کرتے ہیں، آخری مرحلے میں اس پر کھل کر بحث کی جاتی ہے اور پھر اسے منظور کر کے قانونی شکل دے دی جاتی ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں میں ہر سال بجٹ کے موسم میں ایک جیسا ماحول، ایک ہی طرح کے بیانات اور تقریباً ملتے جلتے رویے ہی دیکھنے کو ملتے رہے۔ مئی کا مہینہ شروع ہوتے ہی حکومتی ارکان اور وزرا قوم کو خوشحالی کے ایک نئے دور کی خوشخبری دینا شروع کر دیتے ہیں اور نئے بجٹ میں مضمر سنہرے دور کی نوید سنانا اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔ ہر شام مختلف چینلز پر بجٹ میں کیے گئے نمایاں اقدامات اور ان کے فوائد و ثمرات کو جہاں حکومتی ارکان داد و تحسین پیش کرتے نہیں تھکتے وہاں اپوزیشن اس بجٹ کو عام آدمی کے لیے زہرِ قاتل اور ملکی معیشت کے لیے انتہائی مضر ثابت کرنے پر تل جاتی ہے، اور ساتھ ہی اس بات کا اعادہ کرتی نظر آتی ہے کہ وہ کسی صورت بھی حکومت کے پیش کیے گئے بجٹ کو منظور نہیں ہونے دے گی اور نہ ہی عوام کے حقوق پر ڈاکا زنی کی اجازت دے گی اور اس کا عملی مظاہرہ بجٹ اجلاس میں کی گئی وفاقی وزیرِ خزانہ کی تقریر کے دوران بدرجہ اتم کیا جاتا ہے۔ بجٹ کی کاپیاں پھاڑ کر ایوان میں اچھال دی جاتی ہیں، سپیکر کا گھیراؤ کیا جاتا ہے اور اجلاس کی کارروائی رکوانے کی حتی المقدور کوششیں کی جاتی ہیں۔ حسبِ روایت سال 22-2021ء کا وفاقی بجٹ 11 جون کو جب قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو ہمیشہ کی طرح حکومت اور اپوزیشن ایوان میں باہم دست و گریباں نظر آئے مگر 14 جون کا دن پاکستانی جمہوریت اور پارلیمان کے لیے ایک سیاہ دن کے طور پر طلوع ہوا کیونکہ یہ بجٹ پر بحث کا دن تھا اور قومی اسمبلی میں جس قدر نازیبا الفاظ اور قابلِ اعتراض حرکات کا مظاہرہ ہوا اور بجٹ کی کاپیاں ایک دوسرے کے منہ پر ماری گئیں، وہ سارا منظر منتخب نمائندگان کی شخصیت کی حقیقی عکاسی کر رہا تھا۔ سارا دن سوشل میڈیا پر اس شرمناک کارروائی کی وڈیوز وائرل رہیں جن میں اسمبلی کے سارجنٹ بے بس دکھائی دیئے اور سپیکر قومی اسمبلی کی مسلسل وارننگ بے سود ثابت ہوئی۔ یقیناً اس سے پارلیمان کے وقار کو شدید دھچکا لگا اور دُنیا بھر

میں پاکستان کی جمہوری اقدار کا مذاق اڑایا گیا۔

حسبِ دستور موجودہ بجٹ کو حکومت اور حکومتی اتحادی ملک وقوم کے لیے ایک نئے دور کا آغاز قرار دے رہے ہیں۔ اسے پاکستانی معیشت کی مضبوطی اور غریب طبقے کی خوشحالی کا ضامن ثابت کرنے پر تلے رہے جبکہ اپوزیشن اسے اعداد وشمار کا گورکھ دھندا اور محض اک دھوکا قرار دے رہی ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے انداز میں اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور طرزِ سیاست کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہرینِ معیشت کی اکثریت اس بجٹ کو قدرے متوازن بجٹ قرار دے رہی ہے اور اس کے کچھ منفرد پہلو ایسے ہیں جو یقیناً ملکی معیشت کی مضبوطی اور پاکستان کے نچلے طبقے کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ سب سے قابلِ تحسین عمل وفاقی وزیرِ خزانہ کی طرف سے آئی ایم ایف کی کڑی شرائط کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونا ہے جس میں انھوں نے دوٹوک الفاظ میں بجلی اور گیس کی قیمتیں نہ بڑھانے کا اصولی مؤقف اپنایا اور تنخواہ دار طبقے پر اضافی ٹیکس نہ لگانے کی نہ صرف بات کی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ مزید برآں تنخواہوں اور پنشن میں 10 فیصد اضافہ کیا گیا۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ آئی ایم ایف کے سامنے لیٹنے کی بجائے ملکی مفاد اور غریب عوام کے حقوق کو مقدم رکھا گیا اور بجٹ میں نہ اضافی ٹیکس لگائے گئے اور نہ ہی غریب کی زندگی مزید اجیرن بنائی گئی۔ اس کے علاوہ موجودہ بجٹ کے تین کلیدی پہلو ہیں جو ملکی معیشت پر دوررس اثرات ڈالنے کی پوری سکت رکھتے ہیں اور جن سے وطنِ عزیز میں معاشی سرگرمیاں تیز ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلے ملک میں کاروباری وسعت اور پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے کیے گئے اقدامات ہیں جن کے لیے لگ بھگ ایک ٹریلین رقم مختص کی گئی ہے۔ اس پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ملک میں نہ صرف روزگار بڑھے گا اور فی کس آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ شرحِ نمو میں بھی اضافہ دیکھنے کو ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے مالی سال میں مجموعی مطلوبہ شرحِ نمو 4.8 فیصد رکھی گئی ہے۔

دوسرا بڑا اقدام پاکستان کے نچلے طبقے کو معاشی طور پر خود مختار بنانا ہے جس کے لیے دیہی

آبادی میں کسان کو مضبوط بنانے کے لیے کھاد، بیج اور ادویات کے لیے تاریخ میں پہلی بار ڈیڑھ لاکھ روپے کی مالیت کے بلاسود قرضے دیئے جائیں گے جبکہ زرعی آلات کے لیے الگ سے ڈیڑھ لاکھ تک کی رقم بلاسود فراہم کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ کسان کی فصل کی پوری قیمت اور بروقت ادائیگی کو یقینی بنایا جائے گا اور اسے آڑھتی اور مڈل مین کے چنگل سے آزاد کرایا جائے گا۔ اس طرح شہری آبادی میں نوجوانوں کو اپنے کاروبار کے لیے پانچ لاکھ تک کے قرضے بلاسود فراہم کیے جائیں گے اور مزید بیس لاکھ تک کی رقم کم ترین شرحِ سود پر جاری کی جائے گی تاکہ وہ نہ صرف خود معاشی طور پر مضبوط ہوں بلکہ دوسروں کے لیے بھی روزگار کے مواقع پیدا کر سکیں۔

اسی طرح تیسرا نمایاں اور قابلِ ذکر پہلو پاکستان کی جغرافیائی اکائیوں میں یکساں تعمیر و ترقی کے لیے بجٹ میں خطیر رقوم کا مختص ہونا ہے۔ پہلی مرتبہ پسماندہ اضلاع کے لیے الگ رقم مختص کی گئی ہے۔ اسی طرح خیبر پختونخوا میں ضم ہونے والے فاٹا کے علاقے، گلگت بلتستان اور کشمیر کے لیے بجٹ میں گراں قدر اضافہ کیا گیا ہے تاکہ پاکستان بھر میں معاشی ترقی اور استحکام یکساں طور پر نظر آئے اور بلا امتیاز اس کے ثمرات عام آدمی تک پہنچ سکیں مگر حکومت کے لیے سب سے بڑا چیلنج اس بجٹ کو عملی جامہ پہنانا ہے اور اس کے لیے انتظامی مشینری اور صوبائی حکومتوں کے ساتھ مسلسل اور مؤثر رابطے کے ساتھ ساتھ اِن کی کڑی نگرانی بھی درکار ہوگی تاکہ پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت مجوزہ ترقیاتی سکیمیں اور منصوبہ جات ایک شفاف اور مضبوط نظام کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچ سکیں۔ اس کے لیے کک بیکس اور کمیشن مافیا کو لگام دینا ہوگی، معیار کو یقینی بنانا ہوگا، گراں فروشی اور ذخیرہ اندوزی پہ قابو پانا ہوگا۔ اس کے علاوہ ملک میں امنِ عامہ بہتر بنانا ہوگا تاکہ نہ صرف بیرونِ ملک مقیم پاکستانی ہمیں تواتر کے ساتھ رقوم بھیجتے رہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ کار بھی پاکستان کا رخ کریں۔ اس کے علاوہ کاروبار میں آسانی اور شفافیت لانے کے لیے کرپشن کے ناسور سے آہنی ہاتھوں نمٹنا ہوگا تاکہ معاشی ترقی کے ثمرات عام آدمی تک پہنچ سکیں۔ لازم ہے

کہ بجٹ کے اس موسم میں پاکستانی عوام کے باغِ تمنا میں امید و آرزو کے ایسے پھول کھِل سکیں جو ہمیشہ کھلے رہیں اور جنھیں کوئی اندیشۂ زوال نہ ہو۔ احمد ندیم قاسمی کے دعائیہ اشعار یاد آ گئے...

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

❑❑❑

مودی کا شکریہ

''تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کو بدل دیتے ہیں اور اس سے بھی کم لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کا نقشہ بدل دیتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اپنی قوم کے لیے ایک علیحدہ ریاست حاصل کی ہو۔ محمد علی جناح نے یہ سارے کام کیے۔'' یہ الفاظ سٹینلے والپرٹ نے اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' کے آغاز میں قلمبند کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان کی شخصیت بہت ہی جامع بنیادوں پر استوار تھی۔ وہ شروع ہی سے ذہین، محنتی اور مستقل مزاج تھے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ان کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھی، اسی نے ان کی زندگی کو نئی جہت عطا کی۔ محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب ''مائی برادر'' میں لکھتی ہیں ''جناح کو والد نے بزنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھجوایا کیونکہ ان کا خاندان کاروبار سے منسلک تھا مگر انھوں نے لنکنز اِن کے گیٹ پر آویزاں دنیا کے عظیم قانون دانوں کی فہرست میں نبی آخر الزماں ﷺ کا نام سب سے اوپر لکھا دیکھا تو اپنا ارادہ بدل لیا۔ انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔'' قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ لنکنز اِن میں اُن کے قیام کے دور سے ہی ہو جاتا ہے۔ آپ نے برصغیر

کے تمام طلبہ کو اکٹھا کیا اور دادا بھائی نورو جی کو سٹوڈنٹ کونسل کے انتخابات میں جتوانے کے لیے ساری مہم چلائی اور بالآخر کامیاب ٹھہرے۔ جب 1905ء میں دادا بھائی آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے قائداعظم کو اپنا سیکرٹری مقرر کرلیا اور 1906ء میں انھوں نے آل انڈیا کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ جب 1909ء میں وہ مرکزی قانون ساز کونسل کے ممبر کی حیثیت سے منتخب ہوئے تو اس وقت لارڈ ولنگٹن نے ان کو دیکھ کر کچھ ایسے الفاظ کہے جن سے انھیں اپنی توہین محسوس ہوئی۔ برصغیر میں قائداعظم ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے لارڈ ولنگٹن کے منہ پر جرأت مندی سے سخت الفاظ میں اس کے رویے کی مذمت کی۔ آپ نہایت مستقل مزاج انسان تھے اور ہمیشہ قانون کا احترام کیا، کبھی جیل نہیں گئے۔ آپ شدت آمیز سیاست پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ کبھی اَنا، ضد اور اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔

سرسید احمد خاں نے مسلم قوم کو جدید تعلیم حاصل کرنے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین پڑھنے اور انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی اور علی گڑھ میں مسلمانوں کو جدید خطوط پر تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب دوقومی نظریے کی بازگشت بلند ہوئی اور دور اندیش مسلم قیادت نے یہ بھانپ لیا کہ مسلمانانِ برصغیر کو اپنا الگ تشخص برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انگریز کی کثرتِ رائے والی سوچ اور ہندوؤں کی تنگ نظری، ہر دو محاذوں پر سیاسی جنگ لڑیں اور یہ لڑائی سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر اور مسلمہ حقیقتوں کے ادراک کے بغیر ناممکن تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانانِ ہند کی آنکھیں کھول دیں۔ مسلمانوں نے کانگریس سے ناامید ہو کر 1906ء میں اپنی الگ جماعت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کی بنیاد رکھی اور بعد ازاں اس پلیٹ فارم سے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے آواز بلند کی۔ قائداعظم محمد علی جناح 1920ء تک کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں جماعتوں کے ممبر رہے اور امن کے سفیر کہلائے مگر نہرو رپورٹ نے آپ پر کانگرس کی تنگ نظری اور محدود سوچ واضح کر دی تھی اور اب آپ جیسے فطین شخص کے لیے فیصلہ لینا مشکل نہ تھا۔ آپ نے کانگریس سے ہمیشہ کے لیے اپنی

راہیں جدا کرلیں اور علیحدہ سیاسی تشخص کے لیے دن رات کوششیں شروع کردیں۔

1930ء میں علامہ محمد اقبال نے خطبہ الہٰ آباد دوقومی نظریے کی وضاحت کی اور فصاحت سے کہا کہ انھیں شمالی مغربی اکثریتی علاقوں میں ایک الگ خود مختار ریاست بنتی نظر آرہی تھی۔ اس پر ہندو بالادستی پر مبنی براہمن ذہنیت نے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا صدر بنا دیا۔ گول میز کانفرنسوں میں مسلم لیگ کی نمائندگی قائداعظم نے کی جبکہ کانگریس کی نمائندگی کے لیے ابوالکلام آزاد کو جیل سے ضمانت دے کر شامل کیا گیا۔ جو دوقومی نظریے کے سخت مخالف تھے۔ ان گول میز کانفرنسوں کے بعد قائداعظم اپنوں سے مایوس ہو کر انگلینڈ چلے گئے۔

1934ء میں انگلینڈ سے واپسی پر مسلم لیگ کی قیادت، 1940ء میں قراردادِ لاہور، اس کے بعد تحریکِ پاکستان کے یک نکاتی ایجنڈے پر کام شروع کردیا گیا اور 1946ء کے الیکشن میں مسلم لیگ تمام مکمل تیس نشستیں جیت کر کابینہ میں شامل ہوئی، لیاقت علی خان پہلے وزیرِ خزانہ بنے اور تاریخی عوام دوست بجٹ دیا۔ اس پر ابوالکلام آزاد نے کہا کہ اس عوامی بجٹ کے ذریعے سردار پٹیل کو تقسیم کے منصوبے پر راضی کرلیا گیا ہے۔ معروف تاریخ دان ڈاکٹر عائشہ جلال نے اپنی کتاب ''سٹرگل فار پاکستان'' میں ان حقائق کو بیان کیا ہے جن کی بدولت پاکستان کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ قائداعظم کے سیاسی مخالفین بھی آپ کے بااصول اور نہ جھکنے، نہ بکنے کی خصوصیات کی تعریف کرتے ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: اگر جناح نہ ہوتا تو پاکستان نہ بنتا۔ نریندر مودی اور آر ایس ایس کے نظریات کے حامل ایل کے ایڈوانی نے بھی قائداعظم کی شخصیت کو سراہا۔ جسونت سنگھ نے اپنی کتاب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ جناح ہی تھے جن کی سیاسی بصیرت اور دوراندیش فطرت سے ہندوستان تقسیم ہوا اور ہندوؤں کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے والے بھی جناح ہی تھے۔ بعد میں ان دونوں کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں اس اعتراف کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔

معرضِ وجود میں آنے کے بعد پاکستان کو قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت بہت مختصر عرصے

کے لیے میسر رہی مگر قائد نے جو راستے دکھائے وہ بڑے واضح ہیں۔ وقت اور حالات نے ثابت کیا کہ ان کا الگ ریاست کا حصول اور دوقومی نظریہ درست تھا۔ شیخ عبداللہ اور بعد ازاں مقبوضہ کشمیر کی ہندنواز قیادت، جو دوقومی نظریے کی مخالف تھی، آج مودی سرکار کی فسطائیت دیکھ کر چیخ اٹھی ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی تھی۔ اب انڈیا کی سکھ کمیونٹی بھی اپنے بڑے، ماسٹر تارا سنگھ کے بھارت میں شمولیت کے فیصلے پر پچھتا رہی ہے۔ آج ہم جن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں وہ اس بات کے غماز ہیں کہ ہم نے قائد کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اگر ہم ایمان، اتحاد، تنظیم اور کام، کام اور صرف کام کے اصولوں پر قائم رہتے تو حالات یکسر مختلف ہوتے۔ قائداعظم نے مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ ریاست وجود میں آنے پر کہا کہ یہاں ہر طبقے، ہر نسل، ہر رنگ، ہر عقیدے اور ہر علاقے کے لوگوں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کر سکیں۔ 11 اگست 1947ء کو آپ نے فرمایا ''آپ لوگ آزاد ہیں، اس ملکِ پاکستان میں مندروں، مسجدوں اور عبادت گاہوں میں جانے کے لیے، آپ کا مذہب کیا ہے، ذات کیا ہے اور قوم کیا ہے، اس کا ریاست کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔'' اس وقت ہم جس طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں اور جن مسائل کا ہمیں سامنا ہے ان سب کا حل معیاری تعلیم اور اخلاقی تربیت میں پوشیدہ ہے۔

پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی بانئ پاکستان کی ایک ایک بات کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں اور اس کی عقلی دلیلیں تراش لاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مودی سرکار کے ظلم و بربریت اور وحشت نے ایک طرف بھارت کے سیکولرازم کا بھانڈا پھوڑا ہے تو دوسری طرف بانئ پاکستان کے دوقومی نظریے کو ایک مرتبہ پھر زندہ کر کے اس کی صداقت پر مہر ثبت کر دی ہے۔ آج پاکستان کے اندر وہ خودساختہ لبرلز بے آسرا ہو چکے ہیں جو قائد کے نظریات پر تنقید کر کے بھارت سے دوستی کے لیے امن کی آشا کا راگ الاپا کرتے تھے۔ بابا جی فرماتے ہیں کہ مودی کا شکریہ، اگرچہ اس کے سفاکانہ حکومتی ہتھکنڈوں اور ظلم و ستم کے سبب بھارت میں اقلیتوں پر قافیۂ حیات تنگ ہوا ہے مگر

قائد کے دوقومی نظریے کونئی طاقت ملی ہے۔ بانیٔ پاکستان نے سچ فرمایا تھا ''وہ مسلمان جو قیامِ پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کی بقیہ زندگی بھارت کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے میں گزر جائے گی۔'' قائد کے اس قولِ صادق کی حقیقت آج بھارت کے مسلمانوں سمیت دنیا بھر پر آشکار ہو چکی ہے۔
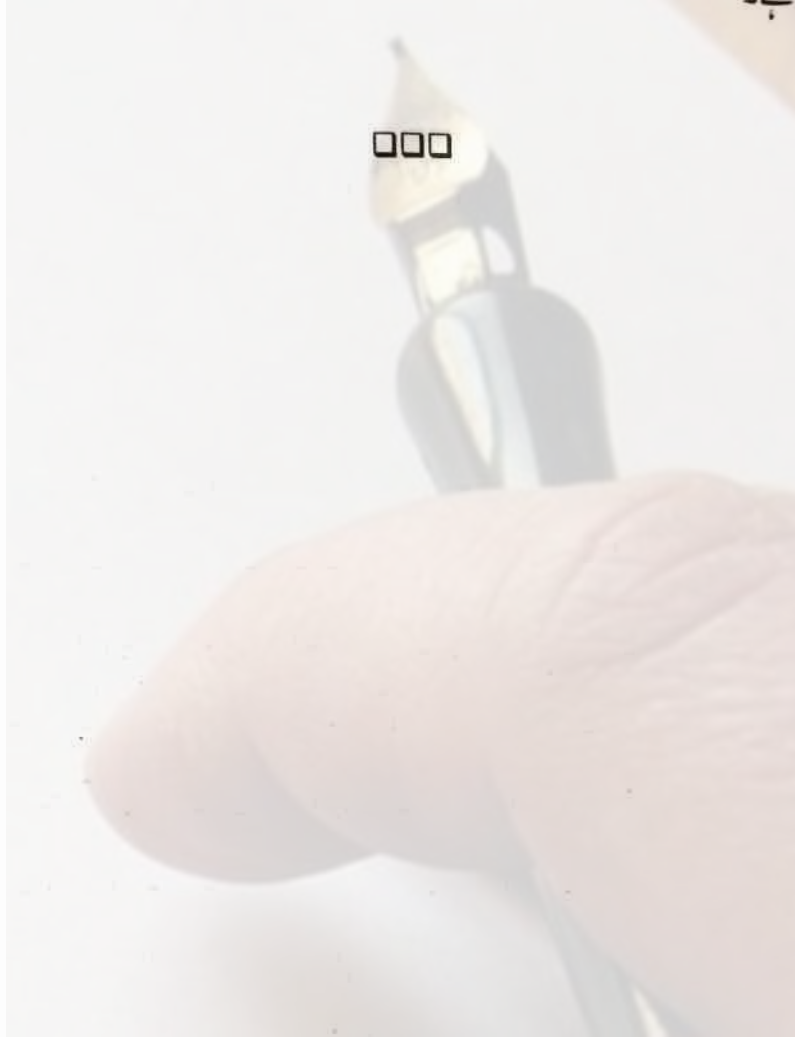
سرزمینِ کربلا کا دکھ

میدانِ کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی اور اللہ سے تائید اور نصرت چاہی۔ اس کے بعد اتمامِ حجت کے لیے دشمنوں کی صفوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''لوگو جلدی نہ کرو، پہلے میری بات سن لو۔ مجھ پر تمھیں سمجھانے کا جو حق ہے اسے پورا کر لینے دو اور میرے آنے کی وجہ بھی سن لو۔ اگر تم میرا عذر قبول کرلو گے اور مجھ سے انصاف کرو گے تو تم انتہائی خوش بخت انسان ہو گے لیکن اگر تم اس کے لیے تیار نہ ہوئے تو تمھاری مرضی۔ تم اور تمھارے شریک مل کر میرے خلاف زور لگا لو اور مجھ سے جو برتاؤ کرنا چاہتے ہو کر ڈالو۔ اللہ تعالیٰ میرا کارساز ہے اور وہی اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔'' آپ نے فرمایا کہ لوگو تم میرے حسب و نسب پر غور کرو اور دیکھو کہ میں کون ہوں۔ اپنے گریبانوں میں جھانکو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ تم خیال کرو کیا تمھیں میرا قتل اور میری توہین زیب دیتی ہے؟ کیا میں تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسا اور ان کے چچیرے بھائی کا بیٹا نہیں جنھوں نے سب سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر لبیک کہا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ کیا سید الشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ میرے والد کے چچا نہ تھے؟ کیا جعفر طیار رضی اللہ عنہ میرے چچا نہ تھے؟ کیا تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ قول یاد نہیں جو

انھوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ دونوں نوجوانانِ جنت کے سردار ہوں گے۔ اگر میرا یہ بیان سچ ہے اور ضرور سچ ہے تو بتاؤ کہ تمھیں ننگی تلواروں سے میرا مقابلہ کرنا ہے؟ اور اگر تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو تو آج بھی تم میں سے وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے میرے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنی ہے۔ تم ان سے دریافت کر سکتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ کیا آپ ﷺ کی اس حدیث کی موجودگی میں بھی تم میرا خون بہانے سے باز نہیں رہ سکتے؟ لیکن کوفیوں اور ان کے سرداروں کی عیاری، مکاری اور رعونت کے باعث ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صرف حر بن یزید تمیمی پر آپ کی اس تقریر کا اثر ہوا اور وہ یہ کہتے ہوئے لشکر حسین رضی اللہ عنہ میں شامل ہو گئے کہ یہ جنت یا دوزخ کے انتخاب کا موقع ہے، میں نے جنت کا انتخاب کر لیا ہے خواہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ آخر کار امامِ عالی وقار اسلام کی سربلندی، دینِ حق کی بقا اور اپنے محبوب نانا سے بے پناہ محبت کو سچ ثابت کرنے کے لیے معرکۂ حق و باطل میں حیدرِ کرار کی بے مثل شجاعت کا پیکر بن کر سینہ سپر ہوئے اور ایثار و قربانی کی اک ایسی لازوال داستان رقم کر ڈالی کہ آج تک ہر دل کی دھڑکن میں نامِ حسین رضی اللہ عنہ اَمر ہو چکا۔

کسی بھی معتبر قوم کے لیے اس کے ماضی کی شاندار روایات نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اور وہ ان سنہری روایات سے حال کشید کرتی ہے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کر کے حق پرستی، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور باطل کے سامنے ڈٹ جانے کی روایت قائم کی۔ یہ قربانی ہمارے لیے مشعلِ راہ اور ایک نمونہ ہے کہ ہم اپنے اپنے حالات میں اس کی پیروی کریں، مگر یہ بدقسمتی ہے کہ ہم سامراجی خداؤں کی اطاعت میں حق پرستی کو بھول کر حسینی روایات سے میلوں دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل و عیال اپنے نانا کے دین پر قربان کر کے وفاشعاری کی روایت قائم کی مگر ہم ان قابلِ فخر روایات کو اپنی عملی زندگیوں میں شامل کر کے اپنی اگلی نسل تک صحیح معنوں میں پیغامِ حسین رضی اللہ عنہ نہیں پہنچا سکے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال کر دینِ حق کی سلامتی و سربلندی کو ترجیح دی جبکہ ہم ذاتی مفادات کی جنگ

میں الجھ چکے ہیں۔ آج بظاہر حسینیت کا علم تھامے ہوئے ہیں مگر اس قربانی کے مقاصد کے ساتھ ہماری کمٹمنٹ نظر نہیں آتی۔ کربلا کے پیاسے ہونٹوں کی خشکی کو فراموش کر کے جام و سرور کی محفلوں میں جا بیٹھے ہیں۔ اطاعت کا معیار کردار نہیں، طاقت، جاہ و حشم اور دولت ٹھہر چکا ہے۔ پوری مسلم اُمہ اندرونی خلفشار، گروہی انتشار اور فرقہ پرستی کا شکار ہو کر اغیار کے سامنے بچھی پڑی ہے اور ذلت و رسوائی کے زخم چاٹ رہی ہے۔ اسی حالتِ زار کو شاعرِ مشرق حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنے شہرہ آفاق کلام شکوہ جواب شکوہ میں اس طرح اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے...

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک
عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نم ناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستی فوق الادراک

جو بھروسا تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا ڈر، اُس کو خدا کا ڈر تھا

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نہ دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

آج ہم سب کو امام حسین رضی اللہ عنہ سے عشق کا دعویٰ تو ضرور ہے لیکن خاکِ کربلا شاہد ہے کہ دعوئ عشق کی پاسداری کون کر رہا ہے اور کون حسینیت کو فراموش کر چکا ہے۔ سرزمینِ کربلا کے اسی کرب کو شورش کاشمیری نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ہم مردہ یزید پر لعنتیں بھیجتے ہیں مگر زندہ یزیدوں کی پوجا کر رہے ہیں۔ آج بھی کرب و بلا عراق، ایران، فلسطین اور افغانستان میں برپا

ہے۔ امام حسین ﷜ کی قربانی اور حق پرستی کا جذبہ اکنافِ عالم میں پھیل چکا ہے اور وہ مظلوم، مجبوراور مقہور قوموں کے دلوں میں موجزن ہے۔ اگر امام حسین ﷜ میدانِ کرب و بلا میں عظیم قربانی نہ دیتے تو آج ہر محلے، گلی، گاؤں اور شہر میں یزید مظلوموں کو جینے نہ دیتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم، ناانصافی، رعونت اور جبر کا دُنیا میں سب سے بڑا نشانہ مسلمان ہیں اور اس ناقابلِ بیان دکھ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اسوۂ حسینی سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے جو یہ بتاتا ہے کہ حق کی خاطر ڈٹ جانا ہی بقا کی ضمانت ہے۔ اگر آپ سمجھوتے کرتے رہیں، ذاتی مفادات پر قومی مفادات کو نظر انداز کریں اور حق کو پسِ پشت ڈالیں گے تو نہ عزت کی زندگی نصیب ہوگی نہ قومی تشخص پروان چڑھے گا۔ امام حسین ﷜ کی قربانی کی صورت میں ہمارے پاس وہ نمونۂ ہدایت موجود ہے جس کی پیروی کی جائے تو عالمی سطح پر درپیش مسائل میں سے بیشتر کا خاتمہ ممکن ہے۔ مگر مدنظر رہے کہ درس حسین ﷜ صرف یہی نہیں بتاتا کہ بیرونی اور خارجی عوامل کا مقابلہ کس طرح کرنا ہے بلکہ ہمیں اسی میں داخلی سماجی مسائل سے نمٹنے میں بھی مدد ملتی ہے، ہمیں اپنے سیاسی نظام، سماجی ڈھانچے اور عوامی سطح پر طرزِ عمل میں بھی اس سے رہنمائی ملتی ہے۔ امامِ عالی مقام کی شہادت کا سبب ان کا کوئی ذاتی اختلاف نہ تھا، آپ ایک اجتماعی مقصد کو لے کر کھڑے ہوئے تھے، یعنی کسی سماج میں نمایاں مقام رکھنے والی شخصیات پر یہ آج بھی اسی طرح فرض ہے کہ وہ قومی مقاصد کی پامالی کے خطرے کے مقابل ڈٹ جائیں۔ جمہوری نظام میں جہاں ووٹ کے اختیار نے ہر شخص کو اہم مقام پر فائز کر دیا ہے تو یہ بلا تفریق ہر فرد کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اپنے اس حق کا استعمال نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ کرے۔ حق بینی وحق آگاہی کی صلاحیت کو کام میں لائے، ضمیر کی آواز کو نظر انداز نہ کرے۔ نااہل، قومی مقاصد سے نابلد اور ابن الوقت لوگوں کے مقابلے میں قومی مفادات سے آگاہ، دیانتدار اور باصلاحیت افراد کو حقِ حکومت دلانا بھی اسوۂ حسینی ہے۔ سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا، کمزوروں کے ساتھ کھڑے ہو جانا، خواہ یہ آپ کی گلی کی سطح پر ہو، قومی سطح پر یا عالمی سطح پر، یہ بھی اسوۂ حسینی ہے۔ حق اور انصاف کو طاقت کے زور پر مسخ کرنے

والوں کے مقابلے میں کھڑا ہونا کتنا اہم ہے اس کا اندازہ ہم سماجی سطح پر لگا سکتے ہیں کہ کتنے ہی معاملات میں کسی ایک فرد کا قیام ملکی اور بعض اوقات عالمی سطح کی تحریک کی صورت اختیار کر گیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفادات، لالچ یا خوف میں اکثر ایسا نہیں کر پاتے اور یہ بھی سرزمینِ کربلا کے لیے درحقیقت دکھ کی ایک وجہ ہے کہ ہم اس قربانی کو مان کر بھی اس کی پیروی اور اس سے سیکھنے سے محروم ہیں۔

❑❑❑
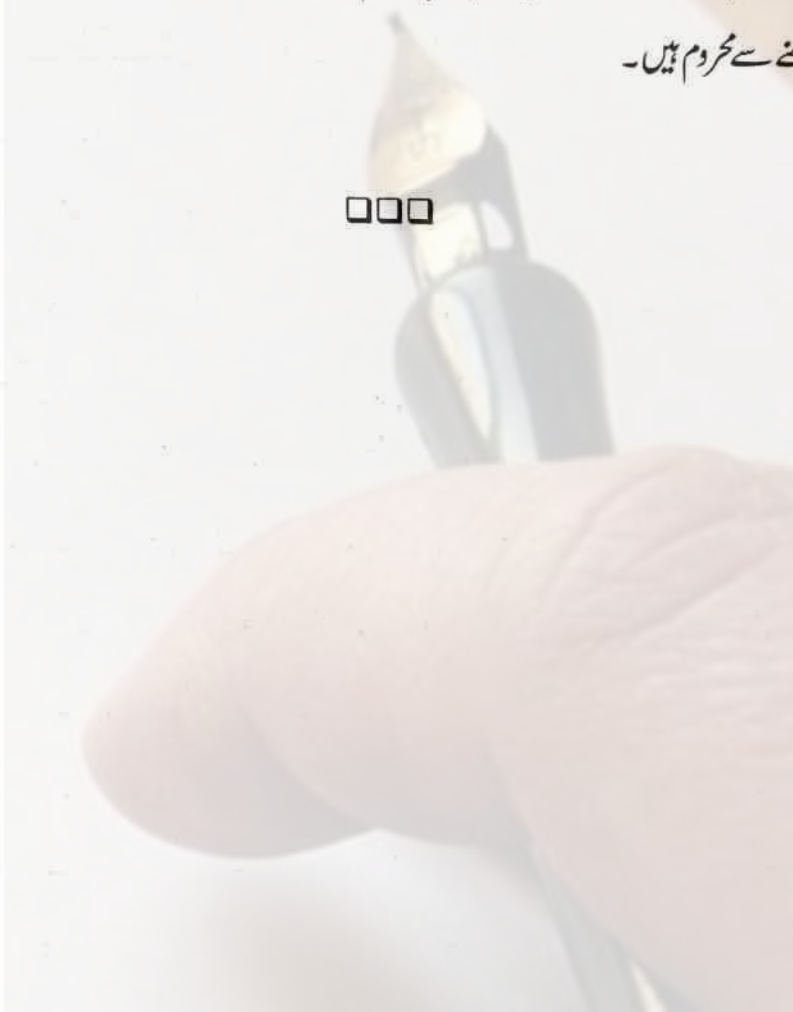
ریت کی دیوار

مادہ پرستی اور افراتفری کے دور میں انسان کو دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ پہلی چیز سکون ہے اور دوسری خوشی۔ سوال یہ ہے کہ پُرسکون ہونے میں ہی اگر حقیقی خوشی چھپی ہے تو سکون کی تلاش میں گوتم بدھ جنگلوں میں بھٹکے اور جبلّتوں سے لڑے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے اور دکھوں کی وجہ ہماری خواہشات ہیں۔ انسان ہمیشہ سے خوب تر کی تلاش میں رہا ہے۔ خواہشوں کو اگر بے لگام اور غیر معمولی طور پر بڑھا لیا جائے تو پھر بے سکونی اور عدم توازن معاشروں کا مزاج بن جاتا ہے۔ آگے بڑھنے کی خواہش فطری تقاضا ہے اور حکمِ حق تعالیٰ بھی بنی نوعِ انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے سبب علم و ہنر سیکھنے، ارض و سماوات کی تسخیر، غور و فکر اور تحقیق و جستجو کو قرآنِ مجید میں بار بار دہرایا گیا۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کی ترغیب علامہ اقبال نے بھی دی۔ خودی، عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کے نظریات پر عمل پیرا ہونے کو کامیابی کا زینہ قرار دیا۔ ترقی یافتہ اقوام اور ان کے سماجی رویوں کو بغور دیکھا جائے تو جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ سچائی اور قانون کی عملداری ہے۔ حب الوطنی کا تقاضا بھی یہی ہے اور انسان کی عزتِ نفس، حرمت، نسلوں کی بقا اور سلامتی کی ضرورت بھی۔ معاشی ترقی ہو یا معاشرتی و سماجی روابط، ان کو باہم مربوط اور منظم کرنے کے لیے

ضروری ہے کہ معاشرے کی بنیاد سچائی اور حقیقت پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس جھوٹ تمام اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ یہ فرد اور معاشرے کے تعلق کو کمزور کرتا، خود اعتمادی اور شخصی وقار کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ تجارت ہو یا اشیائے ضرورت کی تیاری وفراہمی، اگر جھوٹ، ملاوٹ اور لالچ سے پاک ہو جائیں تو ترقی و کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے، برآمدات بڑھیں گی اور ادائیگیوں میں توازن آ جائے گا۔

بدقسمتی سے گزشتہ تین دہائیوں میں اچھائی اور برائی کے تمام معیارات بدل گئے ہیں۔ سوچ کے زاویوں میں نمایاں فرق دیکھنے کو ملا ہے۔ اخلاقی قدروں میں گراوٹ نے مجموعی قومی سوچ اور اخلاقی و معاشرتی انحطاط کو جنم دیا ہے۔ معاشرے میں باعزت وہ ٹھہرا جو دولت مند اور طاقتور تھا۔ بڑی بڑی مہنگی گاڑیاں، محل نما گھر، نوکر چاکر اور سکیورٹی کا ذاتی عملہ، عزت کا معیار بن گئے ہیں۔ اس سے معاشرے میں خوف، عدم تحفظ، شخصی آزادی کی سلبی اور عدم تحفظ کے احساس نے جنم لیا ہے۔ احساسِ کمتری نے اس طرح اذہان کو مفلوج کیا کہ جائز اور ناجائز ذرائع آمدن کا فرق مٹ گیا۔ ظاہری نمود ونمائش کا ایک ایسا کلچر خودرو جھاڑیوں کی طرح دیکھنے کو ملا کہ رشتے ناطے تبدیل ہو گئے۔ سٹیٹس کے چکر میں معاشرہ گروہوں، فرقوں، مسلکوں، عہدوں اور رتبوں کی غیر فطری تقسیم میں بٹ کر اپنی اصل ہیئت گنوا بیٹھا۔ ناجائز دولت اور نو دولتیوں نے تہذیب وتمدن کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ رشتوں میں شرافت، خاندانی نام اور وقار کی جگہ دولت، لالچ اور حرص نے لے لی۔ شادیاں کاروباری معاہدے لگنے لگ گئیں۔ غیر اہم رسم ورواج کو ایسی پذیرائی ملی کہ شادی گھر کھمبیوں کی طرح اُگ آئے۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے عجیب وغریب پکوان متعارف ہوئے۔ برانڈڈ کپڑے، جیولری، پرس جوتے، گویا سر سے پاؤں تک دکھاوے اور مصنوعی پن نے قدرتی حُسن اور معصومیت کی قدر کو تو کم کیا ہی، دوسری طرف بیوٹیشن کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ آج کل میک اپ کے نام پر لاکھوں روپیہ لٹایا جاتا ہے۔ رزق کمانا ہم سب کا حق ہے مگر بدقسمتی سے ہم دولت کو سکون کا ذریعہ اور خواہشوں کی تکمیل کو ہی خوشی کا سبب مان بیٹھے ہیں۔ ہم نے یہ تصور کر لیا ہے کہ دولت

سے خوشی خریدی جا سکتی ہے۔ یہ زندگی کی سہولتوں کے حصول اور سکون کا ذریعہ ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دولت کمانے کی دھن میں ہم حقیقی خوشیوں سے دور ہو رہے ہیں۔ خواہشات کے غلام بن کر سچ اور جھوٹ، ملاوٹ اور خالص کی پہچان کھو رہے ہیں۔ دولت کے انبار لگا کر بھی اطمینانِ قلب سے نا آشنا ہیں۔ ایک انجانا خوف اور عجب غیر یقینی صورتِ حال سے سب دو چار ہیں۔ ڈر کمزور کرتا ہے اور پھر ہم اندرونی کمزوری کو چھپانے کے لیے جھوٹ سے کام چلاتے ہیں۔ یہی چیز کاروبار میں بھی رائج ہے اور کہا جاتا ہے کہ کاروبار میں تو یہ سب چلتا ہے۔ ملکی قوانین اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں دھوکا دہی اور لاپروائی پر فخر کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ترقی یافتہ قوموں نے کاروبار میں سچائی کی روش اختیار کی اور معیار متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں اعتماد اور معیار بنیادی اصول بن چکے ہیں۔ احسان دانش اپنی کتاب ''درِ زندگی'' میں لکھتے ہیں کہ دلّی میں ایک بدنامِ زمانہ جیب کترا تھا، ایک دن شام کو اس نے اپنے استاد کو دو روپے دن بھر کی کمائی جمع کرائی۔ استاد حیران ہوا اور سبب دریافت کیا تو جیب کترے نے کہا: میں نے ایک گورے کی جیب سے بھاری رقم ماری تھی مگر بعد میں خیال آیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سامنا کیسے کروں گا کہ ان کے امتی کو لوٹا ہے، لہٰذا میں نے مال اسے واپس کر دیا۔ ایک بار ابنِ فراش کے دو بیٹوں نے حجاج بن یوسف کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور پھر گھر سے بھاگ گئے۔ کچھ وقت کے بعد وہ گھر لوٹے تو حجاج کو خبر مل گئی۔ اس نے ابنِ فراش کو بلایا اور بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ابنِ فراش نے جواب دیا: وہ گھر پر ہی ہیں۔ حجاج نے کہا کہ تمھارے سچ کی وجہ سے میں نے تمھارے بیٹے تمھیں انعام میں بخشے۔ جھوٹ کسی بھی معاشرے میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کہانی ہم سب نے بچپن میں درسی کتب میں پڑھ رکھی ہے مگر ہم اپنے علم کو عملی زندگی میں لاگو کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ بچے اپنے ماحول، معاشرے اور والدین کے طور طریقے اپناتے ہیں۔ تربیت کے انداز و اطوار غلط ہیں۔ ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ لنگڑا کر ہی چلیں گے، سیدھا چلنا ممکن نہیں۔ اس روش کو چھوڑنے کے لیے آنے والی نسلوں کو محنت کی ضرورت ہوگی۔

ہمارے ہاں کسی جوڑے کی شادی کی خوب تیاری کی جاتی ہے۔ ہال، پارلر کی بکنگ، دعوت نامے، بینڈ باجا وغیرہ مگر کبھی ان کو ذمہ داریوں کی بجا آوری کی تربیت نہیں دی جاتی کہ وہ آنے والی نسل کی تربیت کیسے کریں۔ ہم سب مصنوعی زندگی گزار رہے ہیں اور محض نوٹ چھاپنے والی مشین بن گئے ہیں۔ اخلاق سے عاری اور اقدار سے نابلد، یہ انفرادی نہیں اجتماعی مسئلہ ہے۔ اے سی میں سونا ہمیں پُرسکون لگتا ہے۔ دفتر، شاپنگ مال اور سرکاری عمارتوں میں سیڑھیوں کے بجائے لفٹ کی عادت ہے۔ پیدل چلنا شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ جتنی بڑی گاڑی اتنی زیادہ اہمیت کی توقع کی جاتی ہے۔ ظاہری بود و باش، نمائش اور آسائش نے ہمارے معاشرے اور اخلاقی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔ فیشن، مہنگے لائف سٹائل اور بناوٹ سے آلودہ سوچ نے ایک طرف لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ، دھوکا دہی اور کرپشن کا بازار گرم کر رکھا ہے تو دوسری طرف ان اخلاق باختہ سرگرمیوں سے خود کو محفوظ رکھنے والوں کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ وہ خود اور ان کے بچے طرح طرح کے نفسیاتی اور جذباتی عارضوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ جھوٹ اتنا زیادہ سرایت کر چکا ہے کہ سچ بولنے والوں کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انھیں سفید کوّا ثابت کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ ایمانداری اور دیانتداری سے نوکری کرنے والوں کو نیم پاگل قرار دیا جاتا ہے، ان کے ماتحت اور افسرانِ بالا اپنی اپنی جگہ ان کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں اور ان کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔

میرے روحانی پیشوا، محسن و مربی پروفیسر رحمت علی المعروف باباجی اور ان کے چہیتے شاگرد جیدی میاں کے مابین اس موضوع پر ہونے والی فکری بحث اکثر نوک جھوک میں بدل جاتی ہے۔ جیدی میاں ہمیشہ جدت پسندی اور دورِ رواں کی تعریف کا راگ الاپتے ہیں مگر باباجی اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے دلائل کو منطقی انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔ فکری پختگی سے آراستہ گفتگو میں وہ ٹھوس شواہد بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، چونکہ ہمارے مروجہ معاشرتی اور معاشی نظام کی بنیاد جھوٹ، ملاوٹ اور ذاتی مفاد پر رکھی گئی ہے لہٰذا ایسا

معاشرہ مستحکم انداز میں آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ اس کی بقا ہمیشہ خطرات میں گھری رہے گی۔ ریت کی دیوار پر کوئی مضبوط عمارت بنائی جا سکتی ہے؟

□□□
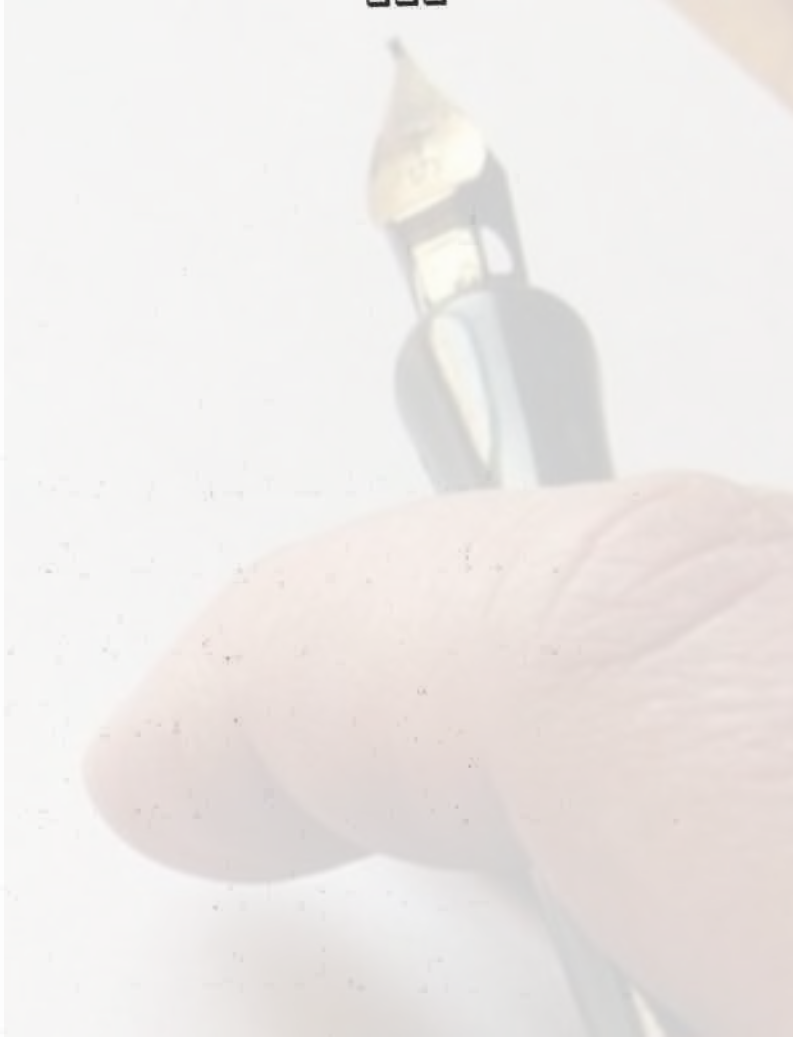
وقت سے کون کہے، یار! ذرا آہستہ!

سُوت کی ''اٹی''، اُتارتے ہوئے تکلے کی تیز نوک اُس کی اُنگلی میں چبھی تو سوچ میں ڈوبی بُڑھیا چونک گئی۔ اُسے بے اختیار یہ خیال آیا کہ چرخہ کاتتے اُسے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اُس کی سونے کی سی رنگت خاک ہوئی، وجود جھریوں سے اَٹ گیا، شباب کا دریا اتر گیا اور ناقابلِ شکست پیری میں بھی اُسے یہ مشقّت تادمِ مرگ انجام دینا تھی۔

ایک نظر بڑھیا نے اپنی انگلی پر ڈالی جہاں خون کا ایک قطرہ جم چکا تھا اور دوسری نظر چاند سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر موجود زمین کے شمال و جنوب، مشرق و مغرب میں بسنے والے انسانوں کا احاطہ کرنے لگی۔ تاریخِ انسانی کے تمام عروج و زوال کی داستانیں پل بھر میں اُس کی چشمِ تَر میں اُتر آئیں۔ پھر یہ نگاہ برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے آخری ایّام کے ایک منظر (زمانہ ہے 1850ء کے لگ بھگ اور مقام ہے دہلی) پر جا کر ٹھہر گئی۔

اس منظرنامے میں مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی لال قلعہ کے شاہی محل میں سرور و نشاط کی محفلیں اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ شاعر داد سمیٹ کر اٹھنے لگتے ہیں۔ رات بھر تازگی بخشنے والے پھول اب باسی دکھائی دے رہے ہیں۔ شمعیں گُل کر دی جاتی ہیں، جس

کے بعد بادشاہ سلامت اور عمائدین اپنی اپنی خواب گاہوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں سے واپسی غروبِ آفتاب سے پیشتر ممکن دکھائی نہیں دیتی۔

اس کے برعکس ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورے افسران اور ملازمین رات کی پُرکیف نیند لے کر جاگ چکے ہیں۔ انگریز خواتین گھوڑوں پر سوار ہوکر قدرتی خوبصورتی کو رگ وجاں میں سمو رہی ہیں۔ صبح سات بجے تک انگریز افسران اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیر مسٹر تھامس مٹکاف دوپہر تک کام کا بیشتر حصہ نمٹا کر بہادر شاہ ظفر کے تازہ ترین حالات کا تجزیہ آگرہ اور کلکتہ روانہ کر چکے ہیں۔

بڑھیا کی نگاہ پلٹی اور ایک پاکستانی گھر کے منظر پر جا کر رک گئی۔ (زمانہ 2017ء وقت رات 3 بجے) یہ ایک نوجوان کا کمرہ تھا جس کی کھڑکی میں سے چاند جھانک رہا تھا۔ نوجوان ابھی ابھی وڈیو کال سے فارغ ہوا تھا اور فیس بک پر جھلملاتی تصویروں میں پوری طرح غرق ہو چکا تھا۔

بڑھیا کی حیران کُن نگاہ پلٹی تو راستے میں ایک اور منظر سے ٹکرا گئی۔ یہ امریکی شہر نیویارک کی ایک سائنس لیب کا منظر تھا جہاں ایک نوجوان سائنسدان تجربات میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے خود پر رُکی ہوئی بُڑھیا کی گہری نظر کا احساس تک نہیں ہوا۔ ''پھر پلٹ کر نگاہ نہیں آئی!'، چند سالوں بعد قہوہ خانے پر بیٹھے چند پاکستانی نوجوان یہ تبصرہ کر رہے تھے کہ ''گورے بلا کے ذہین ہوتے ہیں اور انھوں نے سائنس کی دُنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔'' پھر سائنسی ایجادات سے شروع ہونے والی نوجوانوں کی اِس گفتگو کا رُخ انسٹاگرام پر فالوورز بڑھانے کے طریقوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران چاند پر بیٹھی بڑھیا کے ہاتھ چرخہ کاتتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکتے اور رکیں بھی تو کیسے! یہ ہاتھ تو وقت کا استعارہ ہیں جنھیں بس چلتے رہنا ہے۔

زمین پر بسنے والے انسانوں کی تقسیم، رنگ، نسل، مذہب، قومیت، سیاست اور جغرافیائی حدود کی بنا پر کرنے بیٹھوں تو بات بہت دور تلک جائے گی۔ وقت کی قدر و منزلت اور بہترین استعمال کے اعتبار سے میں انسانوں کو تین دائروں میں چلتا ہوا دیکھتا ہوں۔ پہلی صف میں وہ لوگ

شامل ہیں جنھیں دُنیا ''لیجنڈز'' پکارتی ہے، تاریخ جن کی باندی اور عہد جن کے نام سے زندگی پاتا ہے اور جو اربابِ نشاط کے نغموں کی زینت ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا دن طویل اور رات مختصر ہوتی ہے۔ جو اوقاتِ کار کے اتنے پابند ہوتے ہیں کہ چند منٹ ضائع ہو جائیں تو افسوس اور تاسّف سے اُن کی رنگت پھیکی پڑ جاتی ہے۔ وقت کو متاعِ جاں اور اثاثۂ حیات سمجھنے والوں کو وقت پلکوں پر بٹھاتا ہے اور یہ دُنیا کے عظیم مصلح، حکمران، سپہ سالار، سائنس دان، فلسفی، تاجر اور تخلیق کار کے طور پر تاریخ کے سینے پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر لمحہ کچھ نیا سوچتے ہیں اور ہر دن کچھ نیا کر دکھانے کا عزم لیے اپنی صبحِ پُرنور کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ دُنیا کے نقشے پر کچھ اَن مٹ نقوش چھوڑنے کی خُو میں لگے رہتے ہیں۔ اِن سب عظیم انسانوں کا دن صبح سویرے پرندوں کی چہکار کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور یہ روزانہ کم وبیش پندرہ سولہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔

دوسری صف میں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو اس قابل تو ہوتے ہیں کہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکیں مگر سطحی سوچ اور محدود اہداف سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ زندگی کے وسیع تر اسرار و رموز سے تادمِ مرگ بےخبر رہتے ہیں۔ اِن کا دن صبح نو بجے شروع ہو کر شام پانچ بجے تک تمام ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ خود زندگی کو کوئی نیا مفہوم عطا کرنے کے بجائے دوسروں کے دیئے ہوئے معنی کی وضاحت میں تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ یوں اِن کی زندگی ایک محدود دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔

تیسری اور سب سے طویل صف اُن خواتین وحضرات کی ہے جو پہلے اپنے ہاتھوں وقت کو تباہ کرتے ہیں اور پھر خود وقت کے ہاتھوں برباد ہو کر اپنی تباہی کا سوگ مناتے رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف دل کے اشاروں پر اپنی تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ جب دل کیا سو گئے، آنکھ کھلی تو جاگ اُٹھے، شام پانچ بجے لنچ کر لیا اور دل چاہا تو رات دو بجے ڈنر کی غرض سے کچن میں جا گھسے۔ ایسے لوگوں کا کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوتا اور نہ انھیں زندگی کی گہرائیوں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی پاپ میوزک کی مانند ہوتی ہے جو بجتی ہے تو شور کرتی ہے اور پھر اچانک بلا مقصد تھم جاتی ہے۔ بےنیل ومرام یہ ہستیاں جب صفحۂ ہستی سے مٹائی جاتی ہیں تو زمان ومکاں کے کان

پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ لوگ غبارِ سیاہ کی مانند فضا میں بکھر جاتے ہیں اور کسی ایک شخص کے بھی کاروبارِ حیات میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

جہاں پہلی صف سے تعلق رکھنے والے قومی مشاہیر اور بین الاقوامی قد کاٹھ کی شخصیات کا وصال کروڑ دلوں کو لرزا دیتا ہے، دشمنوں کی رکی سانسیں بحال کرتا ہے، دُنیائے سیاست پر اَنمٹ نقوش چھوڑتا ہے، مؤرخین کو واقعات کی ترتیب اور سوانح نگاروں کو اعداد و شمار جمع کرنے پہ لگا دیتا ہے، وہیں تیسری صف والے کی موت کرۂ ارض پر سوائے ایک اضافی قبر کے اور کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، معاشرے ہوں یا ممالک، ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن وہی نظر آتے ہیں جنھوں نے ایک ایک لمحے کو پوری دیانت داری اور سچی لگن سے اپنی کامیابی یقینی بنانے کے لیے خوب استعمال کیا۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ وقت کے اس بہتے دھارے میں آپ اپنے آپ کو کہاں دیکھتے ہیں؟ ہماری آنکھوں میں طلوعِ آفتاب کا منظر گہنا چکا ہے اور چاندنی راتوں کے رومانس میں کھوئی ہماری نوجوان نسل کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایک دن میں چوبیس گھنٹے کا وقت سب کو ملتا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ خود کو کون سی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

یاد رکھیں! وقت بہت عجیب شے ہے، یہ بیک وقت ظالم بھی ہے اور ہمدرد بھی، سخت گیر بھی ہے اور نرم مزاج بھی، عزتوں کے تاج بھی پہناتا ہے اور ذِلتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی دھکیل دیتا ہے۔ وقت کے پیروں میں زنجیر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں! اگر اس کے گلے میں محنت کے ہار ڈالے جائیں تو آپ کا شمار صفِ اول کے لوگوں میں ہو سکتا ہے اور یہ جان لیں کہ کبھی چاند پر چرخہ کاتتی بڑھیا کی نگاہ آپ پر پڑی تو وہ نو لکھے چرخے کی میٹھی کوک پر آپ کے لیے نغمات گائے بنا نہیں رہ پائے گی۔

□□□

اجڑتی ہوئی زمیں کا دُکھ

گزشتہ صبح بچے سکول جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور میں ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بظاہر بے نیاز ہو کر کنکھیوں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ اُن کی ایک ایک ادا میں اکیسویں صدی کی جھلک تھی۔ انھیں صاف ستھرے خوبصورت یونیفارم میں دیکھ کر مجھے اپنے سکول کی سادہ سی وردی یاد آ گئی اور ذہن کے نہاں گوشوں سے ماضی کروٹ لے کر بیدار ہو گیا۔ لگ بھگ پینتیس برس قبل گاؤں کی مسجد سے اذانِ فجر کی صدا بلند ہوتے ہی نیند کی تہیں آنکھوں سے ایک ایک کر کے اترنے لگتیں۔ صبح کی سردی میں وضو کے دوران پانی کہنیوں تک جاتا تو پورا جسم عجب لذت سے ہمکنار ہوتا۔ نماز مسجد میں ادا ہوتی اور اس کے بعد امام صاحب ہمیں قرآن مجید کا درس دیتے۔ کبھی اچھا سبق سنانے کے انعام میں بادام والی ٹافی ملتی تو گویا پورا منظر نکھر جاتا، اتنی خوشی ہوتی کہ جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ مار لیا ہو۔ مسجد سے گھر آ کر غسل کر کے اپنی ماں کے ہاتھ سے بنا تازہ مکھن سے مزین پراٹھا، دیسی انڈے کا آملیٹ اور گھر کی لسی پر مشتمل ناشتہ تیار ہوتا، جس کی منفرد خوشبو آج بھی تازگی بخشتی ہے۔ سکول یونیفارم میں ملبوس ہم کھاد کی بوری ہاتھ میں لیے گھر سے نکلتے ہی دوڑ لگا دیتے کیونکہ کھلے میدان میں اپنے دوست اور اپنی جگہ پر قبضہ کرنا اولین ترجیح ہوتی تھی۔ سکول

داخل ہوتے ہی اپنی پسندیدہ جگہ پر باقاعدہ لیٹ کر قبضہ یقینی بنایا جاتا تھا۔ ٹھنڈی زمین پر کھاد کی بوریاں بچھا کر نہ صرف سردی کی شدت کم کی جاتی بلکہ یہ فرنیچر کا نعم البدل بھی تھیں۔ جب استادِ محترم سکول کے بڑے دروازے سے داخل ہوتے تو پورا سکول ان کے احترام میں کھڑا ہو جاتا اور اسمبلی کے لیے قطاریں بن جاتیں۔ پرائمری سکول تک تعلیم اپنے گاؤں میں مکمل کی مگر مڈل سکول کی سہولت ہمارے گاؤں سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر میسر تھی تو سیف بھائی اور میں نے مڈل سکول کے لیے روزانہ پیدل سفر شروع کیا۔ ہر روز سکول آنے جانے کے لیے چودہ کلومیٹر کا سفر پیدل طے کیا جاتا۔ اپنے گاؤں سے نکلتے ہی کھیت کھلیان میں واقع پگڈنڈیوں سے گزرتے سکول کے لیے عازمِ سفر ہوتے تو ہر کھیت میں مخصوص سرگرمیاں دیکھنے کو ملتیں۔ اکثر کسان علی الصبح اپنے اپنے کھیت میں بیلوں کے ذریعے ہل چلا رہے ہوتے تھے، بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں مسحور کن آواز سے ہمارے کانوں میں رس گھول جاتیں۔ وہ سادہ لوح دیہاتی کسان ہمیں سکول جاتا دیکھتے تو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی اخلاص سے بھرپور دعائیں دیتے۔ برق رفتاری سے چلتے چلتے ہم سات کلومیٹر کا سفر تقریباً چالیس منٹ میں طے کر لیتے۔ کبھی کبھار آپس میں ریس بھی لگ جاتی تو فاصلہ تیس پینتیس منٹ میں کٹ جاتا۔ سکول میں تفریح کے وقت، اپنے بستے میں موجود رومال میں پراٹھا، آملیٹ اور گھر کے بنے اچار پر مبنی ''لنچ باکس'' کھولا جاتا اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر تناول کیا جاتا۔ بسا اوقات کلاس میں موجود بڑی عمر اور تگڑے قد کاٹھ والے لڑکے ہمارے ''لنچ باکس'' پر قبضہ جما لیتے اور ہمیں محض لال رومال ہی واپس ملتا، پھر ہم اپنی پاکٹ منی سے شکر قندی اور مالٹے خرید کر کھا لیتے۔

واپسی کا سفر شروع ہوتا تو بھوک کی شدت ستا رہی ہوتی تھی، کماد کی فصل سے گنے، بیری کے بیر اور شاجم ہماری مرغوب خوراک تھی، جو راستے میں موجود فصلوں کی سہولت کی وجہ سے ہمارا آسان ہدف بن جاتی۔ چاقو، نمک مرچ اور دیگر ضروری آلات ہمارے سکول بیگ میں ہمیشہ موجود ہوتے، جنھیں واپسی پر استعمال میں لا کر بھوک کو مٹانے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ واپسی کا سفر عموماً

ڈیڑھ گھنٹے میں کٹتا تھا اور چار بجے کے قریب ہم گھر پہنچتے تھے۔ ہماری لگن، اساتذہ کی محنت، کسانوں کی بے لوث دعاؤں اور ماں باپ کی بے پناہ توجہ اور مسلسل رہنمائی ہمارے لیے سرمایۂ حیات ثابت ہوئی اور آج زندگی کے سفر پر گامزن، پیچھے مڑ کے دیکھیں تو سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ اس لمبے، صبر آزما اور کٹھن راستے پر ہم چلتے رہے، رکے نہیں، بھٹکے نہیں، کہیں قدم ڈگمگائے بھی تو فوراً سنبھل گئے۔ بے لوث دعاؤں کی صداؤں میں اور اپنے گاؤں کی دھوپ چھاؤں میں ہم بڑے ہوتے گئے اور وقت تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔

گاؤں کی زندگی سادہ تھی، گھر زیادہ تر کچے مگر لوگ سچے اور رشتے پکے تھے۔ بڑی بڑی حویلیاں، چھوٹی چھوٹی دیواریں اور دروازے بہت کم، مگر زندگی محفوظ اور پُرسکون تھی۔ خوف نہیں تھا، رنج و ملال کے بجائے سکوں، اپنائیت، اُنس اور شرم و حیا کی وجہ سے رشتے ناتے زیادہ گہرے اور مضبوط تھے۔ معاشرتی تنظیم اور اجتماعیت کی لڑی میں پروئے ہوئے گاؤں میں ایک دوسرے کی ڈھارس اور امداد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا قابلِ فخر کردار کی عملی مثال تھا۔ فصل کی بیجائی ہو یا کٹائی، سب مل کر باری باری ایک سے دوسرے کھیت میں پھیل جاتے اور سب کی فصلیں ایک ہی قد و قامت اور رنگ و روپ میں لہلہانے لگتیں۔ غریب اور بے زمین کامے کسی نہ کسی زمیندار سے منسلک ہوتے جو ان کی خدمات کے عوض ان کے گھروں میں گندم، چاول، لکڑی، لسی، مکھن اور دودھ تک ساری ضروریاتِ زندگی کی ترسیل کو یقینی بناتا اور اسے اپنی چودھراہٹ اور باپ دادا کی عزت کی ضمانت سمجھتا۔ گاؤں کے سب جوان کھیل تماشے، شغل میلہ، ہنسی مذاق، سخی سرور کے سنگ، کبڈی، ریچھ کتوں کی لڑائی اور بیلوں کی ریس جیسے ثقافتی میلے ٹھیلے بڑی دھوم دھام سے منعقد کرواتے اور آس پاس کے سبھی دیہات ان میں شریک ہوتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔

گاؤں میں کسی گھر میں شادی کی تیاری شروع ہوتی تو اس کا انتظام و انصرام گویا سارے گاؤں کی اجتماعی ذمہ داری بن جاتی۔ شادی سے کم از کم پندرہ بیس دن پہلے رات کو ڈھول کی تھاپ پر گاؤں کے سارے جوان اور بزرگ ثقافتی رقص کرتے، جھومر ڈالتے، بھنگڑے سے لطف اندوز

ہوتے اور رات گئے تک عید کا سا سماں رہتا۔ شادی سے ایک دو روز قبل دور دراز سے قریبی رشتہ دار اور دوست احباب پہنچ جاتے تو پورے گاؤں سے چار پائیاں، بستر اور تکیے اکٹھے کیے جاتے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے مختلف گھروں کا انتخاب کیا جاتا، جہاں ان کے سونے، نہانے اور کھانے کے مناسب انتظامات کو یقینی بنایا جاتا۔ صبح ناشتے کے لیے مسجد میں اعلان کروایا جاتا اور اس طرح شادی کی جملہ رسومات کی بخیر وخوبی انجام دہی میں گاؤں کے بزرگ اور جوان، سب اپنا اپنا حصہ ڈالتے۔ گاؤں سے جب کسی لڑکی کی ڈولی اٹھتی تو تقریباً ہر آنکھ اشکبار ہوتی گویا کہ وہ پورے گاؤں کی عزت تھی جو اَب پرائی ہو چلی تھی۔

بارش ہوتی تو گاؤں کے سب جوان نہانے کے لیے گھروں سے باہر نکل آتے اور کھیل تماشے شروع ہو جاتے۔ گاؤں کے اطراف میں موجود بیری، جامن، امرود اور آم کے درخت ہمارا نشانہ بنتے اور سب اپنے مرغوب پھل توڑنے کے لیے ٹولیاں بنا کر درختوں پر حملہ آور ہوتے۔ کبھی کبھار مالکان نے دیکھ بھی لینا تو واجبی سی گالیوں اور وعظ ونصیحت کے ساتھ جوانوں کو بھگانے کی کوشش کی جاتی جو اکثر ناکام رہتی۔ پھر اچانک مشینری، ٹیکنالوجی، سائنسی ترقی اور آلات نے ایسا رنگ جمایا کہ گاؤں کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ نفسانفسی، آپا دھاپی، مفاد پرستی، کینہ، بغض، حرص و ہوس، حسد اور لالچ نے انسان کو انسان سے دور کر دیا۔ رشتے ناتے، دوست احباب اور قربت کی ساری شکلیں فاصلوں اور دوریوں میں بدل گئیں۔ دیہاتی زندگی میں شہری زندگی کی تیزی اور مادہ پرستی نے زور پکڑ لیا اور آج میرے گاؤں سمیت دیہاتی زندگی ایک اجڑے ہوئے گلشن کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

اب گاؤں کے بچے بھی صبح سویرے اپنے سکول کی وردی میں ملبوس موٹر سائیکل یا رکشوں پر سوار ہو کر اپنے سکول جاتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ان کو راستے میں دعاؤں کی صدائیں لگانے والے وہ سچے اور بے لوث کسان نہیں ملتے۔ شاید دعاؤں سے عاری بظاہر یہ خوشحال دیہات اسی لیے تیزی سے اجڑتی ہوئی زمین کا نقشہ پیش کر رہے ہیں جس کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے برسوں

پہلے لکھا تھا...

شاید اسی دکھ سے اجڑتی چلی جاتی ہے زمیں
کہ اب تو انسان کا ستاروں پہ بسیرا ہوگا

❑❑❑
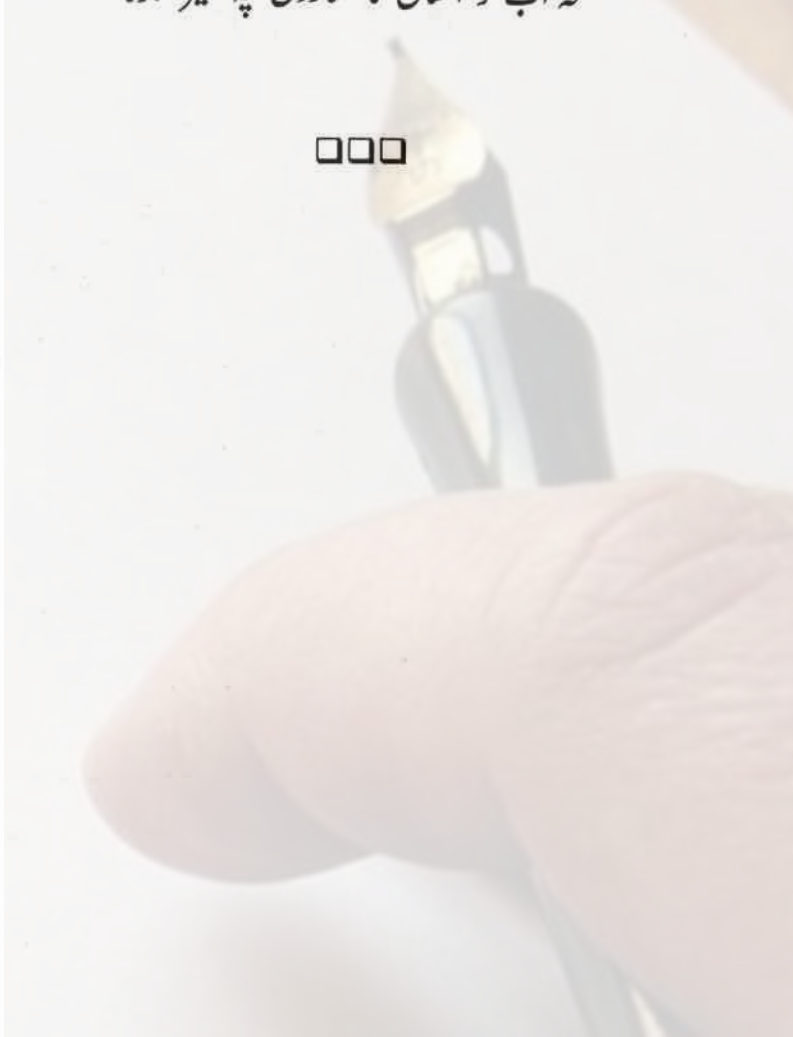
معاشی ترقی: حقیقت یا فسانہ

افراد ہوں یا اقوام، ادارے ہوں یا تنظیمیں، معاشرے ہوں یا ممالک، کامیابی کے راستے میں پائے جانے والے کانٹوں سے الجھے بغیر اور سفر کے مصائب و آلام کا دلیری اور حکمتِ عملی سے مقابلہ کیے بغیر منزل تک نہیں پہنچا جا سکتا، نہ ہی بڑے مقاصد کا حصول یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں آئے کٹھن مراحل کا مقابلہ کرنے اور مشکلات سے لڑنے کے طور طریقے سے ہی اس قوم کے اجتماعی کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ نومبر 2019ء میں چین کے صوبے ووہان سے شروع ہونے والی کورونا وبا نے 2020ء کی پہلی سہ ماہی تک پوری دُنیا کو اپنے خونیں پنجوں میں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ انسانی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، صنعتی ترقی کا پہیہ جام ہونے لگا تھا، عالمی معیشت پر نحوست چھانے لگی تھی، بیروزگاری کے سائے چہار سُو منڈلانے لگے تھے۔ خوف، گھبراہٹ، جذباتیت، ہیجان اور نفسیاتی دباؤ کے ان لمحات میں پاکستان حکومت، مسلح افواج اور دیگر ریاستی اداروں نے بروقت اور درست فیصلے کر کے پاکستان کے عوام کو اس خطرناک غیر مرئی دشمن سے محفوظ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جنگی بنیادوں پر اقدامات کیے گئے اور خود وزیر اعظم پاکستان نے ایک ٹھوس، مربوط اور قابلِ عمل حکمتِ عملی وضع کی جس کا بنیادی نکتہ پاکستان کے

غریب اور پسے ہوئے طبقے کے روزگار کے تحفظ کو یقینی بنانا تھا۔

امریکا، یورپ، برطانیہ، آسٹریلیا اور کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ممالک نے کورونا سے نمٹنے کے لیے اپنے ممالک میں مکمل لاک ڈاؤن کی پالیسی اپنائی مگر پاکستان نے اس کے برعکس جزوی بندش یا سمارٹ لاک ڈاؤن کو ترجیح دی۔ وزیراعظم نے دوٹوک الفاظ میں اپنے مؤقف کی کئی بار وضاحت کی کہ پاکستان کورونا کے خلاف جنگ میں اپنے غریب طبقے کو فاقہ کشی اور بیروزگاری کے عذاب میں مبتلا نہیں کر سکتا لہٰذا حکومت نے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے ذرائع معاش اور روزگار کو محفوظ بنانے کے لیے کئی عملی اقدام کیے۔ مائیکرو اور سمارٹ لاک ڈاؤن کے ذریعے معیشت کے پہیے کو جام ہونے سے بچایا گیا اور صنعتی پیداوار پر منفی اثرات ڈالنے کے بجائے چھوٹی صنعتوں کو کم شرح سود پر آسان قرضوں سمیت دیگر سہولتوں کا اعلان کیا گیا۔ کاروباری طبقے کے اربوں روپے کے ریفنڈز کا اجرا یقینی بنایا گیا اور اس سلسلے میں ایف بی آر نے ایک شفاف نظام کے تحت ٹیکس گزاران کے بینک اکاؤنٹس میں ریفنڈز کی رقوم منتقل کیں۔ اسی طرح صنعتکاروں کو وزیراعظم ریلیف پیکج کے تحت کئی سالوں سے پھنسے ریفنڈز کا اجرا کر کے صنعتی ترقی اور پیداواری صلاحیت کو تیزی سے بڑھانے کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور دیہاڑی دار طبقے کے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو احساس کفالت پروگرام کے ذریعے بارہ ہزار فی کس کے حساب سے امدادی رقم دی گئی جو اپنی نوعیت کا پہلا منصوبہ تھا۔ یوں گزشتہ پندرہ ماہ سے حکومت اور تمام ریاستی ادارے مل کر کورونا جیسی خطرناک وبا سے جنگی بنیادوں پر نبرد آزما ہو رہے ہیں اور بڑی حد تک اس کے پھیلاؤ کو روکنے اور نقصانات کو کم ترین سطح پر رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت سمیت پوری دُنیا نے پاکستان کی کورونا کے خلاف حکمتِ عملی اور اس کے ثمرات کی دل کھول کر تعریف کی۔

ملکی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ تعمیراتی شعبے میں ایک بہت بڑا پیکج متعارف کرایا گیا جس کا مقصد اس شعبے سے منسلک چالیس ذیلی صنعتوں میں

کاروباری حجم کو بڑھانا اور ملک میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے گورنر سٹیٹ بینک کو خصوصی ہدایات دی گئیں کہ شرح سود کم کر کے آسان قرضوں کا اجرا یقینی بنایا جائے تا کہ عام آدمی بھی اپنا گھر بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر کر سکے۔ اسی طرح زرعی شعبہ میں کسانوں کو ان کی فصل کی پوری قیمت اور بروقت ادائیگی کروانے پر زور دیا گیا تا کہ اُسے اپنی محنت کا پھل مل سکے اور پاکستان میں فوڈ سکیورٹی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اگر کبھی آپ کسی کسان سے مل کر اس سے گنے کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدن کا پوچھیں تو اس کی خوشی دیدنی ہوگی۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار گنے سے اوسطاً تین لاکھ فی ایکٹر پیداوار ہوئی ہے اور اس سے زیادہ خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس مرتبہ شوگر مل مالکان کی بھتہ خوری، غنڈہ گردی، کٹوتی اور ناپ تول میں ڈنڈی مارنے جیسے کسی ہتھکنڈے کی سختی سے مزاحمت کی گئی اور ضلعی حکومت کے ذریعے کسانوں کو ان کی فصل کی پوری قیمت اور بروقت ادائیگی کروائی گئی۔ دُنیا کے مقابلے میں اپنائی جانے والی مختلف حکمتِ عملی کے نتائج بھی مختلف متوقع تھے۔ ترقی یافتہ ممالک سمیت دُنیا بھر میں مکمل لاک ڈاؤن ہوا، صنعتی پہیہ جام ہوا اور معاشی بدحالی عام ہوئی مگر اس کے برعکس پاکستان میں لارج سکیل مینوفیکچرنگ شعبے میں بے پناہ پیداواری اضافہ دیکھنے کو ملا حتیٰ کہ ٹیکسٹائل سیکٹر میں ڈبل شفٹ کام کرنے کے باوجود مزید آرڈر لینے کی گنجائش نہ رہی جس سے پاکستان کی برآمدات میں خاطرخواہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ کورونا کے خلاف جنگ میں پاکستان نے کسی بوکھلاہٹ یا دباؤ کا شکار ہوئے بغیر بڑی پائیدار، دوررس اور مربوط حکمتِ عملی سے نہ صرف کورونا کی مہلک وبا کا دلیری سے مقابلہ کیا بلکہ پاکستانی عوام کو اس سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معیشت کے تمام اشاریے مثبت پیش رفت دکھا رہے ہیں۔

رواں مالی سال کی شرح نمو 3.94 تک پہنچ چکی ہے اور یہ یقیناً عالمی معاشی بحران اور کورونا کے منفی اثرات کے دور میں ایک قابلِ قدر کامیابی ہے۔ قومی معیشت کا مجموعی حجم 41.55 ٹریلین روپے سے بڑھ کر 47.09 ٹریلین ہو چکا ہے جو گزشتہ سال سے 14.8 فیصد زیادہ ہے۔ اسی طرح

پاکستان میں فی کس سالانہ آمدنی 215060 روپے سے بڑھ کر 246414 روپے تک پہنچ چکی ہے۔ پاکستان کے زرعی شعبے میں گندم، چاول اور مکئی کی فصلوں میں ریکارڈ پیداوار دیکھنے کو ملی ہے۔ گنے کی فصل کی پوری قیمت اور بروقت وصولی نے کسان کو نیا عزم اور ولولہ دیا ہے اور وہ خود کو پہلے سے زیادہ خوشحال تصور کرتا ہے۔ صنعتی شعبے میں ٹیکسٹائل، خوراک، تمباکو، کیمیکل، آٹو موبل اور کھاد کے شعبوں کی پیداوار میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ تعمیراتی شعبے میں 8.34 فیصد جبکہ فنانس اور انشورنس سیکٹر میں 7.84 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ملک میں معاشی اشاریے بہتر ہونے کا ایک ثبوت سیمنٹ کی ریکارڈ پیداوار اور کھپت ہے جس میں 44 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح ملک تجارتی خسارہ کم کرنے اور کرنٹ اکاؤنٹ کو سرپلس کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ملکی برآمدات رواں مالی سال کے پہلے دس ماہ میں 20.87 بلین ڈالر تک پہنچ چکی ہیں جو گزشتہ سال کے اس دورانیے سے 13 فیصد زیادہ ہیں۔ بیرونِ ملک پاکستانی 25 فیصد ریکارڈ اضافے کے ساتھ اس سال کے پہلے دس ماہ میں 2 بلین ڈالر سے زائد رقم پاکستان بھجوا چکے ہیں۔ سٹیٹ بینک کے منفرد روشن ڈیجیٹل اکاؤنٹ میں بیرونِ ملک پاکستانی ایک بلین ڈالر سے زائد رقم بھجوا چکے ہیں جو یقیناً پاکستانی معیشت پر اُن کے اعتماد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سب سے زیادہ خوش آئند پہلو اور معاشی اشاریوں میں بہتری کا بین ثبوت ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایف بی آر کا رواں مالی سال کے پہلے گیارہ ماہ میں چار ٹریلین روپے سے زائد ٹیکس اکٹھا کرنا ہے جو یقیناً ایک طرف ایف بی آر کی استعدادِ کار اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف ملک میں جاری معاشی سرگرمیوں کے حجم کا آئینہ دار ہے۔

وزیرِ خزانہ پہلے ہی شرحِ نمو کو اگلے مالی سال میں 6 فیصد تک لے جانے کا اعادہ کر چکے ہیں اور ساتھ ہی انھوں نے اس سلسلے میں اپنی حکمتِ عملی کے بنیادی نکات کی نشاندہی بھی کی ہے جس کے تحت چھوٹی صنعتوں اور کسانوں کو بلاسود اور آسان قرضوں کی فراہمی، قیمتوں میں کمی اور استحکام، بڑے ترقیاتی منصوبوں کا آغاز اور نچلے طبقے کو معاشی طور پر مضبوط بنانا اور غربت کی لکیر

سے اوپر لانا شامل ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دن پاکستان اور پاکستانی عوام کے لیے خوشحالی کی نوید بن کر آئیں گے اور مہنگائی، بیروزگاری اور غربت کی چکی میں پسنے والے لاکھوں خاندانوں کے لیے جینا محال اور زندگی وبال نہ ہوگی۔

❑❑❑
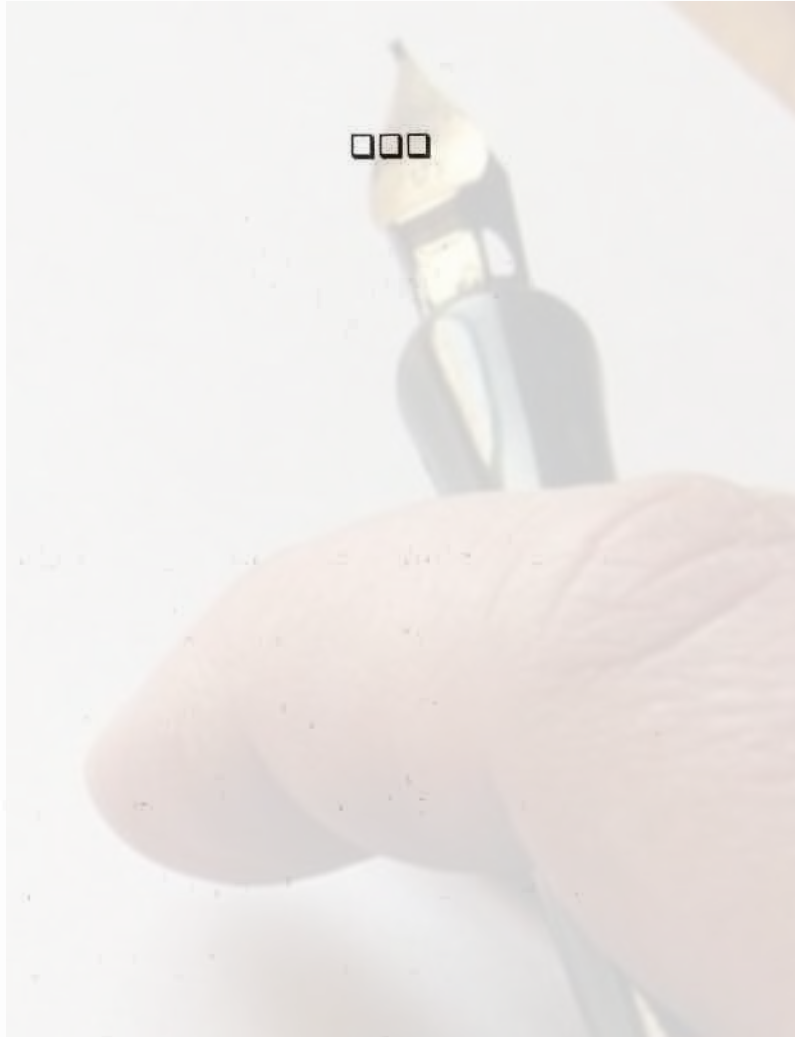
آبلہ پا افغانستان

عالمی نظام میں ایک طرف خوبصورت نعرے، دلآویز دعوے اور دلکش وعدے ہیں جو دنیا کو جمہوریت کے حُسن، امنِ عامہ کے فضائل اور انسانی حقوق کی علمبرداری کا درس دیتے ہیں، انسان کی عزت وتکریم کا بول بالا کرتے ہیں اور انسانی ترقی وخوشحالی کے لیے عملی اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ آئے روز بین الاقوامی سطح سے لے کر علاقائی نوعیت تک اَن گنت ایسی تقریبات منعقد ہوتی ہیں، سیمینار اور مذاکرات دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے موضوعات کا بنیادی نکتہ انسانی خوشحالی، معاشی استحکام اور سماجی ترقی کے گرد گھومتا ہے مگر یہ تصویر کا محض ایک پہلو ہے جبکہ اس کا دوسرا تاریک اور بھیانک رخ اس نظام کا اصل چہرہ ہے جو ہر وقت آگ اور خون کے کھیل میں انسان کی بے بسی، بے حسی اور بے کسی کی عملی تصویر سے عبارت ہے۔ مشہورِ زمانہ امریکی سیاستدان ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ امریکہ سے دشمنی خطرناک ہوسکتی ہے مگر اس کی دوستی مہلک ہے۔ کہتے ہیں کہ سیاست بے رحم ہوتی ہے، اس کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ کارزارِ سیاست میں محض مفادات مقدم ہوتے ہیں، اصول وضوابط یا اخلاقیات صرف ثانوی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اکثر ان

کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ کل کے دوست آج دشمن اور آج کے دشمن کل کے دوست بن جاتے ہیں۔ ہنری کسنجر کے مذکورہ تجزیے کی عملی مثال ماضی قریب میں اس وقت دیکھنے کو ملی جب برطانیہ امریکہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہو کر عراق کے خلاف بُری طرح استعمال ہوا۔ امریکہ نے اسے جنگ میں خوب جھونکا اور صدام حسین پر بے بنیاد الزامات لگا کر نہ صرف اقتدار سے الگ کیا بلکہ نشانِ عبرت بنا دیا۔ امریکہ سے دوستی کی قیمت برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کو ادا کرنا پڑی اور اسے ٹین ڈاؤننگ سٹریٹ میں واقع وزیراعظم ہاؤس خالی کرنا پڑا۔ یہی حال اس کے دیگر اتحادی ممالک کا رہا بلکہ نیٹو کا سارا نیٹ ورک امریکہ سے دوستی کی بھاری قیمت چکا رہا ہے۔ سرد جنگ سے لے کر افغانستان کی شرمناک شکست تک اسے شدید جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس جدید نظام کا یہ اصلی چہرہ ہے، اس کا بھیانک پہلو۔ جو نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہوتا اور جو اصل حقیقت ہوتی ہے وہ کئی خوبصورت پردوں میں چھپا دی جاتی ہے اور منظرِ عام کا حصہ نہیں بن پاتی۔

افغانستان کا موجودہ بحران اور انسانی المیہ ہنری کسنجر کے تجزیے کی عملی مثال اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آج کے افغانستان میں اگر بھوک ہے، افلاس ہے، غذائی قلت ہے، ادویات کی شدید کمی ہے، بچے موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور آئے روز بحران مزید بگڑتا جا رہا ہے تو اس کے پیچھے بھی امریکہ کی ''دوستی'' ہی کارفرما ہے جس کی ''لازوال داستان'' اس وقت رقم ہوئی جب دسمبر 1979ء میں سرد جنگ عروج پر تھی اور سوویت یونین امریکہ کو ویتنام کی جنگ میں عبرت ناک شکست سے دوچار کر چکا تھا۔ اس واضح فوجی برتری کے نشے میں چور وہ افغانستان پر چڑھ دوڑا۔ افغانستان کی سنگلاخ زمین میں موجود دشمن سے ویتنام کی شکست کا بدلہ لینے کا سنہری موقع امریکہ کے ہاتھ لگ گیا، اس نے فوراً پاکستان کو اپنا کلیدی حلیف بنا کر افغانستان میں فوجی اور مالی امداد کا راستہ ہموار کیا اور سوویت یونین کو چاروں شانوں چت کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہی وہ دور تھا جب پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں طالبان کی نرسری لگائی گئی اور اس فصل کی تیاری میں امریکہ

نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ افغان وار لارڈز واشنگٹن میں امریکی صدر رونالڈ ریگن سے بغل گیر ہوتے، مصافحے اور معانقے کرتے۔ انھیں اعلیٰ ترین سفارتی پروٹوکول سے نوازکر ان کے اعزاز میں پُرتکلف عشائیے اور ظہرانے سجائے جاتے۔ یہ سیاسی تاریخ میں امریکہ اور افغانستان کے مابین تیزی سے بڑھنے والے اس رومانس کے شب وروز تھے جس کی قیمت آج افغانستان اور اس کے بدنصیب عوام چکا رہے ہیں۔

امریکہ نے سوویت یونین سے ویتنام جنگ کی شکست کا بدلہ چکا لیا اور زخموں سے چور سوویت یونین افغانستان سے ماسکو واپسی تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے سوویت یونین کے صدر گورباچوف نے سرد جنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور اپنی شکست تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال کر سرِتسلیم خم کرلیا۔ اس تاریخی فتح پر امریکہ نے پاکستان اور افغانستان کے احسانات کا بدلہ چکانے کے بجائے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور ایک طرف پاکستان پر پریسلر ترمیم کے ذریعے فوجی امداد کے دروازے بند کر دیئے تو دوسری طرف افغانستان کو بدترین اندرونی خانہ جنگی میں جھونک دیا۔ پھر جب وہاں طالبان نے حکومت قائم کر لی تو انھیں امریکہ نے دہشت گرد قرار دے دیا جنھوں نے امریکی اتحادی کے طور پر سوویت یونین کو بدترین شکست سے دو چار کیا تھا بلکہ نائن الیون کے فوراً بعد امریکہ نے نیٹو اتحادی افواج کے ہمراہ کابل پر فوج کشی کر دی اور اسے آگ اور خون کی عملی تصویر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ 20 سال کی طویل جنگ میں افغانستان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کے لیے بدترین مثالیں قائم کی گئیں۔ انسانی حقوق کی پامالی سے لے کر معاشی بدسلوکی تک، امریکہ اور اس کے اتحادی طالبان اور افغان عوام پر زندگی کے سبھی دروازے بند کرتے رہے اور اپنی طاقت اور فوجی حکمتِ عملی کے تمام حربے آزماتے رہے مگر بالآخر صدر جو بائیڈن نے 20 سالہ جنگ کو سعیٔ لاحاصل قرار دیا اور اپنی افواج کو افغانستان سے نکالنے کا اعلان کر دیا۔ اس اچانک فیصلے سے اتحادی بھی چونک اٹھے؛ تاہم انھیں افغانستان سے رخصت ہوتے ہی بنی۔

آج پھر افغانستان میں طالبان کی حکومت ہے اور اس پر امریکہ نے قافیۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اس کے غیر ملکی اکاؤنٹس منجمد کر رکھے ہیں اور وہاں کسی بھی قسم کی بیرونی مالی امداد نہیں پہنچ رہی۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ افغانستان کا بحران شدید ترین نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایک طرف غذائی ضروریات کی قلت ہے تو دوسری طرف ادویات اور دیگر اشیائے ضروریہ ناپید ہیں۔ ورلڈ فوڈ پروگرام اور اقوامِ متحدہ افغانستان میں بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو تشویش ناک قرار دے رہے ہیں۔

افغانستان میں نومولود بچے دودھ اور غذا کی عدم دستیابی کے باعث لقمۂ اجل بن رہے ہیں، بیروزگاری اور غربت و افلاس کے چہار سُو پھیلتے گہرے سائے افغانستان کے بحران کو مزید پیچیدہ کر رہے ہیں۔ اسی بحران کو مزید شدت سے بچانے کے لیے اور افغان عوام کے دکھ اور پریشانیوں کو محسوس کرتے ہوئے پاکستان نے او آئی سی وزرائے خارجہ کونسل کا سترہواں ہنگامی اجلاس اسلام آباد میں بلا کر اس سنگین انسانی المیے کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس غیر معمولی اجلاس میں او آئی سی کے رکن ممالک کے علاوہ بین الاقوامی مندوبین بھی شریک ہوئے ہیں جن میں 20 وزرائے خارجہ اور 10 نائب وزرائے خارجہ کے علاوہ کل 70 کے لگ بھگ مندوبین شریک ہوئے۔ اگرچہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا مگر انسانی جانوں کا ضیاع اور بچوں کا بھوک پیاس سے مر جانا آج کی ترقی یافتہ دنیا اور اس کے نیم مردہ ضمیر پر ایک سوالیہ نشان ضرور ہے۔ دیکھنا یہ ہے کیا او آئی سی کے رکن ممالک اور ان کے عوام افغانستان کے عوام کے دکھ، درد اور افلاس کو اپنا درد سمجھتے ہوئے ان کے لیے عملی اقدامات بھی کریں گے یا یہ کانفرنس محض اعلامیوں اور وعدوں کے انبار میں دفن ہو جائے گی، جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے۔ پاکستان نے اس کانفرنس کی میزبانی کر کے نہ صرف اپنی حیثیت اجاگر کی ہے بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی اپنے کلیدی کردار کو منوایا ہے۔ اسلام آباد نے اس بحران میں افغان بھائیوں کے لیے پہلے ہی 17 ہزار میٹرک ٹن گندم، دیگر خوراک اور ادویات بھجوا دی ہیں اور بھارت کی طرف سے دیئے جانے والے

50 ہزار میٹرک ٹن امدادی سامان کو اپنے زمینی راستے سے افغانستان جانے کی اجازت بھی دی ہے۔ آج افغانستان مشکلات سے دو چار ہے اور پورا ملک آبلہ پا ہے۔ انسانی ہمدردی، بھائی چارے اور اسلامی اخوت کے عملی مظاہرے کا وقت آن پہنچا ہے۔
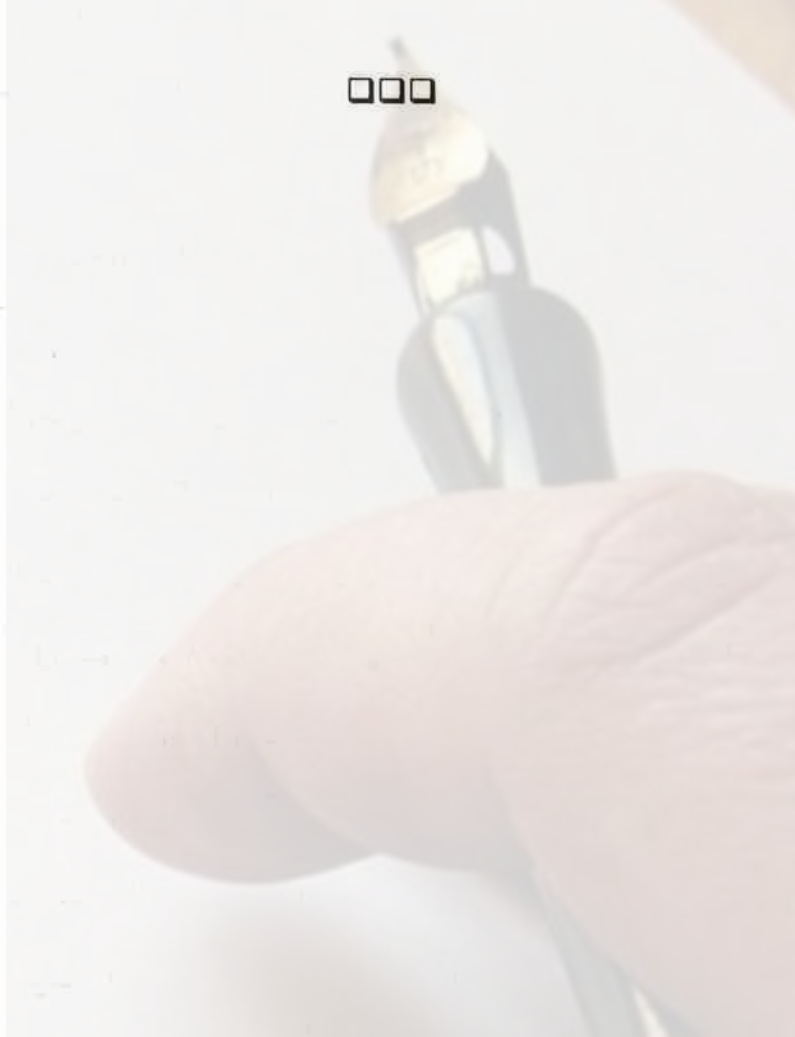
فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا

وہ سندھی لہجے میں اردو بولتے ہوئے اچھا لگا، اس کی آواز میں بے پناہ مٹھاس اور بلا کی خود اعتمادی تھی۔ وہ الفاظ کے چناؤ میں محتاط اور عاجزی کا پیکر بنا میرے ساتھ نہایت ادب سے گفتگو کر رہا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس مناسب الفاظ کے ساتھ ساتھ بہترین معلومات بھی تھیں کیونکہ شاید گزشتہ چند دنوں سے یہی سوالات اس سے سینکڑوں مرتبہ پوچھے جا چکے تھے۔ بلا شبہ وہ جرأت و بہادری کی ایک انوکھی داستاں رقم کر چکا تھا۔ اپنے سنہری کارنامے کی وجہ سے کشمور تھانے میں تعینات اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمد بخش اب قابلِ فخر قومی ہیرو بن چکا تھا۔ اندرونِ سندھ جہاں کاروکاری جیسی انسانیت سوز رسومات اور فرسودہ قدریں آج بھی پوری شدومد سے اپنے خونیں پنجے گاڑے ہوئے ہیں، وہاں کارِسرکار کی انجام دہی میں ایک مظلوم ماں، جسے کچھ وحشی درندوں نے ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی چار سالہ ننھی بیٹی کو درندگی سے روند ڈالا تھا، کی ہر ممکن مدد یقینی بنانے کے لیے محمد بخش نے فرسودہ رسومات اور سماجی دباؤ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیوی اور بیٹی کو ایک تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دینے کے حوالے سے تیار کرنے کے لیے جس ہمت وحوصلہ کا ثبوت دیا وہ یقیناً قابلِ تقلید ہے اور قابلِ تحسین بھی۔ ایسے بیٹے بہت کم

مائیں جنتی ہیں، ایسے فرض شناس بہت کم ملتے ہیں جو اپنی ڈیوٹی کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہوئے اپنا تن، من، دھن نچھاور کر دیں اور دائیں کندھے پر سجے ''محافظ'' کا عملی ثبوت بن جائیں۔

اگرچہ اس دل خراش واقعہ کی تمام تفصیلات پہلے ہی ایس ایس پی کشمور سے گفتگو کے دوران جان چکا تھا پھر بھی میں یہ سب اس عظیم کارنامے کو انجام دینے والے مرکزی کردار اے ایس آئی محمد بخش کی زبانی سننے کے لیے بے تاب تھا۔ واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے اُس نے بتایا کہ 30 اکتوبر کی دوپہر ایک عورت تھانہ کشمور کے محرر کے پاس پیش ہوئی اور اپنے ساتھ ہونے والے اندوہناک ظلم و بربریت کے بارے میں تفصیلات بتانا شروع کیں تو وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا اور اس نے اس سائلہ کو میرے پاس بھجوا دیا۔ مجھے اس نے دل لرزا دینے والی داستانِ غم سنائی کہ کس طرح 25 اکتوبر کو کراچی سے رفیق نامی شخص نوکری کا جھانسہ دے کر اسے کشمور لے آیا جہاں وہ اسے اور اس کی چار سالہ بیٹی کو جنسی درندگی کا نشانہ بناتا رہا۔ وہ اس کی بچی کو یرغمال بنا کر تبسم کو کراچی سے مزید ایک اور لڑکی لانے کا کہہ رہا تھا جس پر وہ تھانے پہنچ گئی۔ وہ اس شہر میں اجنبی تھی اور اُسے ملزمان کے بارے کچھ معلوم نہ تھا، صرف اُس کے پاس کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھے دو موبائل فون نمبر تھے جو اس نے محمد بخش کے حوالے کیے تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

اُس نے سائلہ کو تھانے کے قریب واقع مسجد بھیج دیا تا کہ وہ وہاں آرام کر سکے اور خود ان نمبرز پر کال کر کے ملزمان تک پہنچنے کی جستجو میں لگ گیا۔ اپنی مسلسل بے چینی کے سبب دو گھنٹے بعد مظلوم عورت دوبارہ تھانے آ گئی اور محمد بخش اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیٹی اور بیوی کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر دوبارہ سرکاری امور میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران اسے گھر سے ٹیلیفون پر بتایا گیا کہ تبسم بہت رو رہی ہے اور اپنی بیٹی کی فوری بازیابی کے لیے دہائیاں دے رہی ہے کہ جانے اُن درندوں نے اس کا کیا حال کیا ہوگا۔ بات بات پہ وہ تڑپ جاتی اور شدتِ غم سے اس

نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔محمد بخش کی بیوی اور بیٹی بھی اب اُس مظلوم عورت کی ہر ممکن مدد کے لیے محمد بخش پر دباؤ بڑھا رہی تھیں۔ اسی دوران اُس نے ان دو نمبروں پر کال کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند روز بعد ایک نمبر پر اس کی بات ایک ملزم خیراللہ کے چھوٹے بھائی سے ہوئی۔محمد بخش نے اسے بتایا کہ وہ وزیراعظم کے احساس پروگرام کا منیجر ہے اور یہ کہ اس کے پچاس ہزار آئے ہیں جنھیں وہ آ کر وصول کرلے۔ ساتھ ہی اُسی نمبر پر تبسم نے بھی بات کی تو ملزم رفیق سے رابطہ ہو گیا جس پر اُس نے کہا کہ اگر اپنی بیٹی چاہیے تو اس کے بدلے اسے ایک اور لڑکی لا کر دے۔محمد بخش کے کہنے پر تبسم نے دو تین دن میں عورت لانے کا وعدہ کرلیا۔

اس کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانے میں لیڈی پولیس کی ضرورت اور اہمیت پر غور کیا گیا مگر ضلع بھر کی پولیس میں ایک بھی لیڈی کانسٹیبل نہ ہونے سے یہ معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا۔اب محمد بخش کے پاس ان ظالم درندوں کو ان کی جنسی ہوس کے جال میں پھنسانے اور ان سے ننھی بیٹی کو آزاد کرانے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا، اس لیے اس نے اپنی بیٹی اور بیوی کو اعتماد میں لیا اور ان دونوں کو ملزمان کے ساتھ ٹیلیفون پر روابط بڑھانے اور ان کو اپنے جال میں پھنسانے کا ٹاسک دے دیا جسے اُن عظیم ماں بیٹی نے مل کر خوب نبھایا۔ بالآخر اپنی ہوس کی شدت کے ہاتھوں مجبور رفیق 9 نومبر کو اس عورت اور اس کی ساتھی عورت، جس کا کردار خود محمد بخش کی بہادر بیٹی انجام دے رہی تھی، سے سٹی پارک کشمور میں ملنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس سٹنگ آپریشن کی سربراہی کشمور تھانہ کے ایس ایچ او حبیب اللہ مہر جبکہ نگرانی کشمور ضلع پولیس کے ایس ایس پی امجد احمد شیخ بڑی باریک بینی سے کررہے تھے، طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت پولیس پارٹی نے سٹی پارک کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا۔ سادہ کپڑوں میں پولیس کے جوان اور محمد بخش کا اکلوتا جواں سال بیٹا بھی پارک کے اندر چہل قدمی کرنے لگا۔ ملزم رفیق نے ان خواتین کو ٹیلیفون کر کے پارک سے باہر آنے کا کہا جس پر اسے کہا گیا کہ وہ کراچی سے آئی ہیں اور علاقے سے واقف نہیں لٰہذا وہ خود انھیں اپنے ساتھ لے جائے۔ بالآخر وہ ظالم بھیڑیا نما انسان پارک کے اندر داخل ہوا۔محمد بخش کی

بیٹی نقاب پہنے ہوئے تھی جسے ہٹانے کے لیے اس نے جونہی ہاتھ آگے بڑھایا تو اس بہادر لڑکی نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اسی اثنا میں محمد بخش اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھیرے میں لیا اور گرفتار کر کے سیدھا تھانے لے آئے۔ یوں یہ مشن کامیابی سے ہمکنار ہوا مگر اب اگلا ہدف وحشی درندوں سے ننھی بچی کی بازیابی اور رہائی تھی۔ تھانے پہنچ کر رفیق سے بچی کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کے گھر میں موجود ہے۔ محمد بخش فوراً پولیس پارٹی کے ہمراہ رفیق کے گھر گیا تو ایک کمرے میں چند خون آلود کپڑے نظر آئے جن کو قریب سے دیکھنے پر پتا چلا کہ ننھی بچی زندگی اور موت کی کشمکش میں بے سدھ پڑی ہے۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا اور پھر وہاں سے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف چائلڈ کیئر کراچی پہنچا دیا گیا جہاں اس کا علاج سرکاری نگرانی میں جاری ہے۔ پولیس نے ملزم رفیق کی نشاندہی پر اُس کے ساتھی خیر اللہ کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا تو اِس آپریشن کے دوران مبینہ طور پر ملزم رفیق اپنے ہی ساتھیوں کی فائرنگ کا نشانہ بن گیا؛ تاہم اُس کا ساتھی ملزم خیر اللہ قانون کی گرفت میں آ چکا ہے۔

اس دلخراش واقعے نے سوشل میڈیا پر جہاں کہرام برپا کیا وہاں کشمور تھانے میں تعینات اے ایس آئی محمد بخش کی بے مثل فرض شناسی، فقید المثال جرأت و بہادری کا بھی خوب چرچا رہا۔ فرض شناسی اور اعلیٰ ظرفی کی نئی داستان رقم کرنے والا محمد بخش قومی ہیرو بن گیا جس کا یقیناً وہ مستحق بھی ہے۔ ایسے بیٹے مائیں بہت کم جنم دیتی ہیں جو کسی مظلوم کی تڑپ کو صحیح معنوں میں محسوس کریں اور کسی کی معصوم کلی کو وحشی بھیڑیوں سے رہا کرانے کے لیے اپنی لختِ جگر کی عصمت کو داؤ پر لگا دیں۔ کسی کا درد اپنا لینا، کسی مظلوم کی داد رسی میں اپنی جان، عزت اور غیرت قربان کر دینا، دہکتی آگ میں اپنے پیاروں سمیت بے خوف و فکر کود پڑنا دراصل انسانیت کی معراج ہے۔ سندھ پولیس کا محمد بخش آج پورے پاکستان کا قابلِ فخر بیٹا اور قومی ہیرو بن چکا ہے۔ وہ یقیناً فرض شناسی کا استعارہ اور انسانی کردار کی عظمت کا پیکر ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے اس شعر کی عملی تشریح کشمور پولیس کے اے ایس آئی محمد بخش کے سنہری کارنامے

میں ہمیشہ کے لیے امر ہو چکی ہے...

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

❑❑❑
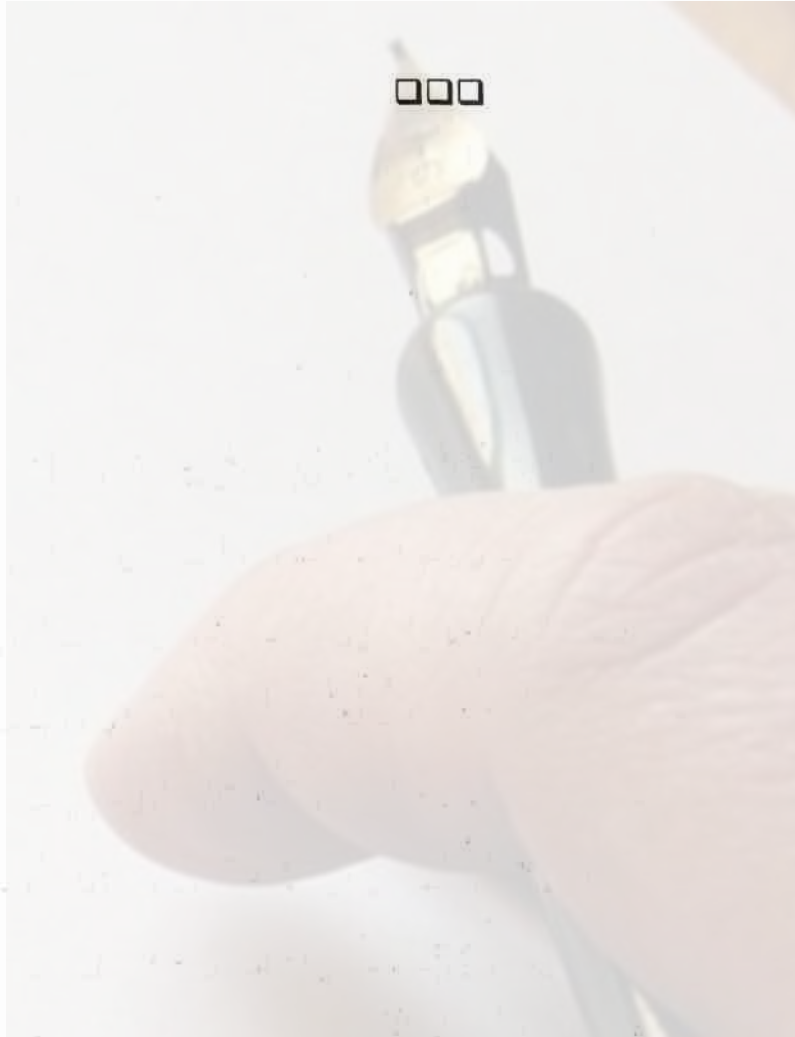
زندگی

زندگی کی حقیقت پر غور کریں تو یہ خوشی اور غم کا حسین امتزاج نظر آتی ہے۔ کبھی چھاؤں، کبھی نرمل اور کبھی کڑکتی دھوپ! زندگی کے اتنے روپ ہیں کہ ضابطۂ تحریر میں لانا شاید ممکن نہ ہو۔ مصور کی آنکھ سے دیکھیں تو زندگی کے کینوس پر رنگوں کا بکھرنا، شاعر کے لیے اس کی شاعری! طالب علم کے لیے زندگی کا مقصد و مفہوم مختلف ہوگا۔ کسی زاہد اور صوفی کا زندگی سے متعلق نظریہ مختلف ہوگا۔ میرے خیال میں زندگی کا مقصد کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے راستے کا تعین کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی ہماری ہے تو مقصدِ زندگی بھی ہم نے ہی متعین کرنا ہے۔ مقصدِ حیات کیا ہے؟ اس کی بنیاد کن عوامل پر رکھی جاتی ہے؟ کامیابی کسے کہتے ہیں؟ اس کا راستہ کہاں سے گزرتا ہے؟ مصائب اور مشکلات کا تدارک کیسے کرنا ہے؟ مستقل مزاج شخص کس طرح حالات و واقعات کا سامنا کرنے کے لیے ہمت برقرار رکھتا ہے؟ اس کو کون کون سے عوامل قوت اور تحریک دیتے ہیں؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے علم کی بنیاد پر ہی تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے۔ سیاروں، ستاروں، زمین و آسمان، سمندر کی گہرائیوں اور خلا کی وسعتوں کی تسخیر کا حکم انسان کو ہی ملا۔ تمام مخلوقات کو اس کی سہولت کے لیے بنایا گیا کیونکہ اس عالمِ رنگ و بُو میں انسان کا وجود ہی محور ہے مگر یہاں یہ بات

اہم ہے کہ زندگی سانسوں کی ڈور کا نام نہیں کیونکہ زندہ رہنا اور زندہ ہونے میں بہت فرق ہے۔ زندگی کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے اور دوسروں کے سکون اور آرام کا خیال رکھنا ہے تاکہ زندگی اگر ختم ہو جائے، اس کا نشان تک مٹ جائے تب بھی نام سلامت رہے۔ انسان کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو سایہ بھی مہیا کرتا ہے اور پھل پھول بھی۔ خود جھلتا ہے مگر اس کے سائے میں چرند، پرند اور مسافر اپنی تھکن اتارتے اور ستاتے ہیں۔ وہ خود پتھر کھاتا ہے مگر پھل اور سایے سے محروم نہیں کرتا ہے، اپنی سرشت تبدیل نہیں کر سکتا۔

مقصدِ حیات کا تعین کرتے وقت چند اہم باتیں مدِنظر رکھنا ضروری ہیں۔ ہر ایک شخص کی سوچ کا اپنا مزاج اور زاویہ ہوتا ہے۔ کسی نے مذہبی، کسی نے اسے سماجی و سیاسی اور کسی نے ثقافتی پہلو کے ساتھ جوڑا ہوگا۔ ہم سب اپنے سے وابستہ لوگوں کی توقعات اور ضروریات کو اپنے مقصد کا تعین کرتے وقت مدِنظر رکھتے ہیں۔ مقاصد کی ترجیحات کے لیے تین بنیادی چیزوں کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ جو بھی مقصدِ حیات ہو وہ کوئی وقتی ضرورت نہ ہو کیونکہ اگر ضرورتوں کو مقصد بنا لیا جائے تو ضرورت پوری ہو جانے کے بعد کیا کریں گے؟ دوسری چیز ہے وقت کی حدود۔ کسی خاص کام کی انجام دہی کے لیے وقت مقرر کیا جا سکتا ہے مگر زندگی بھر کے لیے نہیں۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ مقصدِ حیات ایسا ہو کہ آپ کے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ساتھ دیگر لوگ بھی خوشی اور سکون محسوس کر سکیں۔ آپ دنیا میں رہیں یا چلے جائیں، وقت کی ریت پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ کر جائیں۔ دراصل زندگی کا اصل مقصد ایک بامقصد ڈگر پر چلنا ہے۔ کچھ لوگوں کے مقاصد مابعد الطبیعاتی، کچھ کے جسمانی ہوتے ہیں، کچھ جذباتی اور کچھ دماغ سے کام لینے کی سطح پر ہوتے ہیں۔ جسمانی ضروریات کو مقدم رکھنے والے لوگ کھانے، پینے، پہننے، نفسانی خواہشات کی تکمیل، گھر، گاڑی اور روپے پیسے کو جائز اور ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں مگر یہ سب حاصل ہو جانے کے بعد کیا مقصد رہ جاتا ہے؟ دل کی تسکین کو فوقیت دینے والے فطرت سے پیار، ثقافت، آرٹ، سیاحت اور فنونِ لطیفہ سے وابستگی،

جانوروں سے لگاؤ، شاعری اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے نظر آئیں گے۔ ایسے افراد روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ زندگی سے خوبصورتی کشید کرتے ہیں اور حساس دل رکھتے ہیں۔ دماغی صلاحیتوں کے حامل افراد فکر و استدلال اور علم و آگہی کی منازل کے مسافر ہوتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ کچھ نیا سوچتے ہیں، نئے خیالات اور منفرد سوچ کی وجہ سے قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود وقت کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ دنیا کی ترقی اور انسانی خوشحالی میں ان افراد کا بھرپور کردار رہا ہے اور انہی اعلیٰ سوچ کے حامل باصلاحیت افراد نے نہ صرف ذاتی سطح پر کمال ترقی کی بلکہ پوری بنی نوعِ انسان کے لیے نئی راہیں متعین کیں اور اجتماعی مفاد کو اپنی ذات پر مقدم رکھا۔ دراصل اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حامل یہی لوگ کسی معاشرے کا حقیقی سرمایہ ہوتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال یہ لوگ ملک و قوم کی بہتری اور اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ تھنک ٹینکس، سائنسدان اور فلسفہ و منطق کے اسرار و رموز کی گھتیاں سلجھانے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ ایک درجہ روحانیت کے قائل افراد کا ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کرشماتی اور بے لوث ہوتی ہے۔ صوفیا، مبلغین، مصلحین اور صالحین ہر دم کائنات کی الجھی گھتیوں کو سلجھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ لوگ ان کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں، ان میں اچھے برے کی تفریق نہیں ہوتی کیونکہ وہ محض انسان سے محبت کرتے ہیں اور نفرت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ایسا بھی نہیں کہ یہ تقسیم مستقل ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مختلف مقاصد کے لوگ کسی حد تک ہر درجے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انسانی دماغ حکم صادر کرتا ہے اور جسم اس پر عمل کرتا ہے جبکہ صلاحیتیں حق تعالیٰ کی بخشش ہیں۔ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور ان کا بہترین استعمال ہی مقصودِ زندگی ہوتا ہے۔ اس میں محنت، مستقبل مزاجی، جبلّتوں کی قربانی اور ترجیحات کی درجہ بندی وہ بنیادی عناصر ہیں جو زندگی کو بامعنی اور خود کو ایک اثاثہ ثابت کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے، وہ امرِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں خاص وقت کے لیے، مخصوص زمانے میں، منفرد اوصاف اور شکل و صورت کے ساتھ پیدا فرمایا۔ ہر انسان کا اپنا مقام،

اپنی جگہ ہے۔ اس کی موت کے بعد یہ خلا رہتا ہے، کوئی اور اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ دنیاوی زندگی کی بنیاد پر ہی اخروی زندگی کا دار و مدار ہے۔ انبیا کرام، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، صالحین، ائمہ کرام، صوفیائے کرام اور مبلغین نے مقاصدِ زندگی کو رضائے الٰہی کے تابع کر لیا اور اللہ کی خوشنودی کو حاصلِ زندگی بتایا۔ اسی راستے پر چل کر انسانیت کی حقیقی فلاح ممکن ہے۔ وقت کا سیلِ رواں ہر لمحہ جاری و ساری رہتا ہے اور انسان مسلسل حالتِ سفر میں ہے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ہماری پلاننگ میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ہم سب کو اپنی خوبصورت شکل پسند ہے، کوئی جھریوں بھرا چہرہ نہیں چاہتا۔ ہم سب کو اپنی آنکھیں اچھی لگتی ہیں، کوئی عینک نہیں چاہتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وقت ٹھہر جائے، ہماری ہمت، طاقت اور جاہ و جلال ہمیشہ برقرار رہیں مگر ایسا ممکن نہیں۔ یہ ہمارے بس میں نہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کل کی ہی بات ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے مگر ہم مرنا نہیں چاہتے۔

زندگی کے رنگ اتنے دلکش ہیں کہ ہم ان میں کھو گئے ہیں۔ زندگی خالقِ دو جہاں کا حسین تحفہ ہے، کرم ہے، عطا ہے، نعمت ہے اور اس زندگی کے بعد ایک اور خوبصورت زندگی جو اس سے ہزاروں درجہ اعلیٰ نعمتوں اور آسائشوں سے مزین ہے، ہماری منتظر ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ زادِ راہ میں ہمارے پاس اعمال کی جو جمع پونجی ہے، کیا ان کی بنیاد اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے تابع ہے یا ہماری زندگی کا مقصد اس فانی دنیا کی آسائشوں اور سہولتوں کے حصول تک محدود ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے میں خوشی، سکون اور اطمینان پوشیدہ ہے۔ ہم اپنی ضرورتوں کو محدود کرنے اور ذاتی عزائم اور خواہشات پر قابو پالیں تو وقت، حالات، مسائل و معاملات کو بہتر طور پر سمجھا اور سلجھایا جا سکتا ہے۔ قدرتی آفات، زلزلے، طوفان، حادثات، بیماریاں، موت، وبائی امراض اور موسمیاتی تبدیلیاں انسانی زندگی کے لیے ہمیشہ سے چیلنج رہے ہیں۔ ہر دور میں انسان ان سے نبرد آزما رہا ہے۔ زندگی اس وقت مشکل ہو جاتی ہے جب نفرت، حسد، تنگ نظری، جبر اور غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور انسان اپنے ہی جذبات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، ایسے

میں امید، آرزو، محبت، اخلاص، تحمل و برداشت، محنت اور لگن کے زریں اوصاف ہی کام آتے ہیں۔ انہی سنہری اصولوں کو عملی طور پر رائج کر کے زندگی کے حُسن کو دوبالا کیا جاسکتا ہے کیونکہ انسان کا کردار ہی تو اس کی زندگی کا حاصل ہے۔
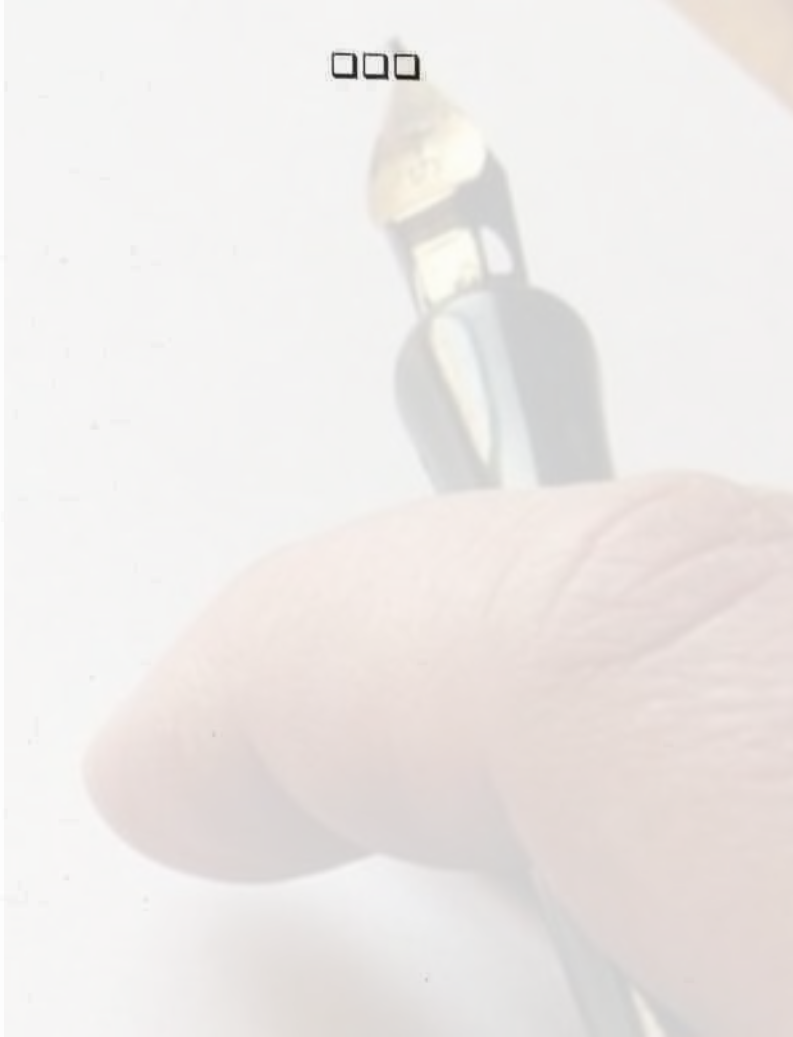
بادِنو بہار

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر مغربی استعماری قوتوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر کئی ریاستیں آزاد ممالک بن چکی تھیں۔ نوزائیدہ مملکتوں میں شروع سے ہی فیصلہ کن حیثیت کے حامل کلیدی عہدے مرد حضرات کے پاس نظر آئے اور محض چند ممالک میں خواتین نمایاں نظر آئیں۔ عالمی سیاست میں ستر اور اسی کی دہائی میں بالآخر وہ اپنا وجود منوا کر صدر اور وزیراعظم کے عہدوں تک پہنچ گئیں۔ بیسویں صدی کے آخری پانچ عشروں میں عالمی سیاسی افق پر صنفِ نازک کے جو چند نام نمایاں طور پر شہرت کی بلندیوں پر پہنچے ان میں انڈیا کی اندرا گاندھی، اسرائیل کی گولڈا میئر، ارجنٹائن کی عزابیل مارٹینز، برطانیہ کی مارگریٹ تھیچر، فلپائن کی کروزن اکینو، پاکستان کی بے نظیر بھٹو، آئرلینڈ کی میری رابنسن، بنگلہ دیش کی حسینہ واجد اور خالدہ ضیا، کینیڈا کی کم کیمبل اور سری لنکا کی چندریکا بندرانائیکے قابلِ ذکر ہیں۔ آہنی اعصاب کی مالک اِن خواتین نے سیاسی جدوجہد کے نئے باب رقم کیے اور اپنے اپنے ملک میں سیاست اور عوامی خدمت کے نئے معیارات قائم کر کے ثابت کیا کہ خواتین بھی سیاسی امور کو بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ یہ سفر اکیسویں صدی میں زیادہ تیزی سے شروع ہوا اور عالمی سیاست میں خواتین رہنماؤں کی ایک کثیر

تعداد کلیدی عہدوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ سیاست کے ایوانوں میں ان کی آواز نمایاں طور پر سنائی دی جانے لگی اور کئی ممالک کی پارلیمنٹ، کابینہ اور دیگر اہم عہدوں پر وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتی نظر آتی ہیں۔ بہت سی سروے رپورٹس کے مطابق حالیہ کورونا بحران سے وہ ممالک زیادہ مؤثر انداز میں نمٹنے میں کامیاب ہوئے ہیں جہاں سربراہانِ مملکت خواتین تھیں۔ ان میں دو قدآور شخصیات، جنھوں نے کورونا سمیت دیگر کئی بحرانوں میں مردوں کی نسبت زیادہ حوصلے اور ہمت کا مظاہرہ کیا، جرمن چانسلر اینجلا مارکل اور نیوزی لینڈ کی وزیراعظم جیسنڈرا آرڈرن ہیں۔ نہ صرف ان کو اپنے عوام میں بے پناہ پذیرائی ملی بلکہ پوری دُنیا میں ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی ترجیحات میں خواتین کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں مردوں کے برابر نمائندگی کا حصول بنیادی نکتہ بن چکا ہے اور پائیدار ترقیاتی اہداف میں خواتین کے مساوی حقوق کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ کئی مغربی ممالک یہ ٹارگٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، مثال کے طور پر سپین نے 2004ء میں اپنی وفاقی کابینہ میں مرد و خواتین کی تعداد برابر رکھی تھی اور اب وہاں خواتین وزرا کی تعداد دو تہائی ہے۔ اسی طرح فن لینڈ کے 2019ء کے انتخابات میں دُنیا کی کم ترین عمر کی وزیراعظم بننے کا اعزاز سنا مارن نے اپنے نام کیا اور محض چونتیس برس کی عمر میں وہ ملک کی وزیراعظم بننے میں کامیاب ہو گئیں۔ انھوں نے اپنی انیس رکنی کابینہ میں بارہ خواتین کو وزیر بنایا۔ ان کی کابینہ میں بھی خواتین کی دو تہائی اکثریت موجود ہے۔ اسی طرح حالیہ امریکی صدارتی انتخابات میں کملا ہیرس امریکی تاریخ میں پہلی خاتون نائب صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق، اس وقت اکیس ممالک میں خواتین صدر یا وزیراعظم کے عہدوں پر فائز ہیں اور دُنیا بھر میں وزرا میں خواتین کا تناسب 21 فیصد ہے۔ اسی طرح عالمی سطح پر پارلیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی پچیس فیصد تک پہنچ گئی ہے جبکہ 1995ء میں یہ تعداد محض 11 فیصد تھی۔

خوش آئند امر یہ ہے کہ پاکستان میں بھی سیاست کے ساتھ ساتھ دیگر شعبہ ہائے زندگی میں

خواتین پوری شد و مد سے اپنا مقام حاصل کرنے میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ تعلیم کا میدان ہو یا صحافت کا شعبہ، سول سروسز ہوں یا مسلح افواج، طب و جراحت ہو یا تجارت، کاروباری معاملات سے لے کر ٹریول اور ٹورازم تک، ہر شعبۂ زندگی میں خواتین آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں گزشتہ دو دہائیوں سے لڑکیوں کی تعلیم میں نمایاں ترجیح نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان بھر کے تعلیمی اداروں میں بورڈ کے تحت ہونے والے میٹرک، ایف اے / ایف ایس سی اور بی اے/ بی ایس سی کے امتحانات میں نمایاں پوزیشنز لڑکیاں حاصل کر جاتی ہیں۔ یہی حال یونیورسٹیز کے مختلف شعبہ جات میں داخلوں کا ہے۔ کئی ایک مضامین، جن میں سائیکالوجی، سوشیالوجی، انگریزی ادب، میڈیا اور جرنلزم نمایاں ہیں، لڑکیاں نوے فیصد تک نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ یہی تناسب میڈیکل کالجز میں بھی نظر آتا ہے جہاں محض دس سے پندرہ سیٹیں ہی میرٹ پر لڑکوں کے حصے میں آتی ہیں۔ سول بیوروکریسی میں بھی خواتین اوپن میرٹ کے ساتھ ساتھ مخصوص کوٹہ نشستوں سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں اور ہر سال کثیر تعداد میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول سروسز آف پاکستان میں شمولیت حاصل کر رہی ہیں۔ بالخصوص پنجاب میں اب ہمیں ضلعی انتظامیہ میں خواتین کی نمایاں تعداد نظر آنے لگی ہے، کئی اضلاع میں خواتین ڈپٹی کمشنر تعینات ہیں جبکہ ایک ڈویژن کی کمشنر بھی خاتون ہیں۔ اسی طرح پولیس میں بھی چند اضلاع میں خواتین ڈسٹرکٹ پولیس آفیسرز تعینات ہیں، کئی تحصیلوں میں نوجوان لڑکیاں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں۔ لاہور میں تمام سرکاری محکموں بالخصوص لینڈ ریونیو اور ایف بی آر میں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

دو سال پہلے بلوچستان جیسے پسماندہ صوبے سے تعلق رکھنے والی پری گل ترین سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے بطور اے ایس پی پولیس سروس جوائن کر چکی ہیں۔ آئندہ سالوں میں بھی سول بیوروکریسی میں خواتین کی تعداد بڑھتی دکھائی دے رہی ہے جو ایک حوصلہ افزا پہلو

ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج میں بھی حال ہی میں ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون تھری سٹار جنرل کے عہدے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ نگار جوہر خان لیفٹیننٹ جنرل کے منصب تک پہنچی ہیں۔ انھوں نے 1985ء میں پاکستان میڈیکل کور جوائن کی اور لگ بھگ پینتیس سال پر محیط اپنے کیریئر میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں، ترقی کی منازل طے کرتے کرتے اب وہ تھری سٹار جنرل بن چکی ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے سیاسی ایوانوں میں خواتین کی آوازیں نمایاں ہونے لگی ہیں اور مختلف بڑی سیاسی پارٹیوں میں خواتین کا کردار نمایاں ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

حال ہی میں وطنِ عزیز پاکستان کے لیے دُنیا بھر میں نیک نامی کمانے والی دو قابلِ فخر بیٹیوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ پہلی ہونہار بیٹی زارا نعیم ڈار ہے جو عالمی شہرت یافتہ کرکٹ امپائر علیم ڈار کی بھتیجی ہیں۔ زارا نے اکاؤنٹینسی کے بین الاقوامی امتحان (ACCA) میں دُنیا بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے نہ صرف عالمی ریکارڈ اپنے نام کیا بلکہ پاکستان کا نام بھی روشن کیا۔ وہ فنانشل رپورٹنگ کے مضمون میں دُنیا بھر میں اول پوزیشن آنے پر گوگل پرائز بھی جیت چکی ہیں۔ دوسری قابلِ تحسین بیٹی چترال سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر زبیدہ سیرنگ ہیں جو امراضِ چشم کی سپیشلسٹ ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے اس موضوع پر ''آپٹکس میڈ ایزی'' نامی ایک شاندار کتاب مرتب کی ہے جس نے دُنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے اور اسے اس موضوع پر لکھی جانے والی اب تک کی بہترین کتب کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یقیناً جہاں یہ کتاب ڈاکٹر زبیدہ کے لیے نیک نامی کا باعث ہے وہاں عالمی برادری میں پاکستان کی عزت و توقیر میں اضافے کا سبب بھی بنی ہے۔

شعبہ تعلیم میں ہمارے لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی کامیابیاں اس امر کی گواہ ہیں کہ ہماری لڑکیاں زیادہ محنت، لگن، یکسوئی، توجہ اور انہماک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور انھیں اپنے مستقبل کی کہیں زیادہ فکر ہے، اسی لیے وہ پوری دیانتداری سے اپنے وقت اور صلاحیتوں کا

بہترین استعمال کر کے امتحانات میں ٹاپ پوزیشنز حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وطنِ عزیز کے گلشن کے گلوں میں رنگ بھرا جانے لگا ہے اور بادِ نو بہار چل پڑی ہے جو یقیناً ایک تابناک مستقبل کا پیش خیمہ ہے اور ایک مستحکم پاکستان کی ضمانت بھی۔
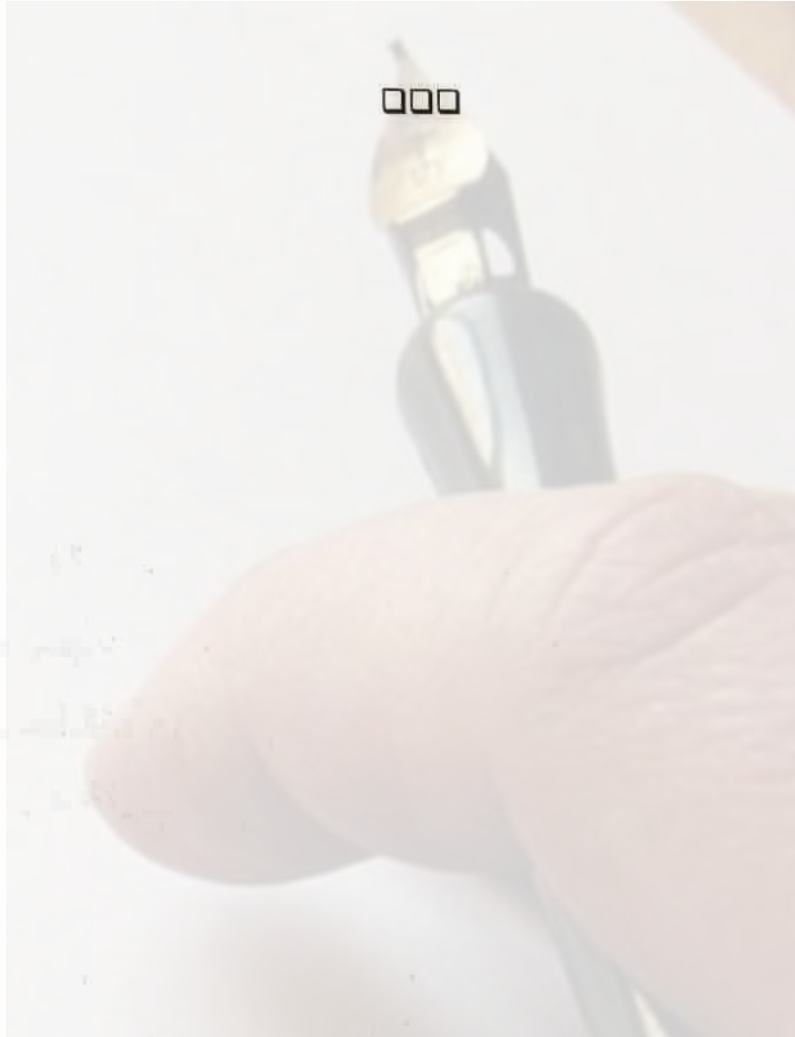
چائے پانی

بلاشبہ مشرقی روایات اور اسلامی اقدار میں مہمان نوازی کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں مہمان کی خاطر مدارات، چائے پانی اور قیام وطعام کا خصوصی اہتمام کرنے کی قابلِ فخر روایت ہے۔ بسا اوقات مہمان کے منع کرنے کے باوجود اس کے سامنے اشیائے خورونوش کے انبار لگا دیئے جاتے ہیں اور وہ بیچارہ مروت اور وضعداری کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ ہماری اس خوبصورت روایت سے غیر ملکی سیاح بھی بہت متاثر ہوتے ہیں اور وہ پاکستان سے جڑی خوبصورت یادوں میں مہمان نوازی کو سرِفہرست رکھتے ہیں۔ یہ باعثِ اجروثواب بھی ہے اور ذہنی اور روحانی سکون کا سبب بھی۔ زندہ دلانِ لاہور اس حوالے سے خاصے مشہور ہیں اور مخصوص لاہوری غذاؤں اور مرغن پکوان سے اپنے مہمان کی خدمت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے پشتون بھائی بھی مہمان نوازی کو قبائلی تفاخر سے منسوب کرتے ہیں اور بعض قبائل تو مہمان کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں مگر اس کی عزت وآن پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ کچھ قبائل میں ایک گھر کا مہمان پورے قبیلے کا مہمان تصور کیا جاتا ہے اور

قبیلے کا ہر گھر اسے اپنے ہاں مدعو کرتا ہے اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اس کی خدمت کی جاتی ہے۔ یہ خوبصورت روایت ہمارے مسلم معاشرے میں ایک کلیدی حیثیت کی حامل ہے اور ہمارے دین کی روح بھی ہے جس کی وجہ سے ایک مضبوط انسانی معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور باہمی پیار، محبت اور ایثار کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، مگر بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں مہمان نوازی کی خوبصورت روایت کو سرکاری دفاتر میں ''چائے پانی'' کا نام دے کر رشوت ستانی کے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دفاتر میں آنے والے سائلین کو جائز امور کی انجام دہی کے لیے بھی ''مال پانی'' دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ رشوت ستانی کے مکروہ دھندے کو چائے پانی کی پوشاک پہنا کر لوگوں کی جیبیں کاٹی جاتی ہیں۔ عام طور پر رشوت خور اہلکار سائلوں کی خدمت میں چائے، پانی بھی پیش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ میٹھے بول بول کر ان کی خوشامد کرتے ہیں اور پھر ان کی فائل کو فوراً حرکت میں لاتے ہوئے متعلقہ افسران سے منظور کروا کر ان کے حوالے کرنے سے پہلے مٹھائی کے نام پر ''نذرانہ'' وصول کرتے ہیں۔ کئی دفاتر میں باقاعدہ دھونس، دھمکی اور سخت لب ولہجہ اختیار کر کے غریب اور بے بس عوام کو رشوت دینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ان کے کاغذات پر طرح طرح کے اعتراضات لگا کر ہر روز نئی تاریخ دے دی جاتی ہے۔ بالآخر وہ تھک ہار کر رشوت خور عناصر کی مٹھی گرم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کچھ دفاتر میں چائے پانی کے ریٹ طے شدہ ہیں اور کام کی نوعیت کے مطابق ریٹ پر عملداری یقینی بنائی جاتی ہے اس کے بغیر فائل پر دستخط ہو ہی نہیں سکتے۔ رشوت کا ناسور ہمارے سرکاری ڈھانچے میں کینسر کی طرح سرایت کر چکا ہے اور دیمک کی مانند سرکاری اداروں کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ رشوت کے رسیا اہلکار اور افسران اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ سفارش ماننے سے ان کی ''کمائی'' میں کمی کا اندیشہ موجود ہوتا ہے لہٰذا ان پر کسی بھی قسم کا دباؤ یا سفارش اثر نہیں کرتی۔ یہ عناصر اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے سے بھی نہیں گھبراتے اور سروس کے دوران متعدد مرتبہ معطل ہونے کے باوجود ہر بار بحال ہو کر ہر آنے والے کی جیب پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ اکثر ان وارداتیوں کے ہاتھ

بڑے لمبے ہوتے ہیں اور اعلیٰ افسران تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور کئی تو باقاعدہ ان کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔

اس ناسور کی بیخ کنی کے لیے پنجاب حکومت کے زیرِ اثر اینٹی کرپشن کا محکمہ قائم ہے مگر بدقسمتی سے ایک عرصے تک یہ محکمہ خود بھی رشوت ستانی کی پشت پناہی میں ملوث رہا اور اس کے مجاز افسران کی ناک کے نیچے رشوت کا بازار گرم رہا، معصوم شہری سرکاری دفتروں میں لٹتے رہے، انصاف اور داد رسی کی دہائیاں دیتے رہے، عرضی نویسوں سے لچھے دار زبان میں اپنے غم کی داستانیں تحریر کروا کر اینٹی کرپشن کے دفاتر میں چکر کاٹتے رہتے مگر عدل کی زنجیر تک ان کی رسائی نہ ہوسکی اور کئی مرتبہ ان کو ذلیل وخوار کر کے دفتر سے نکال باہر کیا گیا۔ ماضی میں اس محکمے کا استہزائیہ نام ''آنٹی کرپشن'' بھی زبان زدِ عام رہا۔ محض کارروائی کے طور پر ہونے والی انکوائریوں میں رشوت خور عناصر باعزت بری ہوتے رہے اور ظلم وستم کا راج رہا۔ معمولی تنخواہ وصول پانے والے ادنیٰ عہدوں پر فائز اہلکار کروڑوں کی جائیدادوں کے مالک بن گئے۔

یہ خوش آئند امر ہے کہ گزشتہ دو سالوں سے محکمہ اینٹی کرپشن پنجاب نے صوبے بھر میں رشوت ستانی کے خلاف کمر کس لی ہے اور رشوت خور اہلکاران اور افسران کے محاسبے کے لیے شبانہ روز کاوشیں کی ہیں۔ ایک مربوط حکمتِ عملی وضع کی گئی ہے، ٹریپ ریڈ کے ذریعے رشوت خور عناصر کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا ہے، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا بھرپور استعمال عمل میں لا کر معاشرے میں رشوت ستانی کے خلاف ''چائے پانی بند'' مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ عوام کے لیے محکمے کے دفاتر کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ ''رپورٹ کرپشن'' کے نام سے ایک ایپ بھی بنائی گئی ہے جس پر رشوت ستانی میں ملوث عناصر کے خلاف درخواست اور ضروری مواد شامل کیا جاسکتا ہے۔ محکمے کے ڈائریکٹر جنرل اچھی شہرت اور مضبوط اعصاب کے مالک پولیس آفیسر ہیں اور ان کے زیرِ نگرانی اینٹی کرپشن نے قابلِ رشک کارکردگی دکھائی ہے۔ ان کے ترجمان کی جانب سے فراہم کیے گئے اعداد وشمار کے مطابق گزشتہ دو سالوں میں سب سے زیادہ شکایات محکمہ مال کے

خلاف موصول ہوئیں جو سترہ ہزار سے زائد تھیں، دوسرے نمبر پر پنجاب پولیس ہے جس کے خلاف تیرہ ہزار سے زیادہ شکایات آئیں اور تیسرا محکمہ جس کے خلاف رشوت ستانی کی چھ ہزار سے زائد شکایات موصول ہوئیں، وہ لوکل گورنمنٹ ہے جبکہ محکمہ صحت، آبپاشی اور سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے خلاف دو، دو ہزار سے زائد شکایات درج کروائی گئیں۔ اِن شکایات کے بروقت ازالے کے لیے پنجاب بھر میں سخت تادیبی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں اور گریڈ 1 سے 19 تک کے ملازمین اور افسران پر چھ سو پچھتّر کامیاب ریڈ کر کے دس ملین سے زائد رقم برآمد کی گئی۔ سرکاری اہلکاران اور افسران کے خلاف مقدمات درج کیے گئے اور 4 ہزار 980 افراد کو حراست میں لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پنجاب بھر میں سرکاری زمین اور املاک کو ناجائز قابضین سے واگزار کرایا گیا جس کی مالیت لگ بھگ 194 ارب روپے بنتی ہے۔ اسی طرح دیگر کارروائیوں میں 2 ارب 35 کروڑ کی برآمدگی کی گئی جبکہ 26.7 ارب کی بالواسطہ ریکوری کروائی گئی۔ یہ کارکردگی بلاشبہ قابلِ تحسین ہے اور قابلِ تقلید بھی، مگر کیا ان کارروائیوں سے صوبے بھر میں رشوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، یہ ایک اہم سوال ہے۔

کرپشن کے ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے اور مکمل خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر ایک مربوط، منظم اور بھرپور مہم کا آغاز کیا جائے اور اینٹی کرپشن پنجاب کی جانب سے شروع کی گئی ''چائے پانی بند'' مہم کو حکومتی سطح پر ملک بھر میں چلایا جائے۔ اس سلسلے میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا بھرپور استعمال کر کے رشوت خور عناصر کی حوصلہ شکنی کی جائے، انھیں سرکاری دفاتر اور سماجی حلقوں میں ناپسندیدہ افراد قرار دیا جائے۔ علمائے کرام اپنے خطبات کے ذریعے مساجد میں اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کریں۔ اس کی بیخ کنی کے لیے جہاں سخت تادیبی کارروائی کی ضرورت ہے وہاں اساتذہ، والدین، اہلِ قلم اور قومی ہیروز بھی اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی تربیت میں رزقِ حلال کی خیر و برکت کو اجاگر کرنا لازم ہے۔ پروفیسر رحمت علی المعروف باباجی کہتے ہیں کہ اگر ہر ماں اپنے بچوں کی ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی دولت اور ہر

بیوی اپنے شوہر کے حرام خوری سے جمع کیے گئے مال و زر سے نفرت کرنا شروع کر دے تو اس ناسور سے چھٹکارا جلد ممکن بنایا جا سکتا ہے، ورنہ چائے پانی کا مکروہ دھندہ، جو پانچ سو، ہزار سے شروع ہو کر کروڑوں، اربوں تک جا پہنچتا ہے، کو ختم کرنے کی مہم میں ہم ناکام ہوتے رہیں گے۔

□□□
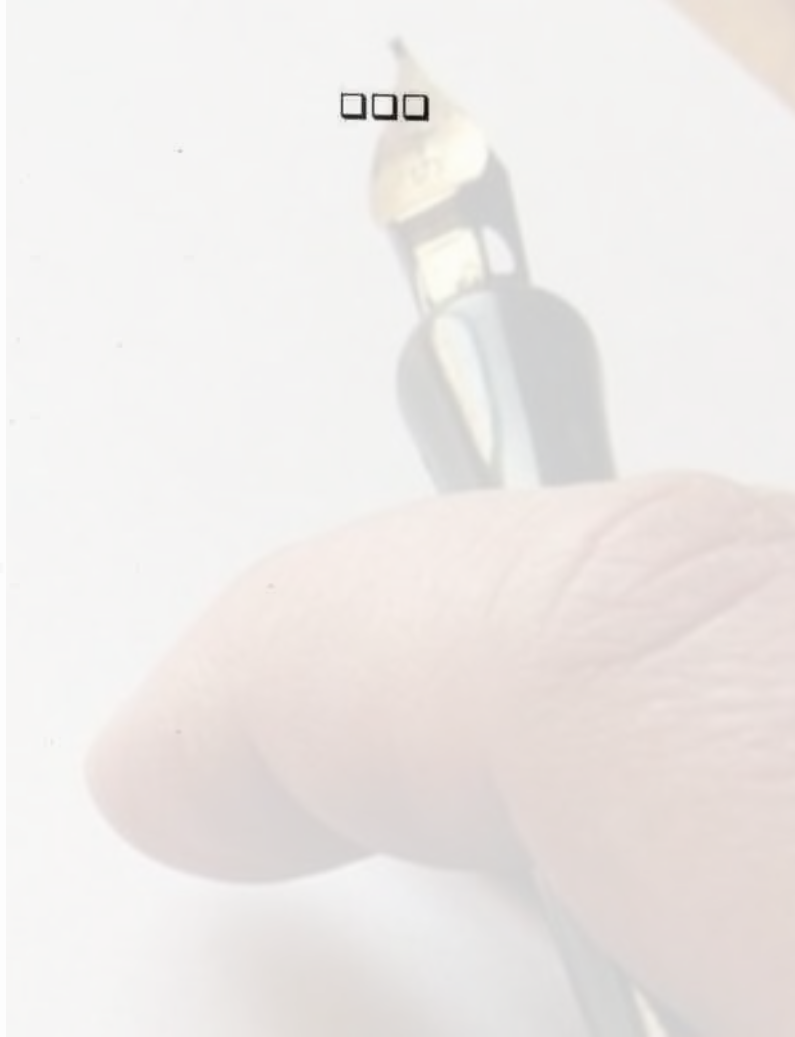
وہی راستے، وہی منزلیں

جولائی 2001ء میں سی ایس ایس کے انٹرویو سے فارغ ہوتے ہی چالیس روزہ چھٹی ختم ہو گئی، میں نے واپس پولیس لائن حاضری دی۔ دو دن بعد ایس ایس پی کے دفتر سے حکم نامہ ملا کہ صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ چھٹی پر جانے سے قبل میں تھانہ فیکٹری ایریا کا ایس ایچ او تھا اور اُس سے قبل تھانہ صدر فیصل آباد، فوراً دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو اب پھر کسی تھانے میں بطور ایس ایچ او تعینات کرنے کے لیے ایس ایس پی صاحب کی طرف سے بلاوا آیا ہے۔ پہلی دونوں تعیناتیوں میں مجھے دس ہزار روپے ماہانہ انٹرٹیننمنٹ الاؤنس ملتا تھا اور دو تین مرتبہ اچھی کارکردگی کی وجہ سے تعریفی سرٹیفکیٹ کے ساتھ نقد انعام بھی مل جاتا تو ماہانہ تیس ہزار کے لگ بھگ رقم اکٹھی ہو جاتی اور پورا مہینہ عزت و آبرو سے گزر جاتا۔ یہی سوچتا ہوا میں ایس ایس پی صاحب کے دفتر پہنچا کہ اگر مہتمم تھانہ کا حکم نامہ ملا تو پھر ماہانہ دس ہزار روپے کا مطالبہ کروں گا مگر میری توقعات کے برعکس ایس ایس پی صاحب نے فیلڈ پوسٹنگ کی بجائے مجھے اپنا سٹاف آفیسر تعینات کر لیا اور کہنے لگے ''ان شاء اللہ اب آپ نے جلد ہی سی ایس ایس کوالیفائی کر لینا ہے لہٰذا ابھی سے آپ وردی پہننا

بند کر دیں اور سادہ کپڑوں میں ہی نوکری کریں۔'' ان کے اعتماد اور یقین سے بھرپور الفاظ میرے لیے باعثِ تسکین بھی تھے اور قابلِ فخر بھی۔ یہاں میری ذمہ داریوں میں ایس ایس پی آفس میں پبلک ڈیلنگ اور میڈیا مینجمنٹ کے علاوہ دو درجن سے زائد وہ کیسز بھی تھے جو آئی جی صاحب کی طرف سے تفتیش کے لیے تفویض کیے گئے تھے، مجھے اُن کیسز کی میرٹ پر پیروی کرنا تھی۔

شام واپسی پر میں نے وہ تمام فائلز اپنی گاڑی میں رکھیں اور پولیس ریسٹ ہاؤس میں لے آیا۔ رات کو فائلز کو دیکھنا شروع کیا تو پتا چلا کہ زیادہ تر مقدمات اقدامِ قتل، ریپ، اقدامِ ریپ کے علاوہ لڑائی جھگڑے اور ضرر کی دفعات کے تحت درج کیے گئے تھے۔ عمومی طور پر ان جرائم کے مقدمات کی نوعیت بہت پیچیدہ اور مشکل ہوا کرتی ہے۔ دیہی علاقوں میں جہالت اور انا پرستی کی بنیاد پر قریبی رشتہ داروں میں لڑائی جھگڑے اور رشتہ سے انکار کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمین کی تقسیم، پانی کی وارہ بندی اور فصل کے اجاڑنے پر خونیں لڑائیاں لڑی جاتی ہیں اور پھر انا کی تسکین کے لیے بے گناہ لوگوں کو مقدمات میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ مال مویشی بیچ کر اور آڑھتی سے ادھار پکڑ کر تفتیشی کو پیسے دیئے جاتے ہیں اور جھوٹی انا اور عزت و وقار کے تحفظ اور بچاؤ کی خاطر مخالفین پر قافیہ حیات تنگ کرنے کا ہر حربہ آزمایا جاتا ہے۔ چونکہ میں خود ایسے ماحول میں پلا بڑھا ہوں تو مجھے دیہی وسیب اور اس سے جڑی سماجی برائیوں کا بخوبی ادراک تھا اور بطور ایس ایچ او ان تمام معاملات سے نبرد آزما بھی ہو چکا تھا۔ اگلے ہی روز ایس ایس پی صاحب نے مجھے ان مقدمات کی تفصیلی فہرست تیار کرنے اور ان کی پیروی کی حکمتِ عملی بنانے کا حکم دیا۔

دو دن تک میں ان مقدمات کو تفصیل سے پڑھتا رہا، ابتدائی رپورٹ سے لے کر چالانِ ضمنی تک سب کچھ باریک بینی سے دیکھا، گواہان کے بیانات بھی پڑھے، مختلف تفتیشی افسران کی ضمنیاں بھی ملاحظہ کیں، اس دوران بہت سے تضادات اور مشکوک حالات و واقعات ابھر کر سامنے آئے۔ کچھ مقدمات پر پیسے کی چمک دمک بھی نظر آئی۔ میں نے سفید صفحات پر حاشیے

لگائے، جملہ مقدمات کی دفعات کی رو سے فہرست بنائی اور ہر مقدمے کے سامنے اپنی مختصر سمری تحریر کی اور دو دن بعد ایس ایس پی صاحب کے سامنے اپنی حکمتِ عملی تیار کر کے رکھ دی۔ میں نے انھیں اعتماد میں لیا کہ زیادہ تر مقدمات جھوٹی انا کی تسکین اور رشتہ داروں کے درمیان مختلف وجوہات پر قائم کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ مجھے تفتیش میں مکمل آزادی اور خود مختاری دی جائے تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے، جو قبول ہو گئی۔

میں نے ہفتہ میں دو مقدمات کی علانیہ تفتیش متعلقہ گاؤں کی جامع مسجد میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ پروگرام کے مطابق گاؤں کی مسجد میں نمازِ ظہر یا عصر کے بعد امام مسجد کی موجودگی میں ملزم اور مدعی کے علاوہ جملہ گواہان بھی طلب کیے جاتے۔ سب اکٹھے نماز ادا کرتے اور بعد میں مسجد کے صحن میں ابتدائی رپورٹ سے لے کر گواہان کے بیانات سمیت تمام ضمنی تفصیلات کو جانچا اور پرکھا جاتا اور حقائق تک رسائی ممکن بنانے کے لیے قرآنِ پاک پر حلف کے ساتھ گفتگو کی جاتی۔ یہاں پر واضح رہے کہ مقررہ تاریخ سے پہلے مجھے جانے کہاں کہاں سے فون کروائے جاتے، سفارشی حضرات بالمشافہ ملنے بھی تشریف لاتے مگر میں سب کو متعلقہ مسجد میں مقررہ تاریخ پر تشریف لانے کا کہہ دیتا کہ سب کے سامنے انصاف کو یقینی بنایا جائے گا مگر کسی بھی انکوائری کے وقت کوئی سفارشی نظر نہیں آیا۔

مسجد میں اور قرآن مجید کی موجودگی میں کی گئی تفتیش میں سچ جھوٹ سے ایسے الگ ہو جاتا جیسے ابلے ہوئے انڈے کی سفیدی زردی سے جدا نظر آتی ہے۔ ایف آئی آر جھوٹ کا پلندہ ہوتو گواہان کے بیانات تضادات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ من گھڑت قصہ محض شریکوں کو نیچا دکھانے اور اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے گھڑا جاتا ہے اور اپنی مرضی کے افسران سے تفتیش کروائی جاتی ہے۔ اس دوران دوسرا فریق اپنے اثر ورسوخ سے تفتیشی تبدیل کروا لیتا ہے اور معاملہ لٹک کر رہ جاتا ہے۔ البتہ مجھے سچ تلاش کرنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہوتی کیونکہ مسجد میں فریقین کی موجودگی بذاتِ خود انصاف کے قرین ترین نظام کی ضمانت ہوتی تھی لہٰذا ایک ایک کر کے میں نے

دو درجن کے قریب مقدمات حل کیے۔ بیشتر مقدمات انکوائری کے وقت ہی ختم ہو جاتے اور فریقین صلح کو ترجیح دیتے۔ امام مسجد صاحب دعا کرواتے اور بعد میں گاؤں سے مٹھائی منگوا کر مسجد میں منہ میٹھا کیا جاتا۔ اگلے روز فریقین کو ایس ایس پی صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا اور مقدمے کے اخراج پر اتفاق کیا جاتا۔ اس انوکھے طریقۂ تفتیش اور مقدمات کے جلد حل ہونے پر ایک معروف انگریزی جریدے کے بیورو چیف نے ایک خصوصی فیچر بھی لکھا اور اسے بے پناہ سراہا۔

ایس ایس پی صاحب کے الفاظ مبارک ثابت ہوئے اور سی ایس ایس کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو میں کامیاب امیدواروں کی فہرست میں شامل تھا۔ سول سروسز جوائن کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا لاہور میں اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس سے سفر شروع ہوا، پھر ڈیپوٹیشن پر ضلعی حکومت، پنجاب اور وفاقی حکومت کے مختلف محکموں میں خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ پھر بطور ایڈیشنل کمشنر انکم ٹیکس تعینات رہا مگر وہ مسجد ماڈل میری یادداشت میں تازہ بہ تازہ رہا۔

چند ماہ قبل میں کمشنر کے عہدے پر تعینات ہوا تو ایک بار پھر میں نے اپنے ڈویژن کے چاروں اضلاع میں مسجد ماڈل لاگو کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ اب مہینے کے چار جمعے چاروں اضلاع کی جامع مساجد میں باری باری ادا کیے جاتے ہیں جس میں اس ضلع کی انجمن تاجران، میڈیا کے نمائندے، چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے علاوہ ٹیکس بار اور سول سوسائٹی بھی شریک ہوتی ہے۔ جمعہ کے خطاب میں ٹیکس ادائیگی کے طریقہ کار اور اس کی ملکی تعمیر و ترقی میں کلیدی اہمیت میری گفتگو کا موضوع ہوتی ہے۔ نماز کے بعد کھلی کچہری میں تاجر برادری اور ٹیکس دہندگان کے مسائل اور شکایات کے حل کے لیے عملی اقدامات کیے جاتے ہیں اور یوں ایف بی آر اور ٹیکس گزاروں کے درمیان مکمل اعتماد اور باہمی تعاون کے فروغ کو بھی یقینی بنایا جاتا ہے۔

عدل و انصاف کی فراہمی ہو یا ٹیکس کی وصولی، ریاستی امور میں شفافیت نہایت ضروری ہے اور مسجد ماڈل اس سلسلے میں بہترین حکمتِ عملی ہے جسے استعمال میں لا کر ریاست اور عوام کے

درمیان مستحکم اور دیرپا بنیادوں پر باہمی تعاون کی فضا قائم کی جاسکتی ہے۔ مسلسل سفر جاری ہے، رختِ سفر بھی وہی ہے، راستے بھی وہی اور منزلیں بھی وہی۔ محمد اسماعیل ندوی نے سچ ہی کہا تھا...

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر
مل جائے تجھ کو دریا تو سمندر تلاش کر

❑❑❑
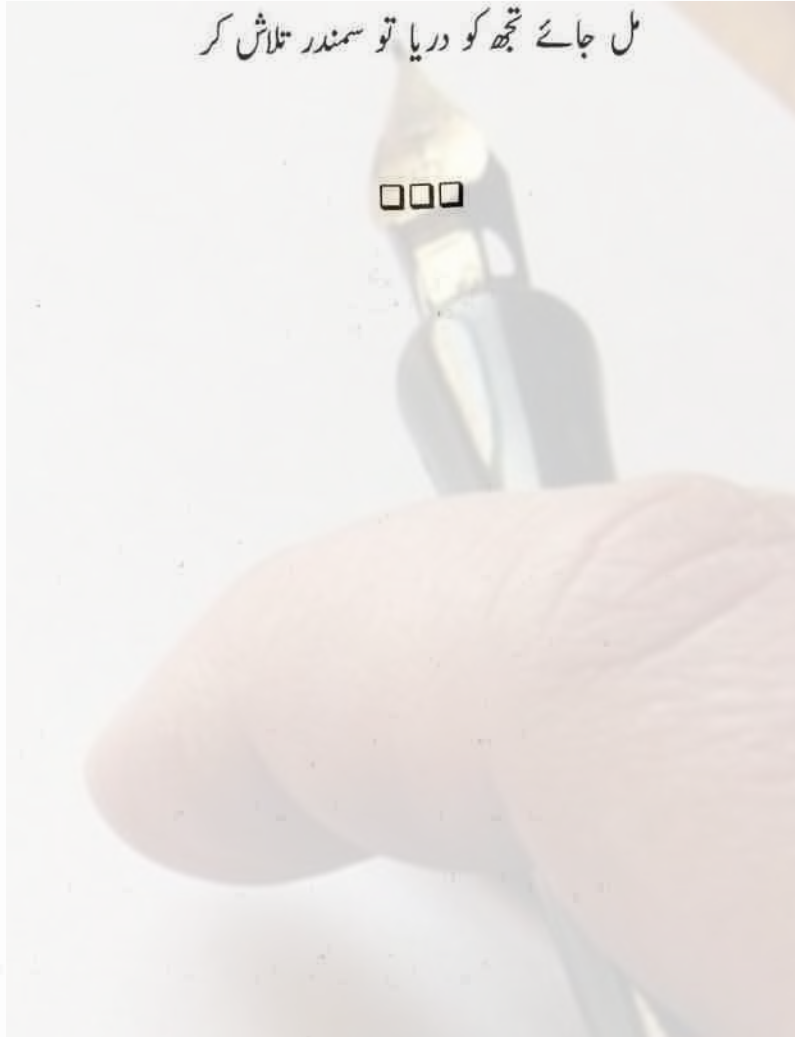
جلتے چنار

ریاست جموں و کشمیر کی حیثیت اور اہمیت کو سمجھنے کے لیے برصغیر کے نقشے کا بغور جائزہ لینا ضروری ہے۔ اسی سے کشمیر کی جغرافیائی اور نظریاتی افادیت واضح ہوتی ہے۔ کشمیر عظیم کوہِ ہمالیہ کی گود میں جنت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جنوب مشرق میں لداخ، شمال میں چین اور مغرب میں سکردو کے ذریعے یہ پاکستان سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی دفاعی اہمیت اپنی جگہ، برصغیر کی زراعت اور آبپاشی کا انحصار بھی یہاں سے نکلنے والے دریاؤں پر ہے۔ مسلم اکثریتی ریاستوں کی طرح اسے بھی پاکستان یا بھارت میں سے ایک کے ساتھ الحاق کا حق دیا گیا مگر ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن نے پنجاب کی تقسیم کے وقت مسلم اکثریتی اضلاع گورداسپور اور امرتسر کو بھارت میں شامل کر دیا اور یوں کشمیر جانے کا واحد راستہ پٹھان کوٹ مل جانے کے بعد ہندو راجہ ہری سنگھ سے ساز باز کر کے کشمیر کا سودا کر لیا گیا۔ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلم آبادی کا تناسب اَسّی فیصد تھا مگر تقسیم سے پہلے، ڈوگرہ راج میں بھی انتظامیہ نے عوام پر زندگی کا قافیہ تنگ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپریل 1931ء میں کشمیر کی آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا اور بعدازاں سرینگر سے شروع ہونے والی یہ

تحریک اس وقت زور پکڑ گئی جب عبدالقدیر خان نامی ایک نوجوان کو راجہ کے خلاف بغاوت کے جرم میں حراست میں لیا گیا۔ 13 جولائی 1931ء کو عدالت کے باہر مسلمان مقدمے کی سماعت کے لیے اکٹھے ہوئے اور یہیں پر ظہر کی اذان مکمل کرنے کے دوران 21 کشمیری نوجوان ڈوگرہ فوج کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہید ہوئے جنھیں مزارِ شہیداں میں اکٹھا دفنایا گیا۔ اس دن کی اہمیت کشمیر کی آزادی کی کوششوں اور لازوال قربانیوں کی تاریخ میں انمٹ رہے گی۔ اسی موقع پر علامہ اقبال رکن کشمیر کمیٹی اور بعد ازاں اس تحریک کے صدر بنے اور ہری سنگھ کے خلاف مظاہرے برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئے۔

کشمیری پچھلے اکانوے برس سے ظلم و بربریت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ قوموں کی زندگیوں میں آزادی کے لیے ایک صدی تک جہدِ مسلسل کی دنیا بھر میں شاید ہی کوئی اور مثال ملتی ہو۔ کیا ستم ہے کہ 1947ء میں مسلم اکثریتی ریاست کے عوام کی خواہشات کے برعکس بھارت سے الحاق کی سازش رچائی گئی؛ البتہ ریاست کی الگ حیثیت کو اس معاہدے میں بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ آزادی کے متوالے پہاڑوں میں ڈوگرہ فوج کو پسپا کر کے پونچھ اور مظفر آباد تک پہنچ گئے تو بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں جو آج تک وادی پر قابض ہیں۔ دوسری طرف بھارت اس تنازع کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے گیا اور جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔ سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کر لی اور فیصلہ کیا کہ کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت دینے کے لیے استصوابِ رائے کرایا جائے گا مگر بھارت کی ہٹ دھرمی کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ادھر پاکستان نے آزاد کشمیر کی ریاستی خود مختاری اور جدا حیثیت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مقبوضہ کشمیر کے لیے بھی ہر فورم پر آواز اٹھائی۔ مقبوضہ کشمیر میں دو دہائیوں سے زائد کی سیاسی کشمکش کے بعد اندرا، عبداللہ اکارڈ کے نام سے ایک معاہدہ طے پایا جس میں شیخ عبداللہ کو کشمیر کے الگ وزیر اعظم کی بجائے وزیر اعلیٰ بننے پر راضی کر لیا گیا، اس پر پاکستان کی حکومت نے شدید احتجاج کی کال دی اور پھر 28 فروری 1975ء کو پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں بھرپور احتجاج کیا گیا۔ معروف کشمیری مصنف محمد فاروق رحمانی

لکھتے ہیں کہ اس دن سرینگر میں ہُو کا عالم تھا اور سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔

تنازعِ کشمیر جنوبی ایشیا سمیت دنیا بھر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر بھارت اور پاکستان کے مابین تین جنگیں ہو چکی ہیں اور جو دو نیوکلیئر طاقتوں کے مابین فلیش پوائنٹ ہے۔ دسمبر 1988ء میں اسلام آباد میں سارک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی نے شرکت کی تھی۔ اس میں پاک بھارت تعلقات کی بحالی کی کوششوں کا اعادہ کیا گیا مگر مشترکہ اعلامیے میں راجیو گاندھی نے کشمیر میں استصوابِ رائے کرانے اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی منظور شدہ قرارداد پر عمل پیرا ہونے کو یکسر مسترد کر دیا۔ پاکستانی قوم نے اس پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور احتجاج کی کال دے دی۔ کشمیری رہنما سردار ابراہیم، جو صدر آزاد کشمیر بھی رہے، کی تجویز پر جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے 5 فروری کو یومِ یکجہتی کشمیر منانے کا اعلان کیا، بعدازاں وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی توثیق سے پانچ فروری کو ملک بھر سمیت عالمی سطح پر یومِ یکجہتی کشمیر منایا گیا۔ یوں 1990ء سے ہر سال 5 فروری کو پاکستانی قوم کشمیریوں کے حوصلے، ہمت اور استقلال کے لازوال جذبے کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔

بدقسمتی سے مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا رویہ ہمیشہ متعصبانہ رہا ہے۔ 5 اگست 2019ء کو بھارتی اسمبلی نے اکثریتِ رائے سے لداخ اور کشمیر کی الگ خودمختار حیثیت کو ختم کر دیا۔ نریندر مودی کی فسطائی پالیسیوں نے مقبوضہ کشمیر کے عوام کو موت کی وادی میں قید کر دیا۔ گیارہ لاکھ ریگولر آرمی کی موجودگی میں آر ایس ایس کے غنڈوں نے مقبوضہ کشمیر میں خون کی ہولی کھیلی، بچوں اور نوجوانوں کو پیلٹ گنوں سے نشانہ بنایا گیا، حریت رہنماؤں کو بھارت کی بدنام زمانہ تہاڑ جیل کے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا گیا۔ سید علی شاہ گیلانی سمیت کئی رہنماؤں کو گھروں اور جیلوں میں بند رکھا گیا، یہاں تک کہ بھارت نواز رہنما عمر عبداللہ اور محبوبہ مفتی بھی چیخ اٹھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے دو قومی نظریے کی حقانیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بھارت نے ہمیشہ سب سے بڑی جمہوریت کا راگ الاپا ہے مگر مودی حکومت نے ثابت کیا کہ بھارت ایک انتہا پسند ریاست ہے جس کے ریاستی

جبر اور دہشت گردی سے مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور دیگر اقلیتیں بھی محفوظ نہیں۔ کشمیر میں استصوابِ رائے کرانے کی بجائے طاقت کے استعمال سے اس کو یونین آف انڈیا کا حصہ بنا کر ہڑپنے کی کوشش کی گئی مگر کشمیری عوام کے ردِعمل کے ڈر سے کرفیو نافذ کر کے لاک ڈاؤن اور بدترین ریاستی تشدد کا آغاز کیا گیا۔ تمام ذرائع ابلاغ پر پابندی عائد کر دی گئی اور بنیادی حقوق تک سلب کر لیے گئے مگر اس کے باوجود کشمیریوں کے جذبۂ آزادی کو ماند نہیں کیا جا سکا۔ پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں بھارت کے اس گھناؤنے اقدام کو سختی سے رد کیا، وزیراعظم عمران خان نے مودی حکومت کی ہندوتوا سوچ اور آر ایس ایس کو نازیوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے کشمیریوں کا مقدمہ خود لڑنے اور اسے بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور اقوامِ متحدہ کو باور کرایا کہ اگر مسئلہ کشمیر کا پُرامن حل نہ نکالا گیا تو دنیا اس کے بھیانک اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

بھارت بحیثیت ریاست جھوٹا پروپیگنڈا کر کے اور تحریکِ حریتِ کشمیر کو دہشت گردی سے جوڑ کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے جعلی سرجیکل سٹرائیک کا ڈرامہ رچا کر بالاکوٹ میں درختوں اور کووں کو نشانہ بنا کر اپنی جارحانہ سوچ کا مظاہرہ کیا۔ 27 فروری 2019ء کو ابھینندن مگ 21 کے ساتھ حملہ آور ہوا مگر ہمارے شاہینوں نے اسے ناکام بناتے ہوئے جنگی قیدی بنا لیا اور بعد ازاں وہ پاک فضائیہ کی پیشہ ورانہ سوچ اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو سراہتے ہوئے واہگہ کے راستے رخصت ہوا۔ چین ہو یا نیپال، سری لنکا ہو یا بنگلہ دیش، تمام ہمسایہ ممالک بھارت کے رویے سے نالاں رہتے ہیں۔ دنیا کو کان اور آنکھیں کھول کر کشمیریوں کی آواز کو سننا اور ڈھائے جانے والے مظالم کو غیر جانبداری سے دیکھنا ہوگا۔ وادیٔ کشمیر کے دریا بھارت کے میدانوں کو سیراب تو کر رہے ہیں مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ مہذب دنیا کو جلتے چنار اور دریائے جہلم کے پانیوں میں نہتے کشمیری مسلمانوں کا خون نظر نہیں آتا۔ جنت نظیر وادی کے جلتے چناروں اور اجڑی بہاروں کے اسباب کا کھوج لگانا اور بھارتی ظلم و بربریت کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات کرنا بین الاقوامی برادری بالخصوص اُن عالمی طاقتوں کی ذمہ داری ہے جو ہمہ وقت امنِ عامہ،

انسانی حقوق اور جمہوریت کے فروغ کا دم بھرتی رہتی ہیں۔ قول و فعل میں موجود یہ کھلا تضاد دراصل عالمی نظامِ انصاف پر سوالیہ نشان ہے اور جنوبی ایشیا میں پائیدار امن اور خوشحالی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی۔
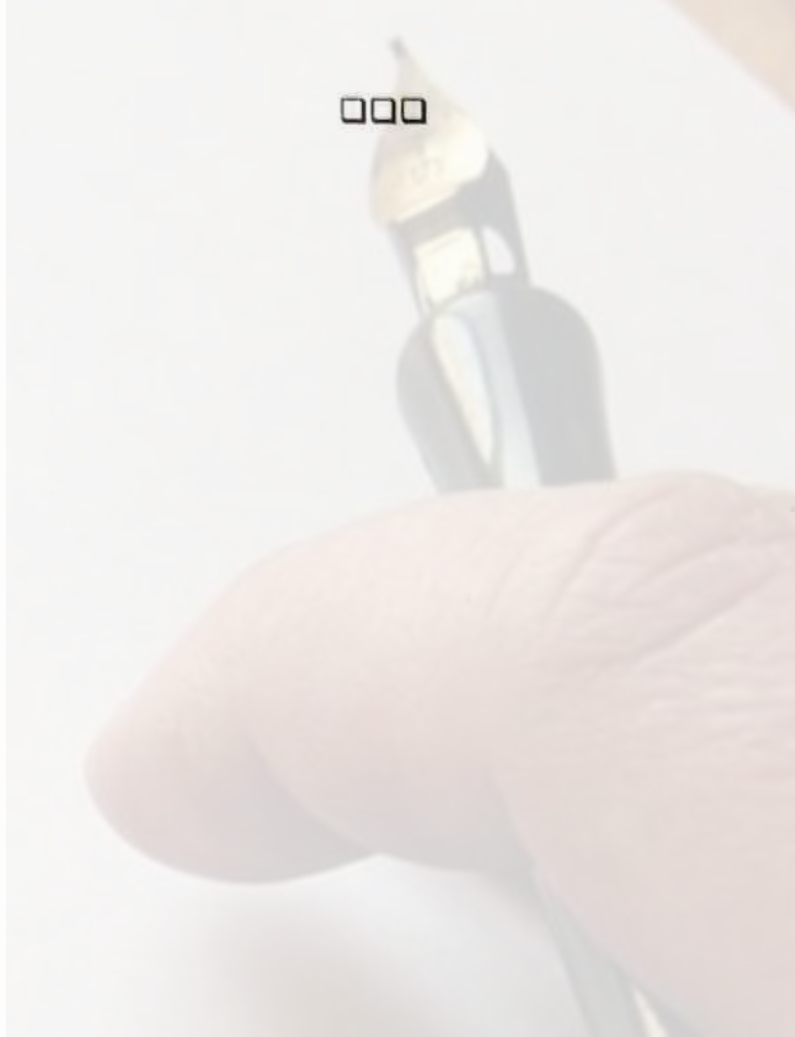
بندۂ مزدور کے تلخ سوالات

اٹھارہویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا اور جلد ہی پوری دُنیا پر چھا گیا۔ سرمایہ داروں نے فیکٹریاں لگائیں اور پیداواری صلاحیت بڑھانے، مال کمانے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرنے لگے۔ مقابلے کی فضا پیدا ہوئی تو فیکٹریاں اور کارخانے ڈبل شفٹ پر چلانے شروع کر دیے مگر ان کارخانوں میں ایندھن کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے خون پسینے کو بھی جلانا شروع کر دیا گیا۔ اس خوفناک استحصال پر گوشت پوست کے بے بس انسان چیخ اُٹھے۔ انھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا شروع کی اور 1880ء کی دہائی میں محنت کشوں کی طرف سے آٹھ گھنٹے کے اوقاتِ کار کے مطالبے کے لیے پریڈ، مارچ اور احتجاج کا آغاز ہوا جس سے یومِ مزدور کی بنیاد پڑی۔ ٹریڈ یونینز، مزدور تنظیموں اور دیگر سوشلسٹ اداروں نے کارخانوں میں آٹھ گھنٹے کام کے مطالبے پر زور دیا مگر بے رحم سرمایہ داروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بالآخر تنگ آ کر مزدوروں نے اس ظلم کو مزید سہنے سے انکار کر دیا اور مکمل ہڑتال کر دی۔ تین مئی کو اس سلسلے میں شکاگو میں منعقدہ مزدوروں کے ایک احتجاجی جلسے پر حملہ ہوا جس میں چار مزدور ہلاک اور ستر سے زائد زخمی ہوئے۔

اس بربریت کے خلاف محنت کش احتجاجی مظاہرے کے لیے Hey مارکیٹ سکوائر میں جمع ہوئے تو پولیس نے مظاہرین کو روکنے کے لیے ان پر تشدد کیا۔ اسی دوران ایک بم دھماکا ہوا جس میں ایک پولیس افسر ہلاک ہوگیا، اس پر پولیس نے مظاہرین پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی جس کے نتیجے میں بے شمار مزدور ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس موقع پر سرمایہ داروں نے مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر کے پھانسیاں دیں حالانکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ملا تھا؛ تاہم انھوں نے مزدور تحریک کے لیے جان دے کر سرمایہ دارانہ نظام کی بربریت واضح کردی۔ ان رہنماؤں نے کہا ''تم ہمیں جسمانی طور پر توختم کر سکتے ہولیکن ہماری آواز نہیں دبا سکتے۔'' اور یہ بات حرف بحرف درست ثابت ہوئی کیونکہ یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی اور بالآخر مزدوروں کے اوقاتِ کار آٹھ گھنٹے طے کردیئے گئے۔

المیہ یہ ہے کہ یہ اوقاتِ کار طے ہو جانے کے باوجود مزدور کے مسائل میں زیادہ کمی واقع نہیں ہوئی۔ پورے سال میں ایک دن ایسا آتا ہے جب ہم مزدور کے حقوق کی بات کرتے ہیں، سوشل میڈیا پر ویران آنکھوں اور افلاس زدہ چہرے والے مزدوروں کی تصاویر شیئر کی جاتی ہیں، وٹس ایپ سٹیٹس پر یکم مئی کے حوالے سے مختلف پوسٹرز اور تصویریں نظر آتی ہیں اور پھر ٹی وی چینلز پر بھی مزدوروں کو مناسب جگہ مل جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ذہن میں مزدور کا تصور بہت محدود ہے۔ درحقیقت یہ وہ طبقہ ہے جس کی زندگی چھوٹے چھوٹے مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ ایک مزدور جب پورا دن مزدوری کر کے ایک ایک کر کے کمائے ہوئے چند سو روپے لے کر واپسی کی راہ لیتا ہے تو اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہیں ہوتے بلکہ اسے یہ خوشی سرشار کر رہی ہوتی ہے کہ اس نے اپنے بچوں کے کھانے کا بندوبست کر لیا ہے اور اس کے بچوں کو آج فاقہ نہیں کرنا پڑے گا۔ مزدور اس دن نہیں تھکتا جس دن وہ شدید محنت کے بعد کئی لیٹر پسینہ بہا کر بچوں کی روٹی کمانے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ وہ اس وقت تھکان کا شکار ہوتا ہے جب اس کا دن مزدوری کے انتظار میں خالی چلا جاتا ہے۔ جس شام اسے خالی ہاتھ گھر لوٹنا پڑے، وہ شام اس کے لیے کسی

قیامت سے کم نہیں ہوتی۔

جو لوگ ماہانہ تنخواہ وصول کرتے ہیں وہ عموماً آغازِ مہینہ میں ہی اکٹھا راشن خرید لاتے ہیں اور پھر پورا ماہ اس فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں لیکن مزدور کی زندگی اتنی پُر آسائش نہیں ہوتی کیونکہ وہ روز مرہ کی اشیائے خورد ونوش روزانہ کی بنیاد پر خریدتا ہے۔ جس دن مزدور بغیر دیہاڑی کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اس کے ذہن میں اَن گنت جھگڑ چلتے ہیں۔ ایک باپ کے لیے بچوں کا فاقہ برداشت کرنا آسان چیز نہیں ہوتی۔

ایک ریڑھی بان جو شام تک سبزی بیچنے میں ناکام ہو جاتا ہے، شام کو ریٹ گرا کر منتوں پر اتر آتا ہے۔ وہ محض اتنی رقم کمانے کو ہی غنیمت جانتا ہے جس سے اپنے بیوی بچوں کو فاقے سے بچا سکے۔ اسی طرح ہمارے گھریلو ملازمین ہیں، جو ہمارے بچے ہوئے کھانے، پرانے کپڑوں اور جوتوں کے حصول کے لیے ہماری خوشامد کرتے ہیں اور ہم انھیں لالچی قرار دے کر نخوت سے منہ موڑ لیتے ہیں، اگر کچھ دینا بھی پڑے تو اس طرح کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی ہماری ممنونِ کرم رہیں۔ اگر کوئی ملازم ایڈوانس تنخواہ کی بات کرتا ہے تو ہم حیرت زدہ ہو کر یہ سوال کرتے ہیں کہ تم نے ''سارے پیسے'' اتنی جلدی اڑا بھی دیئے کہ اب مزید پیسوں کی ضرورت آن پڑی۔ اور جس دن گھریلو ملازمہ چھٹی کر لے، وہ دن بیگم صاحبہ کی زندگی کا مشکل ترین دن ہوتا ہے۔

حضور کریم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ ہے ''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔'' لیکن فیکٹری مالکان پسینہ تو درکنار مزدور کا لہو خشک کر کے بھی مزدوری ادا نہیں کرتے۔ ہم اپنے گھروں میں روٹی کھاتے ہوئے کبھی اس کسان کا تذکرہ نہیں کرتے جس نے دن رات ایک کر کے فصل کی حفاظت کی، طرح طرح کے مسائل کا سامنا کیا، بے موسمی بارشوں نے کیسے اس کے دل کو لرزایا اور پھر جب فصل پک کر تیار ہوئی تو اسے کس طرح خود کو محنت سے کم صلے پر بہلانا پڑا۔ حلال رزق کا مطلب اس کسان سے پوچھو کہ پسینہ بن کے جس کے بدن سے لہو ٹپکتا

ہے۔ احسان دانش، جنھیں دُنیا شاعرِ مزدور کے نام سے جانتی ہے، جب پنجاب یونیورسٹی میں مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو ہوئے تو انھوں نے دورانِ خطاب طلبہ کو یہ کہہ کر حیرت میں مبتلا کر دیا کہ اس ہال کی دیواروں میں اِن کا لہو اور پسینہ بھی شامل ہے۔ ''میں پورا پورا دن بیل کی جگہ کام کر کے پانی نکالتا تھا، اینٹیں ڈھوتا تھا اور شام کو مطالعہ کرتا تھا''۔

ورلڈ فوڈ پروگرام کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈیوڈ بیسلے دُنیا کو خبردار کر چکے ہیں کہ کورونا کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے دُنیا کے ایک ارب بیاسی کروڑ غریب افرادرات کا کھانا کھائے بغیر ہی سونے پر مجبور ہیں اور اس تعداد میں مزید اضافہ ہونا لازمی امر ہے۔ اس تناظر میں کل دُنیا ''یومِ مزدور'' منائے گی اور محض سوشل میڈیا پر رسمی کارروائی کے طور پر افلاس زدہ چہروں کی تصاویر کی تذلیل ہو گی، غربت اور بھوک کا مذاق اڑایا جائے گا اور سرمایہ داری اور مادہ پرستی کا رسیا انسان مزدوروں کے حقوق کی پامالی پر مگرمچھ کے آنسو بہاتا نظر آئے گا۔ یوں یکم مئی کا سورج بھی ہمیشہ کی طرح مغربی افق میں شرمندگی کی چادر اوڑھ کر غروب ہو جائے گا۔ ہمارے مزدور، کسان، ہاری، مزارعین اور پسے ہوئے طبقے کے مسائل ایک جیسے ہیں کیونکہ وہ ہر روز موت سے اپنی زندگی کا قرض مانگتے ہیں اور یہ مزدور اپنی نمناک آنکھوں کے ساتھ کئی تلخ سوالات پوچھتے نظر آتے ہیں جن کا شاید ہی کسی کے پاس کوئی جواب ہو۔ کیا اُن کے باپ دادا کی طرح اُن کے بچوں کے بچے بھی مزدور ہی بننے پر مجبور ہوں گے؟ کیا اُن کی زندگی میں کوئی ایسا نظام آئے گا جس میں ایک مزدور کا بیٹا اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر طاقت کے ایوانوں میں حقِ نمائندگی حاصل کر سکے؟ کیا مزدور کو اس کی محنت کا پورا اور بروقت صلہ ملنا شروع ہو جائے گا؟ انھی سوالات پر مبنی مزدور کے جذبات کو ایک شاعر نے اپنی ایک خوبصورت نظم میں بیان کیا ہے...

نوچ کر اپنے جواں جسموں کی پُرنور بہار
کب تلک اور کریں گے رُخِ قاتل پہ نثار

روک سکتے نہیں سیلاب کو زندانوں کے در
تیغ بن جائے اگر ہاتھ میں لیں شاخِ شجر
اٹھ کھڑے ہوں گے یہ جلاد کی صورت اک دن
دیں گے قاتل کو نہ فریاد کی مہلت اک دن

□□□
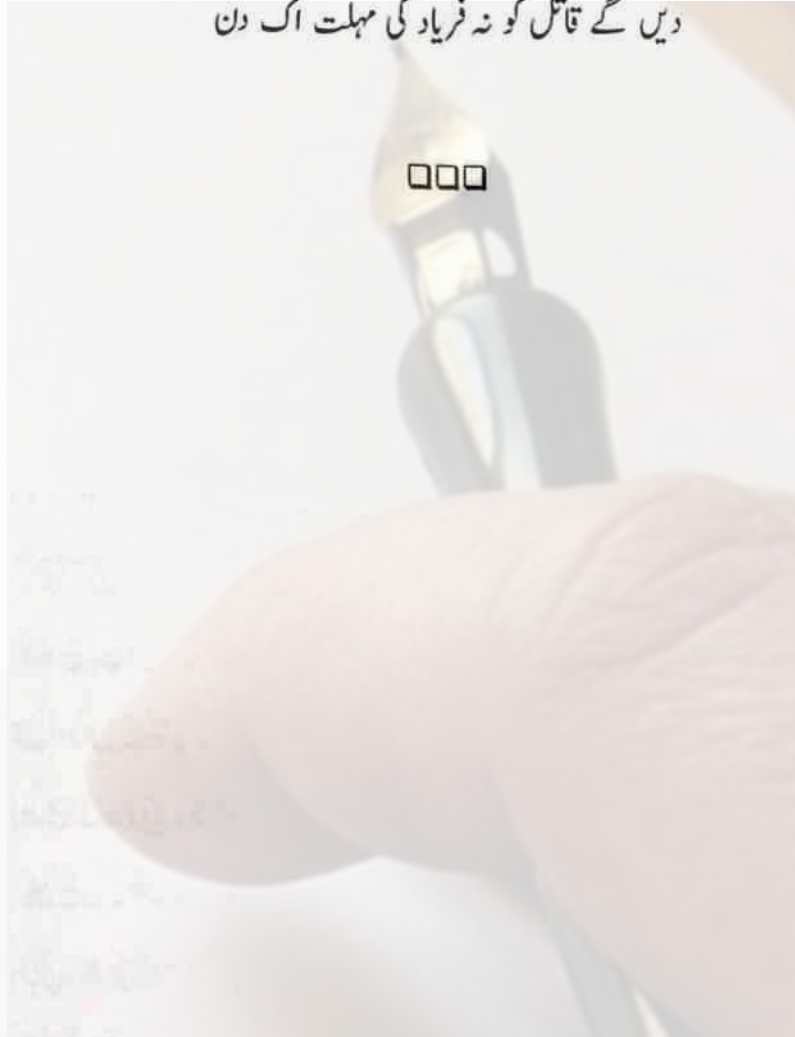
فکرِ اقبال کے وارث

میرے روحانی پیشوا، محسن و مربی پروفیسر رحمت علی المعروف باباجی کی ساری زندگی ذکرِ خدا، عشقِ مصطفیٰ ﷺ اور فکرِ اقبال ؒ کی جستجو، تحقیق اور ترویج میں گزری ہے۔ ان کے مداح انھی حوالوں سے اُن کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں، ان کے علم و فضل اور شخصیت و کردار کے گن گاتے ہیں اور ان کے فیضِ عام سے مستفیض ہوتے ہیں۔ باباجی کا کمال یہ ہے کہ وہ عجز و انکسار کا پیکر ہیں اور ہمیشہ خود کو ایک طالبعلم گردانتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ علمی و فکری میدان میں انھوں نے جو کچھ سیکھا یا سکھایا، یہ دولت انھیں شاعرِ مشرق، حکیم الامت، عظیم فلسفی حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ؒ کی شاعری میں موجود نادر نظریات اور بلند پایہ خیالات کی بدولت ملی۔ وہ یقیناً علامہ اقبال کے فن اور شخصیت پر گفتگو کا ملکہ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماہِ نومبر کی آمد کے ساتھ ہی ان کی مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔ انھیں ملک بھر میں ہونے والی تقریبات میں مدعو کیا جاتا ہے اور جیدی میاں اُن کے تمام پروگرامز اور سرگرمیوں کو مرتب کرتے ہیں۔ جیدی میاں بڑی مہارت، خندہ پیشانی اور وضعداری سے تمام دعوت نامے وصول کرتے ہیں اور باباجی کے احکامات کی روشنی میں ان کو ترتیب دیتے ہیں۔ باباجی کی گفتگو سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور

ہر شہر میں اُن کے پرستار موجود ہیں۔ میری خوش بختی ہے کہ مجھے باباجی کی نظرِ التفات کی نعمتِ نایاب نصیب ہوئی اور گزشتہ دو دہائیوں سے اُن کی صحبت میں تربیت کے کٹھن مراحل طے کرنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ اگر میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کوئی ربط اور تاثیر ہے تو یہ باباجی کی ہی توجہ، تربیت اور فکری ریاضت کے سمندر کے پاتالوں سے ملنے والے گوہرِ نایاب کے سبب ہے۔

ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی 9 نومبر کی شام باباجی کی رہائش گاہ پر علامہ اقبال کی ولادت باسعادت کے حوالے سے ایک پُروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں نہ صرف ملک بھر سے باباجی کے مداحین تشریف لائے بلکہ فکرِ اقبال پر روشنی ڈالنے اور پُرمغز گفتگو کرنے والے اقبالیات کے ماہر مفکرین اور علمی شخصیات بھی شریک ہوئیں۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی کے فوراً بعد نشست کا آغاز ہوگیا۔ سب سے پہلے کلامِ اقبال کو خوش گلو فنکاروں نے نہایت عقیدت سے گایا اور ماحول کو فکرِ اقبال کی حرارت سے ایسے گرمایا کہ سامعین جھوم کر رہ گئے۔ اس کے بعد گفتگو کا مرحلہ شروع ہوا اور ملک کی بڑی قدآور علمی شخصیات نے اقبال کی شاعری میں موجود تاریخی حوالوں، فلسفۂ خودی کے اسرار و رموز اور نوجوانوں کو للکارنے والے موضوعات کا احاطہ کیا جن کی بدولت وہ برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کے سیاسی افکار کے حوالے سے بھی مدلل گفتگو ہوئی اور مقررین نے نہایت خوبصورتی سے سامعین پر یہ بات آشکار کی کہ علامہ اقبال کے الٰہ آباد کے تاریخی اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کے تصور نے گویا انھیں ایک نئی زندگی، ایک نیا ولولہ اور ایک نئی سمت عطا کی جس عظیم خواب کی تعبیر قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے قیام کو یقینی بنا کر ہمارے اسلاف کو عطا کر دی۔ یہ علامہ اقبال ہی تھے جو اپنی سیاسی بصیرت اور روحانی طاقت سے بھانپ چکے تھے کہ اُن کے تصورِ پاکستان کو عملی حقیقت صرف قائداعظم کی شخصیت ہی ممکن بنا سکتی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو، جو دلبرداشتہ ہو کر لندن میں قیام پذیر تھے اور سیاست سے لاتعلقی اختیار کر چکے تھے، خطوط لکھے اور انھیں واپس ہندوستان آنے پر آمادہ کیا۔ یہ مصورِ پاکستان کا وہ احسانِ عظیم ہے جسے

ہماری آئندہ نسلیں بھی نہیں چکا پائیں گی۔ یہ تمام باتیں اس محفل کو معطر کرتی رہیں اور سامعین کو متوجہ کرنے اور فکری دُنیا میں سفر کرنے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک پُرکیف ماحول میں ایسی گفتگو یقیناً سننے والوں کے دلوں میں امید و آرزو کے کئی چراغ روشن کرتی جارہی تھی اور وہ روشنی سامعین کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں واضح نظر آرہی تھی۔

ہمیشہ کی طرح سامعین کی نظریں بابا جی کے صدارتی خطاب پر مرکوز تھیں اور وہ بڑی بے چینی سے اُن کی گفتگو کے منتظر تھے۔ جب جیدی میاں نے مسندِ خطاب بابا جی کے حوالے کی تو سامعین کی خوشی دیدنی تھی۔ بابا جی نے مردِ قلندر کی روحانی بصیرت اور فلسفیانہ تدبر پر روشنی ڈالی اور علامہ اقبال کی اسلامی تاریخ پر گہری گرفت اور قرآنِ مجید کے ان کے گہرے مطالعے پر دل کھول کر گفتگو کی۔ بابا جی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات شاعرِ مشرق کے اشعار سے مزین کر لیتے ہیں اور اپنی دلیل پر علامہ اقبال کے اشعار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ پھر اشعار کی ادائیگی کا فن بھی بابا جی کو خوب آتا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار، اندرونی خلفشار اور سیاسی انتشار کے اسباب بھی ان کے خیالاتِ جلیلہ کے احاطے میں آئے۔ انھوں نے علامہ کا یہ شعر پڑھا...

اُخوت اس کو کہتے ہیں، چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بیتاب ہو جائے

مگر آج ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے، ذاتی مفادات اور فرقہ بندی کے فسادات نے امت کا تصور تہ و بالا کر دیا ہے۔ بقول اقبال...

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

بابا جی نے آج کے نوجوانوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا، جنھیں اقبال کے فکری ورثہ کا وارث

بن کر شاہین بننا تھا اور پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنا تھا، جنھیں اپنے عظیم اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر اس گردوں کا تارہ بننا تھا، جس نے کارزارِ حیات میں گل ولالہ کا اک نیا جہان آباد کرنا تھا، جس نے اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانا تھا، جس نے ستاروں سے آگے کے جہانوں کی تلاش میں ستاروں پر کمند ڈالنا تھی، جس نے علم کی شمع سے محبت کر کے غریبوں کی حمایت کا دم بھرنا تھا، جس نے اپنے عملِ پیہم سے چمنِ زیست میں رنگِ بہار کا سبب بننا تھا اور جس نے فلسفۂ خودی سے بہرہ ور ہو کر پاکستان کو ایک عظیم مملکت بنانا تھا وہ نوجوان خرافات میں گھر کر کردار کی پستیوں کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کا شاہین بننے کے بجائے کرگس کے جہاں میں آباد ہے۔

بابا جی کی گفتگو آخری مرحلہ میں داخل ہوئی تو اُن کی آواز ہمیشہ کی طرح رندھ گئی اور بوجھل الفاظ میں جذبات کا عنصر نمایاں ہونے لگا۔ وہ کہنے لگے، ''خدائے ربِ ذوالجلال کا بے پایاں کرم ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان کی فضائیہ نے اپنے نغمات اور ترانوں میں اقبال کے شاہین کو زندہ رکھا ہوا ہے اور فکرِ اقبال نے ہماری مسلح افواج کے سجیلے جوانوں میں عقابی روح بیدار کر رکھی ہے جس کے طفیل ہماری فوج کا ڈنکا پوری دُنیا میں بجتا ہے۔ یہ ہمارے شاہین ہی ہیں جنھوں نے ملکی دفاع کو یقینی بنانے کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔''

یہ شاعرِ مشرق کے فلسفۂ خودی کی نعمت ہی تو ہے جس نے ہمیں دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ سرخرو کیا۔ اسی فقید المثال جذبے سے سرشار ایم ایم عالم نے 1965ء کی جنگ میں پلٹ کر، جھپٹ کر ایک ہی تباہ کن وار میں دشمن کے پانچ جنگی جہازوں کو ٹھکانے لگا کر ورلڈ ریکارڈ قائم کیا تھا۔ پاک فضائیہ کے کم سن شہید راشد منہاس نے اس وقت جرأت و بہادری کی تاریخ رقم کی جب اگست 1971ء میں مشق کے دوران اس کے سینئر پائلٹ نے جہاز کا کنٹرول سنبھال کر طیارے کا رخ بھارت کی طرف کرنا چاہا۔ اسی طرح کی شاندار مثال وِنگ کمانڈر محمد نعمان اور سکواڈرن لیڈر حسن محمود صدیقی ہیں جنھوں نے 27 فروری 2019ء کو ملک کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرنے پر دو بھارتی طیارے مار گرائے اور مگ 21 کے پائلٹ ابھینندن کو زندہ گرفتار کیا۔ یہی شاہین

فکرِ اقبال کے اصل وارث ہیں جن کی عقابی نگاہیں دفاعِ وطن پر ہر لمحہ مرکوز ہیں اور جن کے حوصلے ہمالیہ سے زیادہ بلند ہیں۔

جیدی میاں نے لنگر کے انتظامات مکمل کر کے چھوٹی سی چٹ بابا جی کے سامنے رکھی تو انھوں نے حضرتِ علامہ اقبال کے اس فکر انگیز شعر پر گفتگو تمام کرتے ہوئے سامعین سے اجازت طلب کی کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

□□□

قوسِ قزح کے رنگ

پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور ہماری مجموعی آبادی کا اسی فیصد حصہ زراعت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں یا دیہات میں رہنے والے لوگ دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں۔ زمین سے ان کا رشتہ پشتوں سے ہے۔ گاؤں کا خیال آتے ہی تصور میں جو نقش ابھرتا ہے وہ کشادگی، سادگی، محبت اور خلوص کا ہے۔ گاؤں کوئی بھی ہو، فطرت کے حسین نظارے دل و دماغ کو مسحور کن حد تک تازگی بخشتے ہیں۔ ہمارے پیارے وطن کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی حُسن کے بیش بہا خزانے بخشے ہیں۔ اگر شمال سے شروع کریں تو چترالی زبان، لباس، رسم و رواج، خوبصورتی اور دلکشی کی مثال ملنا مشکل ہے۔ حسین وادیاں، لہلہاتے کھیت، پھلوں کے باغات، دریا اور جھرنے، گاؤں کے لوگ، ان کی محبت و خلوص، باہمی میل جول پہاڑوں اور وادیوں میں بسنے والوں کی مہمان نوازی، قدیم کیلاش قبیلے کا اپنا منفرد ثقافتی ورثہ اور تہذیب و تمدن دنیا کے کسی ملک میں شاید ہی کہیں اور ملے۔ گلگت اور چترال کے بلند ترین مقام پر شندور میلہ اور پولو گراؤنڈ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا منفرد کھیلوں کا مقابلہ ہے۔ دریائے کنٹر (دریائے چترال) ہمارے شمال میں

رہنے والے جفاکش، پہاڑوں کا سا عزم و ہمت اور استقامت رکھنے والے پُرکشش اور خوبصورت لوگ، لوک موسیقی، عشقیہ و رزمیہ گیت، لوک داستانیں، بہادروں کے جنگی کارنامے اور حملہ آوروں کے حملے پسپا کرنے کے لیے قلعوں کی تعمیر کی داستانیں آنے والے سیاحوں کو سنا رہا ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ یہاں دنیا بھر سے سیاح اور کوہ پیما اپنے شوق اور جذبوں کی تکمیل کے لیے ہر سال آتے ہیں، پورے خطے میں ان کی ضرورت کے سامان کی دکانیں بھی موجود ہیں مگر یہاں کے لوگ اپنی تہذیب اور ثقافت سے پیوست ہیں۔ غربت اور ناکافی سہولیاتِ زندگی کے باوجود جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تھانے کچہری کا کلچر بالکل نہیں ہے۔ مل جل کر رہنے اور کمیونٹی کا خیال رکھنے کا فیصلہ انھوں نے اپنے طور پر کیا تھا۔ یہاں پر دنیا کا سب سے بڑا سرد صحرا، سرفرنگا میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سطح سمندر سے اٹھارہ ہزار میٹر کی بلندی پر دیوسائی کا میدان، 37 کلومیٹر تک تاحد نظر جنگلی پھولوں کے رنگ، یہ فطرت کا وہ نظارہ ہے جو ہر انسان پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ دریائے چترال یہاں پر دریائے شیوک میں شامل ہو کر لداخ اور نانگا پربت کے پاؤں کو چھوتا ہوا جب خیبر پختونخوا میں داخل ہوتا ہے تو اباسین کہلاتا ہے۔ یہی اباسین جب پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں سے گزرتا ہے تو قدیم آبادیوں اور بستیوں، گاؤں، گوٹھوں، بانڈوں اور ڈھوکوں، قصبوں اور شہروں کی کہانیاں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ جب پنجاب کے جہلم، چناب، ستلج اور راوی کو چھوتا ہے تو جو حُسن اور محبت پہاڑوں نے اس کے سپرد کی ہوتی ہے، اس کی آمیزش اور سفر کی داستانیں اور اپنا پن گلگت بلتستان، خیبر پختونخوا، پنجاب، بلوچستان اور بالآخر کراچی، ٹھٹھہ اور گوادر سے مچھیروں کے گوٹھوں اور بستیوں کی خوشی اور رنج پورے پاکستان کے ترجمان اور سفیر بن کر بحرِ ہند کے وسیع اور گہرے دامن میں ڈال دیتے ہیں اور ساگر اپنی فطرت کے مطابق سب کا راز سینے میں چھپا کر بظاہر بارعب اور پُرسکون نظر آتا ہے۔

پاکستان کو ربِّ عظیم نے ہر ہر نعمت سے نوازا ہے۔ گاؤں، قصبے اور میٹرو پولیٹن شہر ہوں یا بلوچستان اور سندھ کے خوبصورت ساحل اور ساحلوں پر بسنے والوں کے رزق کے حصول کے

ذرائع نقل وحرکت اور صحت وصفائی کا نظام، گاؤں کے باسیوں کے اندازِ زندگی اور بندگی کے بارے میں فکر وفلسفہ اور باہمی یکجہتی کے حسین مظاہر، معاشرتی ومعاشی ترقی کے تصورات اور موجودہ ترقی یافتہ دور کے ساتھ ہم آہنگی، معاشرتی تہذیبی ارتقا کا مقابلہ کرنے کی قابلیت، تربیت اور صلاحیتیں جن کا سمجھنا، جاننا اور جانچ پڑتال کرنا ہر فرد کا اولین فریضہ ہے۔ میدانی علاقوں، وسیع وعریض کھیتوں اور لہلہاتی فصلوں کے ساتھ ساتھ سرسبز وادیوں، پہاڑوں، مرغزاروں اور منفرد اوصاف کے حامل قبیلوں اور خاندانوں نے دھرتی کو وہ رونق بخشی ہے کہ گاؤں کے بسنے والوں نے اپنے ورثے کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ گو مشکل راستہ ہے مگر جدیدیت نے اپنا اثر دور دراز بسنے والوں پر بھی ڈالا ہے۔ لوک داستانوں، بود وباش، لباس، خوراک، فوک موسیقی، گلوکار، شعرا اور فنونِ لطیفہ کے حامل ورثہ اور یہاں کے باشندوں کی اکثریت کو متاثر کیا ہے۔ غیر محسوس طریقے سے رویوں اور سوچوں کو روپے پیسے کی حرص نے یکجا کر کے سوچوں کے زاویے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

اگر تذکرہ گاؤں کی ثقافت، تمدن، فنِ تعمیر، عادات واطوار، رسم ورواج، زبان وادب، تہذیبی ورثے، لباس اور خوراک کا ہو تو انواع واقسام اور جغرافیائی اعتبار سے یہ الگ الگ ہوں گے مگر ایک چیز جو مشترک نظر آتی ہے وہ ہے سادگی اور بے تکلفی اور یہی بے ساختہ پن گاؤں اور شہروں میں بسنے والوں میں تفریق کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر خطے میں بسنے والوں کی غذائی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور لباس، موسموں کی تبدیلی اور سختی سے بچنے اور ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے منفرد ہوتا ہے، عادات واطوار بھی اس نسبت سے الگ الگ سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ اگر بات پاکستان کے دیہات کی ہو تو یہاں مختلف پیشے اور ملازمت اختیار کرنے کے مواقع موسموں اور علاقائی تبدیلیوں کے اعتبار سے ہوں گے۔ اگر سرد علاقوں کے گھروں کو دیکھا جائے تو چھتیں نیچی، دروازے کھڑکیاں بھی کم ہوں گی اور لمبائی اور چوڑائی اوسط درجے کی ہوگی۔ خوراک میں گوشت اور خشک میوہ جات، پنیر، قہوہ، سبزیاں اور خشک گوشت وغیرہ جبکہ لباس موٹے اور اونی ہوں گے، جانوروں میں بھی بھیڑ، بکری اور گائے قد کاٹھ میں کم ہوں گی۔ میدانی اور بارانی

علاقوں میں اسی طرح گھروں کی ساخت مختلف ہوگی۔ بڑے بڑے کمرے اور ان کے آگے برآمدے، کھلے صحن اور ڈیوڑھی اور لکڑی کے بڑے بڑے خوبصورت بیل بوٹوں سے کندہ دروازے اور روشن دان، لان اور کاٹن کے ہلکے پھلکے لباس، گرمیوں میں لسی، بادام کا شربت، دودھ، دہی اور رسیلے آم اور امرود، سردیوں میں مالٹا و موسمبی، سبزیوں کی پیداوار اور ترسیل، کھلے ڈھلے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، سادہ اور عام فہم انداز میں زندگی کے رموز کو جب بیان کرتے ہیں تو بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا علم و دانش، دانائی اور حکمت، زمین سے اگنے والے اناج کی طرح ایک رزق ہی ہے جو خالص دیسی ہے۔ جس میں مٹی کی خوشبو اور نرالا پن ہے۔

اسی طرح سندھ کے کچے پکے مکانوں اور گھاس پھوس سے بنے گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان مرد و زن سادہ اور گہرے رنگ کے ملبوسات زیب تن کیے نظر آئیں گے۔ چاول، سرخ چاول کی روٹی، مچھلی کا سالن، لسی، دودھ، دہی اور مشروبات ان کی مرغوب غذائیں ہوں گی۔ شیشے کے کام کے نادر نمونے بلوچ اور سندھی کلچر کی نمایاں دستکاری کی مصنوعات ہیں۔ اگر ذکر پشتون کلچر کا ہو تو چپلی کباب، تکہ اور گوشت سے تیار ہونے والے کھانوں میں پشاور اور خیبر پختونخوا کا نام ہی دماغ میں آتا ہے۔ پشتو موسیقی، بہادر اور شجیع، محب وطن، مہمان نواز، سادہ اور محنت کش لوگ۔ یہاں کے دیہاتوں کی سادہ خوراک، دیسی گھی، پنیر اور بڑے تندوری نان ہیں۔ گھروں میں فرشی نشست اور حجروں میں قالین اور گدے پر بیٹھنے کا رواج ہے۔ رباب یہاں کا معروف ساز ہے۔ بلوچ قبیلوں کے لوگ اپنی روایات کے مطابق مختلف علاقوں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سادگی اور قبیلے کے فیصلے یہاں کے باشندوں اور برادری کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بلوچ قوم، گوشت، سجی، دنبے کا گوشت اور خشک گوشت، تازہ خشک میوہ جات کو پسند کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی ایک لڑی میں پروئے ہوئے گوہر و یاقوت ہیں جو الگ الگ رنگ اور ساخت کے باوجود ایک وحدت ہیں۔ یہ قوسِ قزح کے رنگ ہیں، ہر رنگ نرالا

اور دلکش ہے۔ ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیا ملک کے چہار سُو پھیلی ان نعمتوں کا ہمیں کوئی ادراک بھی ہے یا نہیں؟

□□□
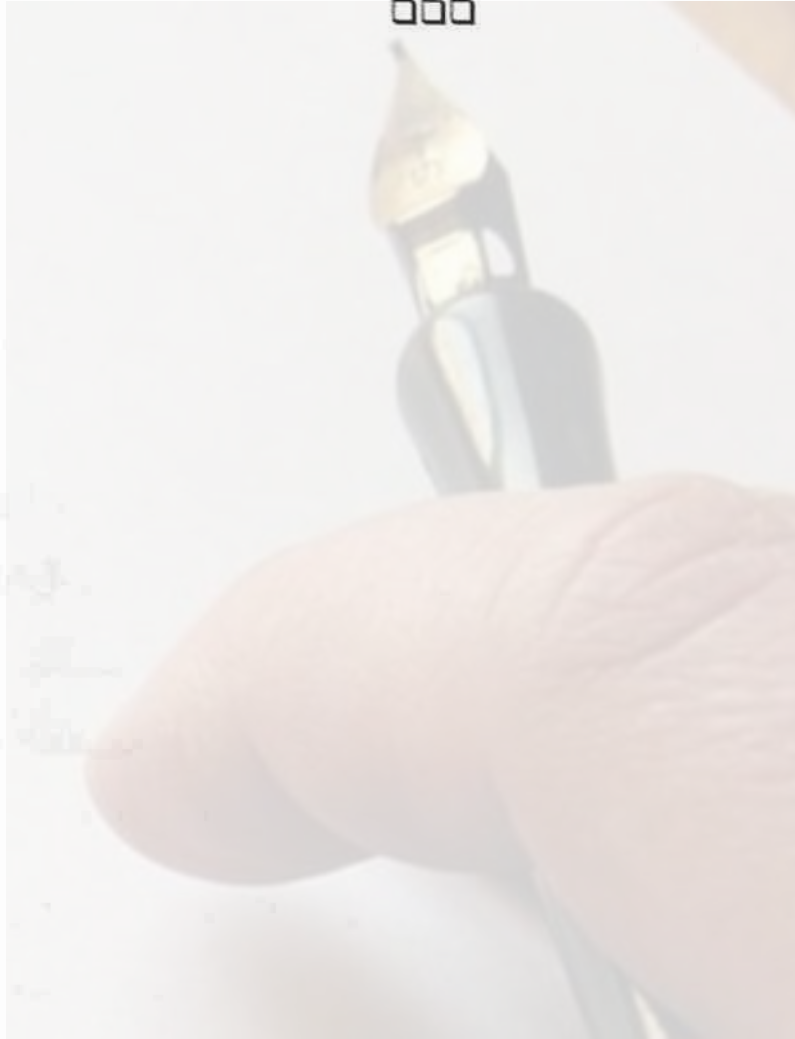
ٹیسٹ کیس

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے میری والہانہ محبت کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے نمایاں اوراولین تو حب الوطنی کے جذبات ہیں جو مجھے اپنے ملک کے سب سے خوبصورت شہراور مرکزِ اقتدار سے پیار کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس سحر انگیز شہر کا قدرتی حُسن سے مالا مال لینڈ سکیپ ہے جو مارگلہ پہاڑوں کے دامن میں واقع ہونے اور مختلف انواع واقسام کے سرسبز وشاداب پودوں اور پھولوں سے مزین ہونے کے سبب اس کو چار چاند لگا تا ہے۔ اس شہر میں واقع بلند و بالا اور پُرشکوہ عمارات اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں تو طاقتور سیاسی ایوانوں کی موجودگی اسے دوسرے شہروں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ یہ شہر دُنیا بھر کے سفارتخانوں کی موجودگی کی وجہ سے بھی کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اپنے مخصوص موسم اور سیر وسیاحت کے مقامات کی بدولت پاکستان بھر سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی ہے جو پورا سال اس دلآویز شہر کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ ان سارے عوامل میں مگر سب سے زیادہ مضبوط اور منفرد وجہ میرا وہ رومان ہے جس میں بہت سی یادیں اُس وقت کی جڑی ہیں جو میں نے اس دیدہ زیب شہر میں مختلف ادوار میں گزارا ہے۔

میری خوشگوار یادوں کے جھرمٹ میں سب سے پہلے وہ دور ہے جب میں 1990ء کی دہائی

کے اوائل میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کے امتحان سے فراغت کے فوراً بعد انگریزی زبان و ادب کے ساتھ اپنے گہرے شغف کی بدولت یہاں آیا تھا اور حصولِ تعلیم کی خاطر نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں داخلہ لیا تھا۔ چونکہ اس وقت بی اے کے امتحان اور اس کے بعد ایم اے کے داخلے میں لگ بھگ ڈیڑھ برس کا توقف ہو جاتا تھا، لہٰذا میں نے اس وقت کو ضائع کرنے کے بجائے سپوکن انگلش کے ڈپلومہ پروگرام میں داخلہ لے لیا اور پھر ساتھ ہی ایک سال پر محیط انگریزی زبان و ادب کے ایڈوانس ڈپلومہ میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا سلسلہ برقرار رکھا۔ اس طرح میں تقریباً ڈیڑھ سال یہاں قیام پذیر رہا اور عین عہدِ شباب کے وہ خوبصورت صبح و شام اور ان سے جڑی یادیں آج بھی میرے لیے خزاں رُت میں نویدِ بہار کا سبب بنتی ہیں۔ اسلام آباد اس وقت اسم بامسمیٰ تھا اور صحیح معنوں میں امن و آشتی کا گہوارہ تھا۔ آبادی محدود تھی، فضا سازگار، موسم خوشگوار، لوگ قابلِ اعتبار، دوست باعثِ افتخار اور شہر بے ہنگم ٹریفک سے مکمل ناآشنا۔ ٹریفک سگنل پر پولیس کی عدم موجودگی میں بھی رکنے کا رواج تھا اور لال بتی ہی ٹریفک سارجنٹ کا نعم البدل تھی۔ اوور سپیڈنگ اور ون ویلنگ یکسر ناپید تھی اور قانون کا احترام آج سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جرائم بہت کم، کبھی کبھار چوری چکاری یا معمولی لڑائی جھگڑے کے واقعات رپورٹ ہوتے تھے مگر قتل و غارت کا بازار جو آج گرم ہے، اس کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ سرِ شام اسلام آباد کی سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں اور پورا شہر سائیں سائیں کرتا تھا، اسی مناسبت سے کچھ لوگ اسے ''شہرِ خموشاں'' بھی کہتے تھے۔

دوسری مرتبہ میں 1990ء کی دہائی کے آخر میں بطور پولیس انسپکٹر پولیس کالج سہالہ میں تقریباً ایک سال زیرِ تربیت رہا تو اس وقت بھی رات نو بجے سپر مارکیٹ بند ہو جاتی تھی اور ہمیں مزید گھومنے پھرنے اور آوارہ گردی کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ ملتا تو ہم چکلالہ ایئرپورٹ جا کر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کے استقبال پر شادمانی اور جانے والوں کی وجہ سے چھائی اداسی کا بغور جائزہ لیتے۔ اس وقت یہ شہر زیرِ تعمیر نظر آیا، جگہ جگہ نئی عمارات اور شاپنگ مراکز بنتے نظر آئے اور

ٹریفک بھی پہلے سے زیادہ رواں دواں دیکھی۔ تیسری مرتبہ میری پوسٹنگ سات برس قبل ایف بی آر ہیڈکوارٹرز ہوئی تو میں نے اُن چند ماہ کے قیام کے دوران اس شہر کو تیزی سے بدلتے دیکھا۔ طول و عرض میں پھیلتا یہ شہر آبادی کے لحاظ سے بھی آگے بڑھتا نظر آیا۔ ماحول گردآلود ہوا تو گویا انسانی رشتے بھی اس آلودگی کی زد میں آ گئے اور اس کے ساتھ جرائم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ جب شہر پھیلتے ہیں، آبادی میں اضافہ یقینی امر ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف شہریوں کو میسر سہولتوں پر دباؤ بڑھتا ہے تو دوسری طرف لوگوں کے اژدحام سے بہت سی سماجی برائیاں اور جرائم پنپتے ہیں اور یہی کچھ اسلام آباد کے ساتھ ہوا۔

بدقسمتی سے آج وہ اسلام آباد نہیں رہا اور نہ ہی میرا اس سے جڑا وہ رومان، جس نے اب تلخ حقائق کی چادر اوڑھ لی ہے اور مجھے میری حسین یادوں سے دور کرنا شروع کر دیا ہے جو اس خوبصورت شہر کے پاس میری امانت تھیں۔ اپنے حُسنِ ترتیب کی بدولت مشہور اس شہر میں گزشتہ دو دہائیوں میں بے پناہ کمرشل سنٹرز بنے اور کئی نئے رہائشی علاقے آباد ہوئے جن کی بدولت یہاں اجنبی انسانوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ سیاسی طاقت کے ایوان تو پہلے سے ہی موجود تھے، ریئل اسٹیٹ کے دھندے اور ناجائز ذرائع آمدن نے بھی جب یہاں کا رخ کر لیا تو طاقت، دولت اور اختیارات کے خوفناک امتزاج نے لوگوں کا مزاج بدل ڈالا۔ بالخصوص موجودہ نسل میں اخلاقی تربیت کے فقدان نے ہماری اشرافیہ اور دولت مند طبقے کے بگڑے ہوئے بچوں کی اخلاق باختہ حرکات کے سبب اس شہر کے باسیوں کی زندگی اجیرن بنا ڈالی ہے۔ طاقتور سیاسی زعما اور بااختیار شرفا اور ان کی اولادوں کے ناز و ادا نے شہر میں بدامنی، لاقانونیت اور خوف و ہراس کا ایک نیا کلچر متعارف کرایا ہے۔ آئے روز ہمیں کسی نئے حادثے اور المناک سانحے کی خبر ملتی ہے تو دل لرز جاتا ہے۔ اسلام آباد کے عام شہری کئی راتیں جذباتی خلفشار کے سبب سو نہیں پاتے۔ پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے ادارے طاقتوروں کے سامنے اکثر بے بس دکھائی دیتے ہیں۔

گزشتہ چند مہینوں میں کئی دلخراش واقعات رونما ہوئے۔ ایبٹ آباد سے آئے چار بھائیوں

کو ایک لاڈلے نے کچل ڈالا تو چند دنوں میں ہی ''مصلحت'' اور ''مصالحت'' نے مل کر معاملہ دبا ڈالا۔ پھر ایک نہتے نوجوان کو قانون کے محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا تو چند روز خبروں کی زینت بننے کے بعد وہ کیس بھی تاریخ کا حوالہ بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد عثمان مرزا کیس نے چہار سُو خوف برپا کیا تو ساتھ ہی نور مقدم ایک بگڑے رئیس زادے کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اب وفاقی دارالحکومت میں موت کے سائے دراز ہونا شروع ہو گئے ہیں اور ہر طرف خوف نے اپنے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ عام شہری عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ پاکستان بھر میں قتل ہونے والی نور مقدم کی چیخوں کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

ایسے میں خوش آئند امر یہ ہے کہ اس شہرِ بے اماں میں اسلام آباد پولیس نے نہایت دلیری اور پیشہ ورانہ مہارت سے نہ صرف مبینہ قاتل کو گرفتار کیا ہے بلکہ اس کے والدین اور دو ملازمین کو بھی پابندِ سلاسل کر دیا ہے جن کی بروقت مداخلت اور پولیس کو اطلاع دینے کے سبب نور مقدم کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ پولیس کسی بھی قسم کے دباؤ کا اثر لیے بغیر حسبِ ضابطہ کارروائی کو تیزی سے منطقی انجام کی طرف آگے بڑھا رہی ہے۔ یہ کیس دراصل پولیس کے لیے ایک ٹیسٹ کیس کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سرخرو ہونا اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مجرمان کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر پولیس وفاقی دارالحکومت کے باسیوں میں پائے جانے والی خوف و ہراس کی ہیجانی کیفیت کا خاتمہ کر سکتی ہے اور شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے حقیقی محافظ بن کر اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کیس ہمارے نظامِ انصاف کے لیے بھی ایک کڑا امتحان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون اس آزمائش میں سرخرو ہوتا ہے اور کون طاقتور کے سامنے بے بس ہو کر بے آبرو! یہ فیصلہ وقت کرے گا اور فیصلے کی گھڑی زیادہ دور نہیں!

بقولِ شاعر تو حالات کچھ اس طرح کے ہیں...

قانون سے ہماری وفا دو طرح کی ہے
انصاف دو طرح کا، سزا دو طرح کی ہے

ایسا کریں کہ آپ کہیں اور جا بسیں
اس شہر میں تو آب و ہوا دو طرح کی ہے

□□□
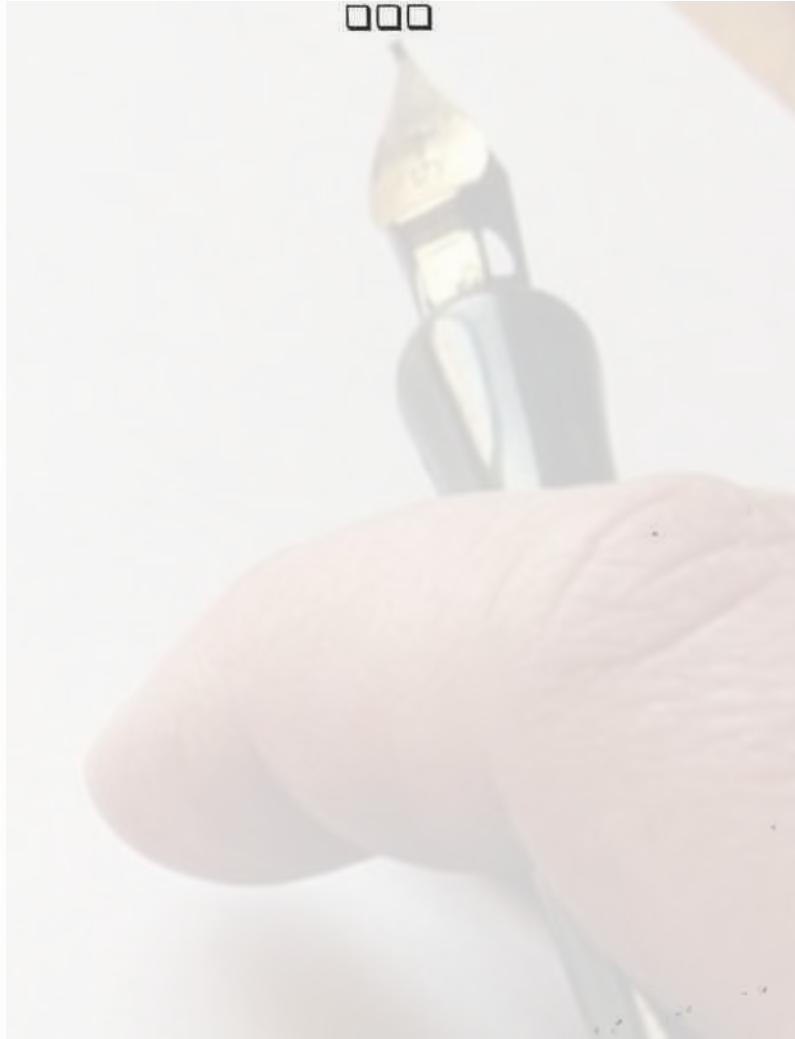
کراچی کا قرض

ایک وقت ایسا آتا ہے جب دل پر لگے گہرے سے گہرے زخم بھی مندمل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی زخموں سے ٹیس اُٹھتی ہوئی محسوس ضرور ہوتی ہے مگر ہم کافی حد تک نارمل زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں لیکن خدانخواستہ اگر ریڑھ کی ہڈی متاثر ہو جائے تو تمام عمر اس کے بھیانک اثرات تاریک سایوں کی مانند ہماری زندگی پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ ہم نہ صرف عقل وشعور سے محروم ہو سکتے ہیں بلکہ زندگی بھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا کمر میں ہلکا سا درد بھی ہلکا نہیں ہوتا اور نہ اسے معمولی سمجھنا چاہیے بلکہ فوری اس کے علاج کی طرف توجہ دینی چاہیے، ورنہ سنگین نتائج بھگتنا پڑ سکتے ہیں۔ اگر اس تناظر میں بات کی جائے شہر قائد کی تو بلاشبہ کراچی پاکستان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور بلا مبالغہ پاکستان کی معاشی صحت وسلامتی کا دار و مدار کراچی کی ترقی اور خوشحالی پر ہے۔ سمندر کنارے واقع، آبادی کے لحاظ سے یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور دُنیا کا آٹھواں بڑا شہر ہے جو یقیناً اپنی صنعتی وتجارتی سرگرمیوں، بین الاقوامی ایئرپورٹ، بندرگاہ، سٹیٹ بینک آف پاکستان، پاکستان سٹاک ایکسچینج اور مزارِ قائد کی موجودگی کی بنا پر پاکستان میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کراچی کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حکومتِ پاکستان نے پہلی تین دہائیوں میں کراچی کو ایک بین الاقوامی شہر بنانے کے لیے دن رات خوب محنت کی اور شہری سہولتوں سے لے کر صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یوں کراچی روشنیوں کا شہر کہلایا۔ پاکستان سٹیل جیسے بڑے اداروں نے شہرِ قائد میں روزگار کے بے پناہ مواقع پیدا کیے اور کراچی کے باسیوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی کے دسترخوان پھیلا کر پاکستان بھر سے لوگوں کو خوش آمدید کہا، اس طرح یہ سندھی، مہاجر، بلوچ، پشتون اور پنجابی سب کے لیے یکساں اہمیت کا حامل شہر بن گیا اور ''منی پاکستان'' کے نام سے جانا جانے لگا۔ پاکستان کے دورے پر آنے والے تمام عمائدین اور سربراہانِ مملکت بشمول ملکہ برطانیہ اور امریکی صدر کی کراچی آمد پر شہر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا، سنوارا جاتا، نکھارا جاتا اور اہلیانِ کراچی کا والہانہ استقبال، ثقافتی حسن اور بے پناہ محبت آنے والے معزز مہمانوں کا دل جیت لیتے اور وہ ہمیشہ کے لیے کراچی کے دیوانے ہو جاتے مگر پھر پاکستان کی صنعتی و تجارتی ترقی کے ضامن اس شہر کو حاسدوں کی نظرِ بد لگ گئی اور پاکستان کے دشمنوں نے اسے اپنی مذموم کارروائیوں کا ہدف بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1980ء کے اوائل سے لے کر آج تک، کراچی گزشتہ چار دہائیوں سے مختلف مسائل میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

پاکستان کے دشمنوں نے روشنیوں کے اس شہر کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اپنے مخصوص کارندے کرائے پر لے کر کراچی میں نسلی فسادات وصوبائی تعصب کے نام پر آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔ اس طرح شہرِ قائد کو ابتدا میں جو مرکزی اہمیت حاصل تھی، وہ بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے میں معدوم ہوتی چلی گئی۔ مفاد پرستی کی چادر اوڑھے مقامی حکومت پر راج کرنے والے مفاد پرست عناصر نے خود کو کراچی کا وارث کہہ کر کراچی کو لاوارث کر دیا۔ ایک مدت تک دشمنوں کے ہاتھوں کھیلنے والوں نے کراچی کو مکمل طور پر یرغمال بنائے رکھا اور بغض پر مبنی خوفناک سیاست

کی گئی جس کے نتیجے میں اسے کئی بار لہو سے رنگا گیا۔ اس ناپاک سیاست نے اپنا زہر کراچی میں بسنے والے مہاجرین کی رگوں میں انڈیلنا شروع کیا، اس مکروہ کھیل کو بھارت کی خفیہ ایجنسی کی پشت پناہی حاصل رہی جو (خاکم بدہن) پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی (کراچی) پر کاری ضرب لگا کر پاکستان کو گھٹنوں کے بل گرانا چاہتی تھی تاکہ وہ کبھی دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ روشنیوں کا شہر کراچی اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کراچی دنیا کے خطرناک ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ معاشی، صنعتی اور تجارتی ترقی کا پہیہ جام کر دیا گیا اور کراچی کی شناخت ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان، بوری بند لاشیں، سٹریٹ کرائمز، لوٹ کھسوٹ اور دیگر گھناؤنے جرائم کے گڑھ کے طور پر ہونے لگی۔ مگر ہماری خوش بختی یہ ہے کہ قومی سلامتی کے محافظ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ایک مربوط اور جامع حکمتِ عملی کے ذریعے پاکستان کے دشمنوں اور ان کے آلہ کاروں کے تمام ناپاک عزائم کو کلی طور پر ناکام بنا دیا اور کراچی کو دوبارہ امن و آشتی کا گہوارہ بنا کر اس کی معیشت، صنعت اور تجارت کو دوبارہ مضبوط اور توانا بنانے کا کام شروع کر دیا۔

گزشتہ چار دہائیوں میں جاری رہنے والے آگ اور خون کے اس کھیل میں کراچی میں شہری سہولتوں کو یقینی بنانے والے تمام اداروں کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کے باوجود کراچی کے باسی صاف پانی کی بوند بوند کو ترس گئے۔ ٹرانسپورٹ کی سہولت عملی طور پر مفقود نظر آئی، جگہ جگہ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر دکھائی دیئے، سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں تو ندی نالے تجاوزات کی زد میں آ کر مکمل طور پر ناکارہ ہو گئے۔ دوسری طرف اٹھارہویں ترمیم کے بعد تمام معاشی وسائل اور محصولات کی موجودگی کے باوجود، صوبائی حکومت کی بدانتظامی اور بے حسی کے سبب وطنِ عزیز کو پچپن فیصد ریونیو دینے والے کراچی کے عوام اسے ''کچراچی'' کہنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ بارشوں نے کراچی کو ایسا بے حال کیا کہ بارش کا پانی سیلابی ریلے کی صورت میں پورے شہر میں دندناتا رہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سمندر

نے آگے بڑھ کر تمام شہر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہو، سڑکیں دریا اور گلیاں ندیوں کا منظر پیش کرنے لگیں۔ شہر کے ساتوں انڈر پاس سوئمنگ پول بن گئے۔ پانی کے بپھرے ریلے گاڑیوں، بسوں اور موٹر سائیکلوں کو بہالے گئے، فولادی کنٹینرز کاغذ کی کشتیوں کی طرح پانی کے ساتھ ڈولتے نظر آئے۔

بارش کا پانی سینہ تان کر آگے بڑھا اور سرکاری دفاتر، عدالتوں، رہائشی علاقوں اور مارکیٹوں کو ڈبوتے ہوئے ایک خوفناک قدرتی آفت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس تباہ کن صورتِ حال پر عدالتِ عظمیٰ نے خاصی برہمی کا اظہار کیا اور حکومتِ سندھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی ''حکومت نام کی کوئی چیز ہی نہیں، سندھ حکومت کی رِٹ کہاں ہے؟ وزیر اعلیٰ سندھ ہیلی کاپٹر پر جاتے ہیں، گھوم کر واپس آجاتے ہیں، لوگوں کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ شہر میں صفائی کا ذمہ دار کون ہے؟ کون ہے جو اس شہر کو صاف کرائے؟ بچے گٹر کے پانی میں روز ڈوبتے ہیں، کے الیکٹرک والے بھی یہاں مزے لے رہے ہیں، شہر میں کئی گھنٹوں پر محیط لوڈ شیڈنگ کی جارہی ہے، کس کی اتنی ہمت ہے کہ وہ کراچی کی بجلی بند کرے؟ کراچی کو ہر کوئی تباہ کر رہا ہے، ہر کوئی اپنے حصے کی بالٹی بھر کے چلا جاتا ہے۔''

کراچی ہم سب کا ہے اور ہم سب اس کے مقروض ہیں۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ اس قدرتی آفت کے سامنے بےبس صوبائی حکومت نے جب ایک بار پھر فنڈز کی کمی کا رونا رو کر اپنی ناکامی کے جواز تراشنے کی کوشش کی تو وزیر اعظم پاکستان نے گزشتہ چار دہائیوں پر محیط شہرِ قائد کے جملہ مسائل کو یکسر حل کرنے اور کراچی کا قرض چکانے کی ٹھان لی۔ وہ گزشتہ دنوں پاکستانی تاریخ کے سب سے بڑے گیارہ سو ارب کے ڈویلپمنٹ پیکیج کے ساتھ کراچی پہنچے اور سندھ حکومت کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کے ایک مربوط پروگرام کے ذریعے کراچی کی مکمل بحالی اور تعمیرِ نو کا جامع منصوبہ ترتیب دیا۔ اگر یہ گیارہ سو ارب پوری ذمہ داری، دیانت داری اور شفاف انداز میں خرچ کیے گئے تو بلاشبہ کراچی ایک مرتبہ پھر پاکستان کی صنعتی و تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن جائے گا

اور ہمارے معاشی استحکام کی ضمانت بن کر قومی ترقی وخوشحالی میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتا ہوا نظر آئے گا، ان شاء اللہ!

□□□

جنھیں بے بسی نے مارا

پاکستان میں سیر وتفریح اور فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے کا شوق پچھلے چند سالوں میں کافی بڑھا ہے۔ ذرائع نقل وحمل میں بہتری آئی ہے اور چھوٹی، بڑی ذاتی گاڑیوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سال موسم کی پہلی بارش اور برف باری کی پیش گوئی سے سیاحت کے متوالوں نے مری کا رخ کرنے کا ارادہ کیا۔ ہماری قوم میں دو چیزیں بہت کم اور دو چیزیں بہت زیادہ ہیں۔ پلاننگ اور ڈسپلن کی شدید کمی ہے جبکہ جذباتی فیصلے اور بھیڑ چال کی بے حد زیادتی۔ پہاڑی علاقوں کا اپنا مزاج ہے اور قدرت کا اپنا نظام۔ پہاڑی علاقوں میں خراب موسم انتہائی خطرناک ہو جایا کرتے ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ اور پارکنگ کی کمی مری کا شروع سے مسئلہ رہا ہے، امسال بھی یہی ہوا۔ اتنی گاڑیاں مری اور اردگرد کے علاقوں میں داخل ہو گئیں کہ سڑکیں جام ہو کر رہ گئیں۔ اسی دوران موسم کے تیور حد درجہ بگڑ گئے۔ برف باری، طوفانِ بادوباراں نے مہلت ہی نہ دی اور لوگ بچوں اور خواتین سمیت برف زاروں میں پھنس گئے۔ مری میں برفانی طوفان اور خراب موسم سے جو تباہی مچی، اس کا اندازہ یا ذرا سا بھی شائبہ تک کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ یکا یک حالات تبدیل ہوئے۔ کرائسس مینجمنٹ کی کوئی تربیت یا موک ایکسرسائز، کبھی پریکٹس نہیں کی گئی، نہ کوئی

منصوبہ بندی نظر آئی۔ ذمہ داریوں کا تعین اور تفویض کا نظام وضع کیا گیا اور نہ سیاحوں کی تعداد پر نظر رکھی گئی۔ نہ تو سیاحت کے کوئی اصول وضع کیے گئے، نہ حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور نہ ہی ان سے نمٹنے کی تدبیر۔ بدقسمتی سے ہم سب بحیثیت قوم نہیں سوچتے، بطور فرد اپنی اپنی راگنی الاپتے ہیں اور یہی مجموعی اور عمومی رویہ ہمیں مسائل میں دھنسا رہا ہے۔ ہم اس حد تک سادہ، کم فہم اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے نابلد ہیں کہ کیمیائی، سائنسی، طبیعاتی اور فطری عمل پذیری کو بھول کر روایتی انداز میں گاڑی میں ہیٹر چلا کر بےفکری سے سو گئے۔ موسم کی صورتِ حال کے پیشِ نظر تمام ذمہ داری سرکاری اداروں اور انتظامیہ پر ڈال کر انھیں ہر چیز کے لیے جوابدہ ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ اپنی جگہ درست ہے مگر پورا سچ نہیں۔

سیاحتی مقامات اور خاص طور پر پہاڑوں کا سفر کرنے والوں کی کچھ ذاتی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ تفریح کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی اور حفاظت کو بھی ملحوظ رکھیں۔ سیر و سیاحت کی ضرورت اور شوق اپنی جگہ مگر حالات کی سنگینی کا بھی ادراک کرنا ضروری ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال اور اس کے ردِعمل کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں گیا۔ کمال بات یہ ہے کہ ہم نے ایجادات اور مشاہدات کو تو کب سے چھوڑ رکھا تھا، جدید سہولتوں کے بہترین استعمال کو بھی نہیں سیکھ سکے۔ یاد رہے کہ مشکلات میں اکٹھا ہونا، یکجان ہونا ہمارے معاشرے کی ایک نمایاں صفت رہی ہے۔ ہزاروں گاڑیوں میں لاکھوں لوگ تو ہوں گے، باہر نکل کر مشترکہ حکمتِ عملی اپنائی جاتی تو بچوں، عورتوں اور بزرگوں کو بچایا جا سکتا تھا۔ نوجوان ریسکیو اداروں کے ساتھ مل کر حالات کا مقابلہ کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے کہ ہم اکائیوں میں سوچتے ہیں، اجتماعی مفاد کی بجائے نفسا نفسی کی فکر نے راستے گاڑیوں کی بے ہنگم پارکنگ سے بند کر دیئے تھے۔ مقامی انتظامیہ نے بےفکر ہو کر سب کچھ موسم اور حالات کے سپرد کر دیا اور سیاح گاڑیوں کو جائے پناہ سمجھ کر بےعملی کی مثال بن گئے۔ رہتی سہتی کسر مقامی ہوٹل مافیا کی لوٹ مار اور بےحسی نے نکال دی۔ یہاں ہوٹل انڈسٹری کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تنظیمیں بھی ہیں۔ رزق کمانے کا حق سب کو ہے

مگر وقت اور حالات کی سنگینی کا ادراک بھی ضروری ہے۔ مشکل وقت میں انسانیت اور انسانی زندگی مقدم ہوتی ہے۔ ہوٹلوں میں غیر معمولی حالات میں اگر گنجائش نہیں تھی تو انھیں کرایہ بڑھانے جیسا عمل زیب نہیں دیتا تھا۔ انتظامیہ ہوٹلز کو زبردستی کھلوا کر لوگوں کو موسم کی شدت سے تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔ سیاح گھروں کے دروازوں پر دستک دے کر پناہ طلب کر سکتے تھے اور یوں موت کی بے رحم آغوش میں جانے والوں کو بچایا جا سکتا تھا۔

اگر سب آؤٹ آف باکس سوچتے تو ذرائع اور راستے نکل سکتے تھے اور اس طرح قیمتی 22 انسانی جانوں کو بچایا جا سکتا تھا مگر ہم ہمیشہ ایڈہاک ازم کی پالیسی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، حادثات اور سانحات سے سیکھ کر آئندہ کی پیش بندی نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی قوم کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ عام شہریوں کی آگہی اور تربیت کی کبھی منظم یا شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ قانون کی خلاف ورزی کتنا بڑا المیہ ہے، اس کی حساسیت کیا ہے، اس کے نتائج بھگتنے والے کس طرح متاثر ہوتے ہیں، ان کی امیدیں اور خواہشیں کس طرح تشنہ رہتی ہیں، یہ کوئی نہیں سوچتا! پے در پے رونما ہونے والے سانحات کا گہرا اور عمیق جائزہ لیا جائے تو شاید ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہماری قوم کو یکسوئی کی ضرورت ہے۔ اتحاد و یگانگت اور خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ ہم دوسروں پر الزام عائد کرنے میں سبقت لے جانا چاہتے ہیں مگر پلٹ کر سوچنے کی عادت ڈال کر اپنے حصے کی ذمہ داری کا فریضہ ادا کرنے کو اہم نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ نوجوان سڑکوں پر الجھتے نظر آتے ہیں۔

مری کے حالیہ سنگین حالات میں ضروری امر یہ تھا کہ حالات کی نزاکت کے مطابق سیاحوں کو معلومات فراہم کرنے کا فیصلہ کیا جاتا، گاڑیوں کے ہیٹر بند کرانے اور باہر نکل کر ایک دوسرے کی مدد کی طرف توجہ دلائی جاتی، کاربن مونو آکسائیڈ گیس اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں مدد دی جاتی مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ سوشل میڈیا پر زندگی کی بازی ہارنے والوں کو دکھایا جاتا رہا، الزامات اور کوتاہیوں پر زور لگا کر سارا ملبہ وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ پر ڈال کر دل کی بھڑاس نکالی

گئی۔ قومی اجتماعی سوچ کے عکاس دراصل ہمارے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔ قومی شعور ایک ارتقائی عمل سے گزر کر پختہ ہوتا ہے اور یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ قوم کا مزاج بننے اور سنورنے میں ایک نسل کی قربانی اور دوسری کی پرورش اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض تنقید برائے تنقید اور پولیٹیکل ایجنڈا ہر معاملے میں روا رکھنے کی روش تبدیل کرنا ہوگی۔ بصورتِ دیگر مری جیسے ہولناک واقعات ہوتے رہیں گے اور ہم ہر حادثے اور سانحے کے بعد لکیر پیٹتے رہیں گے۔

وقت آن پہنچا ہے کہ سرکاری محکموں کو بدلتے رجحانات، سماجی رویوں اور سوچوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ محکمہ موسمیات برفباری، طوفانِ بادو باراں، سیلاب اور منفی درجہ حرارت میں سفری معلومات اور ایس او پیز کے بارے میں عوام کو آگاہ رکھے۔ اداروں میں اصلاحات اور تربیت کا مؤثر پروگرام متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ ہوٹل انڈسٹری کی واضح طور پر درجہ بندی کے ساتھ منظور شدہ معاہدے کے مطابق مناسب کرایہ لاگو کیا جائے تا کہ سیاحت ایک انڈسٹری کی حیثیت سے ملکی اور قومی وقار کو بلند کر سکے۔

ملکہ کوہسار کے برف پوش پہاڑوں میں پیش آئے سانحے پر پوری قوم اب تک ذہنی کرب اور صدمے کا شکار ہے۔ مگر اصل اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے سانحے سے ہم بطور قوم کوئی سبق سیکھ کر مستقبل کی مؤثر پیش بندی اور ٹھوس حکمتِ عملی بنا پائیں گے؟ کیا ہماری انتظامیہ، پولیس، ریسکیو، محکمہ موسمیات اور ہنگامی حالات سے نمٹنے والے وفاقی اور صوبائی محکمے آپس میں کوئی مربوط اور مؤثر رابطے کا نظام وضع کر پائیں گے جس کی بدولت ایسے کڑے وقت میں سب مل کر حالات کا مقابلہ کریں اور مصیبت میں گھرے انسانوں کا تحفظ یقینی بنائیں؟ کیا مقامی ہوٹل مافیا کے لیے کوئی چیک اینڈ بیلنس کا نظام ترتیب دیا جائے گا؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جن کے لیے ہنگامی بنیادوں پر فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔ سانحۂ مری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے اسباب و عوامل پر بھی مسلسل بات ہو رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے ان بدقسمت افراد کو موسم کی شدت نے مارا تو دوسروں کے خیال میں وہ گاڑی میں چلنے والے ہیٹر اور کاربن مونو آکسائیڈ کی وجہ سے موت کے منہ میں گئے۔

کچھ کا خیال ہے کہ ہوٹل مافیا کی بے رحمی اور بے حسی نے ان پر زندگی کے دروازے بند کیے مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ ان افراد کو ان کی بے بسی نے مارا جو مذکورہ تمام عوامل کے مل جانے سے ان کا مقدر بن گئی تھی۔

□□□
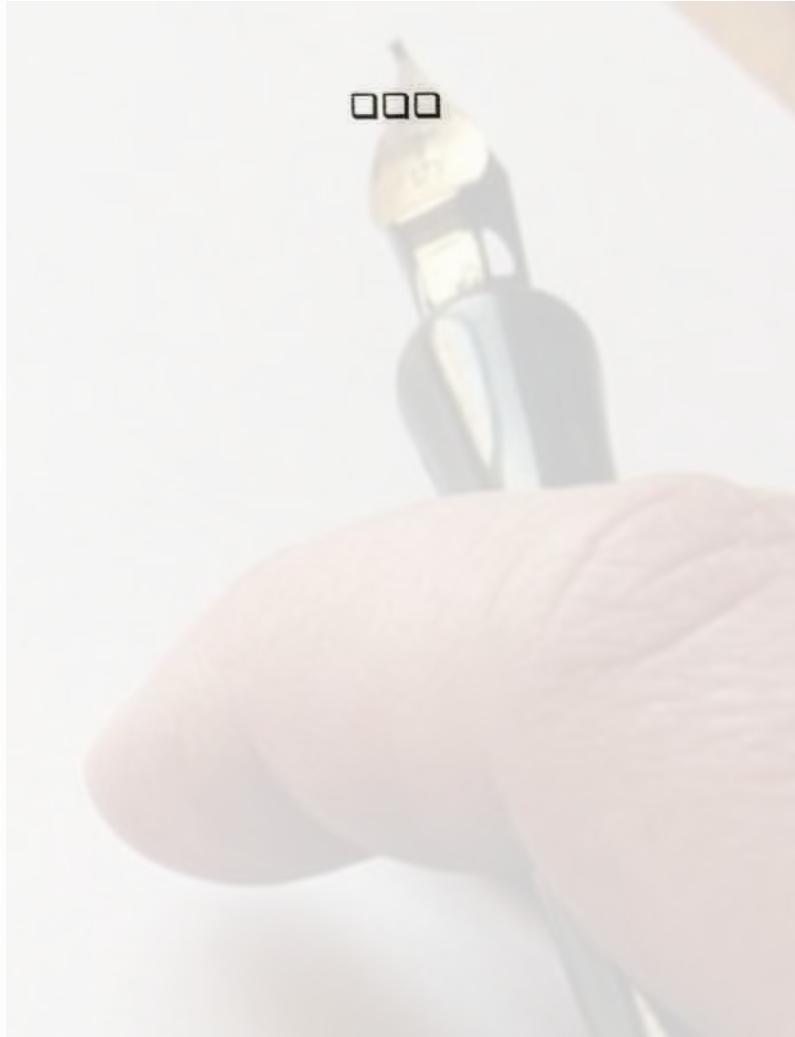
دُھند کا راج

گزشتہ کم وبیش چھ ہفتوں سے وسطی پنجاب سمیت ملک کے بیشتر علاقے سردی کی شدید لپیٹ میں ہیں اور چارسُو دھند کا راج ہے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا بلکہ ہر سال موسمِ سرما کے آغاز میں جب پہاڑوں پر برف باری شروع ہوتی ہے تو بتدریج یخ بستہ ہوائیں ملک بھر میں سردی کی لہر پھیلا دیتی ہیں۔ لوگ پہاڑی علاقوں میں پڑنے والی برف باری کے دل ربا نظارے دیکھنے قطار اندر قطار نکل پڑتے ہیں۔ سیر وسیاحت کے شوقین حضرات ٹولیوں اور گروہوں میں پہاڑوں کی آغوش میں جائے پناہ تلاش کرتے ہیں اور ٹھنڈے موسم کا مزہ دوبالا کرتے ہیں۔ مگر دھند کی شدت کی وجہ سے یہ سارے مزے اور قدرتی مناظر اس وقت بے معنی ہو جاتے ہیں جب موٹروے اور ذیلی شاہراہیں بند کر دی جاتی ہیں، گاڑی چلانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور کاروبارِ زندگی مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس موسم کا سب سے خطرناک پہلو حادثات کی شرح میں خوفناک اضافہ ہے جو درجنوں بلکہ سینکڑوں قیمتی انسانی جانیں لقمہ اجل بنا دیتا ہے۔ گھر سے خوش وخرم نکلنے والے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بجائے راہِ عدم کے مسافر ٹھہرتے ہیں اور یوں منزل روٹھ جاتی ہے، مسافت چھوٹ جاتی ہے اور رفاقت ٹوٹ جاتی ہے۔

مگر پھر سوچتا ہوں کہ دھند کا موسم تو محض چند ہفتوں کے لیے آتا ہے اور ہر سال اپنے عارضی جوبن کے بعد رخصت ہو جاتا ہے۔ سرد موسم اور برفباری کے ساتھ جڑی یہ موسمی دھند اور عارضی تبدیلی شاید اتنی نقصان دہ نہیں جتنی انسانی عقل پر چھائی تعصب، تکبر، جہالت، منافقت، تفرقہ بازی، لسانی، نسلی اور قومی تفاخر سے پیدا ہونے والی دھند تباہ کن ہے جو صدیوں سے انسانی معاشرے میں آگ اور خون کا بازار گرم کرتی آئی ہے۔ انسان کو انسان سے افضل، بالاتر اور برتر ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل اسی منفی سوچ کا شاخسانہ رہی ہے اور یہی دھند آلود رویے انسانی معاشروں میں تفرقہ بازی، انتہاپسندی، گروہی اور لسانی تقسیم پر مبنی شدت پسندی کا باعث بنتے آئے ہیں۔ سیاست، دولت، شہرت اور تجارت کی طاقت اور نشے میں چُور انسان مختلف شکلوں میں بظاہر کامیاب منصوبہ بندی اور بہترین حکمتِ عملی اپناتے ہوئے تعصب، تکبر اور تقسیم کا آلہ کار بنا اور کامیابی کی منزل سے کوسوں دور فکری اور عقلی دھند آلود راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو گیا اور تاریخِ انسانی میں نیک نامی کمانے کے بجائے ذلت اور رسوائی اپنے نام کر بیٹھا۔ کئی طالع آزماؤں نے اپنی قومیں، اپنے قبیلے اور ملک تباہ کرا لیے مگر تکبر اور تعصب کی عینک کے شیشوں پر جمی دھند کی آلودگی صاف کرنے کے بجائے اپنے گمراہ کن نظریات کا پرچار کرنے میں مگن رہے۔

تاریخِ انسانی میں ایسے کردار اور مثالیں بدرجہ اتم موجود ہیں مگر تازہ ترین مثال 2016ء میں منتخب ہونے والے امریکا کے پینتالیسویں صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی ہے جنھیں امریکی عوام نے ان کے دل پذیر نعرے Make America Great Again کی خوبصورتی کی بدولت منتخب کیا اور اُن سے بڑی بڑی توقعات باندھ لیں۔ بین الاقوامی چودھراہٹ اور پے در پے جنگوں سے بیزار اور ملک میں بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی اور بیروزگاری سے دوچار امریکی عوام یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی شخص ان کے جملہ مسائل کا حل دے گا، ان کے زخموں پر مرہم رکھے گا اور ان کے معاشی استحکام اور خوشحالی کا ضامن بنے گا، وہ دیوانہ وار بطورِ صدر ابتدائی ایام میں لیے گئے ٹرمپ کے فیصلوں پر شادیانے بجانے لگے اور بے پناہ داد و تحسین دیتے نظر آئے۔ تارکین وطن پر قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا اور

مسلمانوں پر امریکا میں داخلے پر سخت پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اپنی مزید بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ذاتی دولت میں اضافے نے صدر ٹرمپ کو متکبر، بدزبان، بددماغ اور متعصب بنا ڈالا اور وہ طاقت کے بے لگام گھوڑے پر مسلسل چابک برساتے آگے بڑھتے رہے اور امریکا کو مضبوط کرنے کے بجائے اندر سے کھوکھلا، کمزور اور تقسیم کرتے رہے۔ گوروں اور کالوں میں خلیج بڑھی تو امریکا کی نظریاتی اساس اور تاریخی کردار پر کاری ضرب لگائی گئی۔ نسلی تعصب کو ہوا ملی اور جارج فلائیڈ کے واقعے نے امریکا میں نسلی فسادات کے نئے ریکارڈ قائم کر ڈالے۔ معاشی تفاوت تیزی سے بڑھتا رہا، پھر کورونا نے صدر ٹرمپ کی مکمل ناکامی بلکہ بربادی پر مہر ثبت کر دی اور وہ تکبر و تعصب کی دھند آلود سوچ کے زہر کا شکار ہو کر 2020ء کے صداتی انتخابات میں بری طرح شکست سے دوچار ہوئے۔ آخری لمحے تک وہ طاقت کے نشے میں چور امریکا کو ہزیمت و رسوائی سے دوچار کرتے نظر آئے۔

کچھ اس سے ملتی جلتی مثال ٹرمپ کے سیاسی اتحادی اور فکری استدلال سے متاثر جنوبی ایشیا میں واقع نام نہاد سب سے بڑی جمہوری مملکت بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی کی ہے جو 2019ء میں دوسری مرتبہ منتخب ہو کر اپنی مقبولیت اور طاقت کے خمار میں بدمست ہاتھی بن کر بھارت میں نسلی اور مذہبی تقسیم کی سیاست کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں اور بھارت میں بسنے والی غیر ہندو اکائیوں کے لیے زندگی اجیرن کر رہے ہیں۔ کئی سال سے بھارت پاکستان پر دہشت گردی کا الزام لگاتا آیا ہے اور دُنیا بھر میں اس حوالے سے بدترین پروپیگنڈا کیا گیا مگر خود کشمیر کے نہتے اور معصوم شہریوں پر ریاستی جبر اور تشدد کی ایسی داستان رقم کی گئی جو ناقابلِ بیان ہے، بھارت کشمیریوں کے حقِ خودارادیت سے مسلسل انکاری چلا آ رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور ایسے کئی بین الاقوامی قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی اس کا شیوہ رہا ہے اور آئے روز مقبوضہ کشمیر میں ریاستی دہشتگردی کی اندوہناک کارروائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مودی سرکار نے اگست 2019ء میں آرٹیکل 370 اور 35A کو نکال باہر کیا اور کشمیریوں سے آئینی خودمختاری کا حق چھین کر اپنے

تیئں مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا حصہ بنا ڈالا۔ وہاں بے پناہ فوج کشی کر کے کرفیو نافذ کیا گیا اور بدترین ظلم وستم کے نئے ریکارڈ بنا کر معصوم اور نہتے کشمیریوں پر زندگی کا دائرہ محدود کر دیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں زمین اور جائیداد کی خرید وفروخت بھی بھارت کے تمام شہریوں کے لیے کھول دی گئی جس کا مقصد کشمیریوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنا اور مقبوضہ کشمیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھارت کا حصہ بنانا ہے۔ وزیراعظم مودی تکبر اور تعصب کی بدترین مثال بن کر بھارت میں چلنے والی علیحدگی پسند تحریکوں کو مزید ایندھن فراہم کر رہے ہیں اور اپنے دوست امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرح بالآخر ذلت اور رسوائی اپنے نام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے اور ظالم کو چھپنے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔

مگر اس دھند آلود عالمی فضا میں سب سے زیادہ تکلیف دہ کردار عالمی طاقتوں، بین الاقوامی برادری اور اُن طاقت کے مراکز کا ہے جو عالمی امن، انسانی حقوق، جمہوریت، بین المذاہب ہم آہنگی اور تحمل و برداشت کا پرچار کرنے اور انھیں عام کرنے کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں مگر عملی طور پر ظالم اور جابر کا ساتھ دیتے ہیں۔ مظلوم اور معصوم کی سسکیاں نہ تو ان کے کانوں تک پہنچتی ہیں اور نہ ڈھائے جانے والے وہ مظالم اُن کی تعصب بھری نگاہوں کا منظر بنتے ہیں جنھیں دیکھ کر خود انسانیت شرما جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قول اور فعل کے اس عالمی تضاد نے دُنیا میں وہ نظام فروغ دیا ہے جس میں انسانی حقوق کی پامالی، معاشی ناہمواری و بدحالی اور سماجی عدم انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے۔ دُنیا کو جمہوریت کا درس دینے والے جبر مسلط کرنے پر تلے ہوئے ہیں، عالمی امن کے دعویدار بن کر وہ دُنیا بھر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے ہیں، معاشی و معاشرتی انصاف کا پرچار کرنے والے خود انسانی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے عالمی نظام کو مضبوط بنانے میں جتے ہوئے ہیں جو اخلاقی قدروں سے عاری سرمایہ داروں کی لونڈی بن کر غریب کو غریب تر بنانے میں دن رات ایک کیے ہوئے ہے۔

موسمِ سرما کی دھند کا راج اگلے چند دنوں میں ختم ہو جائے گا تو کارِ جہاں کی رونقیں دوبارہ

بحال ہو جائیں گی مگر اہم سوال یہ ہے کہ عالمی سیاست اور بین الاقوامی معیشت کے افق پر چھائی ظلم وستم اور ناہمواریوں کی سیاہ رات کا خاتمہ کب ہوگا اور سماجی عدل وانصاف اور معاشی مساوات پر مبنی صبحِ پُرنور کب طلوع ہوگی جس کے انتظار میں صدیاں بیت چکیں؟

❑❑❑
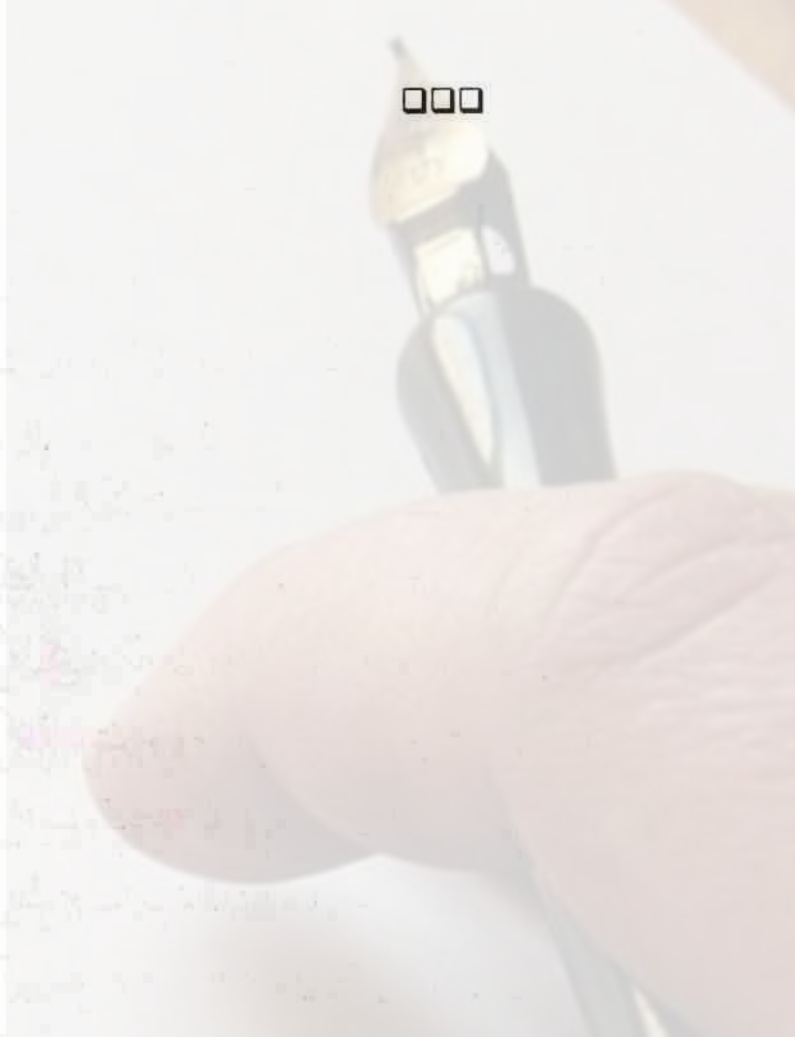
نیا سال مبارک!

کل صبح سویرے حسبِ معمول اخبارات کا مطالعہ شروع کیا تو گھر کی گھنٹی مسلسل تین بار بجی، مجھے فوراً آنے والے مہمان کا اندازہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ "جیدی میاں" ہی ہوں گے، ان کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا، سو میں بھی ملازم کے پیچھے چلتا ہوا گھر کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے جیدی میاں گرم جیکٹ اور اُونی مفلر میں ملبوس اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے اندر آنے کا کہا تو فوراً جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک بند لفافہ نکالا اور ایک خط میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ "باباجی" نے آپ کے لیے بھیجا ہے اور تاکید کی ہے کہ آپ اسے اپنے اگلے مضمون میں بغیر کسی ترمیم و اضافہ شامل کر دیں۔ مزید کہنے لگا کہ باباجی سخت سردی، دُھند اور کورونا وبا کی بڑھتی ہوئی شدت کی وجہ سے خود حاضر نہیں ہو سکے، لہٰذا نئے سال کی مبارکباد کے لیے بعد میں وہ خود تشریف لائیں گے۔ اتنی بات کر کے جیدی میاں نے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گئے۔ میں اپنے سٹڈی روم میں آ کر بیٹھ گیا اور بلا تاخیر اپنے تجسس کی تسکین کے لیے باباجی کی طرف سے بند لفافے میں بھیجا گیا' کھلا خط، پڑھنے لگا جو آپ سب کی نذر ہے...

''اسد میاں! امید ہے آپ بخیر وخوبی زندگی کے معاملات بطریقِ احسن نبھا رہے ہوں گے اور سالِ نو، 2021ء میں پورے جوش وجذبے سے مزید بڑے خوابوں کے تعاقب میں نکل پڑے ہوں گے۔ بقول اقبال ''ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں''، آپ اپنا سفر جاری رکھیں، چلتے رہیں، سمت درست رکھیں، حوصلہ نہ ہاریں، راستے کی مشکلات، کانٹوں اور پتھروں سے گھبرانے کے بجائے اُن سے نبردآزما ہونے کا سلیقہ اختیار کریں، رنج سے خوگر ہو کر اُسے مٹانے کی چارہ جوئی کریں تو تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھے فیس بک، میسنجر، وٹس ایپ اور موبائل فون پر میسجز کی صورت میں ہزاروں مہربانوں نے نئے سال کی مبارکباد کے پیغامات بھیجے ہیں مگر نجانے کیوں شاندار لفاظی، حسنِ ترتیب اور رنگارنگ جملوں کے باوجود سب پیغامات مجھے جذبات سے عاری، مروت سے محروم، اپنائیت سے خالی اور سچائی و احساس سے میلوں دور دکھائی دیتے ہیں۔ الفاظ پرائے، چناؤ کسی اور کا اور مخاطب بھی کوئی اور، لکھنے والے کا علم نہ ہی اصل مخاطب کا پتا، جانے کس نے کس کو بھیجا اور وہ موبائل فون بدلتا بدلتا، فارورڈ ہوتا ہوا، مشینی انداز میں مجھ تک آن پہنچا۔ مجھے ان میں کوئی جذبہ، احساس اور محبت محسوس نہیں ہوئی لہٰذا میں نے اُن سب پیغامات کو پڑھنا تک گوارا نہیں کیا۔ نئے سال کی آمد کی خوشی میں میرے دو پرانے یار آئے، بیٹھک میں میرے ساتھ بیٹھے، خوش گپیاں لگائیں، عہدِ شباب کے قصے بھی چھیڑے اور گلاب رُت کے سہانے سپنے بھی یاد آئے، خواہشوں کے ریلے اور یادوں کے جھمیلے میں بیتے ماضی کے کئی یادگار لمحات بھی زیرِ بحث رہے، جواں جذبوں اور گئی رُتوں کا تذکرہ ہوا تو بچھڑنے والے دوستوں کے ذکر پر آنکھوں سے ساون بھی برسا۔ یوں بچپن کے اُن دوستوں کے ساتھ تین گھنٹے پل بھر میں گزر گئے۔ اُن پیار بھری ساعتوں نے پورے سال کے لیے مجھے تروتازہ کر دیا۔

وہ چلے گئے مگر سچے جذبات سے لبریز اُن کی نیک تمنائیں اور دعائیں میرے ساتھ رہ گئیں۔ بھلا دوبدو ملاقات اور گرمئ جذبات کے مقابلے میں مصنوعی پیغامات کی کوئی حیثیت ہو سکتی

ہے؟ ہرگز نہیں! اسی لیے میں نے آج تک کسی کو کبھی ان ذرائع سے مبارکباد یا تعزیت کا کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ کوشش کرتا ہوں خود جا کر دوستوں کی خوشی، غمی میں شریک ہو جاؤں، ورنہ فون کر کے اپنے جذبات پہنچاتا ہوں اور فون نہ کر سکوں تو خط لکھتا ہوں کہ ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔''

نئے سال کے استقبال پر آتش بازی اور گولہ باری دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے خوشحالی کی ریل پیل ہونے والی ہے، عدل و انصاف کا بول بالا ہونے والا ہے، ہر چوک، چوراہے پر عدلِ جہانگیری کی زنجیر لٹکنے والی ہے، غریب، امیر کی تفریق ختم ہونے والی ہے، محروم و محکوم طبقہ دودھ اور شہد کی نہروں سے اپنی بھوک اور پیاس مٹانے والا ہے، ظلم کا خاتمہ ہونے والا ہے، ظالم اور جابر کا محاسبہ ہونے والا ہے، مظلوم اور معصوم لوگوں کی دادرسی ہونے والی ہے، باطل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کی کالی سیاہ رات کے خاتمے کی گھڑی آن پہنچی ہے، حق کی فتح کی نوید سنانے ایک صبحِ پُرنور مشرقی افق پر نمودار ہونے والی ہے اور بے بسی، بے کسی میں بُری طرح پھنسی انسانیت جرم و جہالت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والی ہے، معاشی و سماجی مساوات، عدل و انصاف اور اخوت کے سنہرے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ چور، ڈاکو اور لٹیروں کے گرد قانون کی گرفت سخت ہونے والی ہے اور وحشی درندوں سے ہمیشہ کے لیے آزادی اور چھٹکارا ملنے کی خوشخبری سنائی جانے والی ہے۔ معصوم بچوں اور ننھی کلیوں کو مسلنے والے اوباش درندوں کو قانون کے شکنجے میں جکڑنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ادارے نئے عزمِ صمیم اور ایک مربوط حکمتِ عملی کے ساتھ میدان میں کود پڑے ہیں۔ ہر طرف امن و آشتی کے گیت اور پیار محبت کے سُر سنگیت چھڑنے والے ہیں۔ ہاں! اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی نئے سال کی آمد کی خوشیوں میں شامل ہو جاتا ہوں مگر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اُسی پرانے کیل پر نیا کیلنڈر لگا دیا جائے گا اور شہرِ بے نوا میں بھوک، ننگ، غربت، مفلسی، لاقانونیت، محرومی، محکومی، ظلم اور افلاس کا راج ہوگا۔

میں یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں اور پھر نئے سال کی مبارکباد دینے کی خواہش دم توڑ جاتی ہے۔

سوشل میڈیا پر بھیجے جانے والے بلاتفریق اور اندھا دھند پیغامات کے میں اس لیے بھی خلاف ہوں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ہماری نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ہرگز مستحق نہیں۔ وہ گوالا جو دودھ میں پانی ملاتا ہے، وہ دکاندار جو ناپ تول میں ڈنڈی مارتا ہے، اشیا میں ملاوٹ کرتا ہے، گراں فروشی میں ملوث ہے، ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، وہ ڈاکٹر جو مسیحائی کے بجائے اپنی فیس کو ترجیح دیتا ہے، وہ جو عدل وانصاف کی قیمت وصول کرتا ہے، وہ استاد جو پیغمبرانہ پیشے کا حق ادا نہیں کرتا اور اسے اپنی معاشی ضروریات کی تسکین کا ذریعہ بنا رہا ہے، وہ اہلکار جو معصوم شہریوں پر ظلم اور ظالموں سے ساز باز کرے اور ملک میں قانون کے نفاذ کے بجائے لاقانونیت کو فروغ دے، وہ سیاستدان جو خدمت کے بجائے تجارت کو فوقیت دے، وہ غنی جو سخاوت کر کے احسان جتلائے، وہ سخی جو دے کر ریاکاری کرے، وہ عابد جسے اپنی عبادت پر فخر ہو، وہ عالم جو علم کو انسانیت کی فلاح کے بجائے معاشرے میں فساد، انتشار اور بگاڑ کے لیے استعمال کرے۔ کیا یہ سب بھی نئے سال پر مبارک باد کے مستحق ہیں؟

اسد میاں! 2020ء اپنے تمام مصائب اور آلام سمیت اب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو گیا۔ نئے سال کی مبارکباد اُن بیٹوں کے نام جو اپنے بوڑھے، بیمار، محتاج والدین کی خدمت کو سعادت جانتے ہیں۔ اُن بیٹیوں کے نام جو شرم و حیا کا پیکر ہیں، اُن ڈاکٹرز، نرسز اور پیرا میڈیک سٹاف کے نام جو کورونا جیسی خوفناک وبا کے باوجود دکھی انسانیت کی بےلوث خدمت پر مامور ہے اور خوش دلی سے موت بھی قبول کر لیتا ہے مگر اپنے پیشے سے وفا کرتا ہے، اُن اساتذہ کے نام جو قوم کا مستقبل سنوارنے میں اپنی ذمہ داریاں بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں۔ اُن فنکاروں، قلمکاروں، ڈراما نگاروں اور علم وادب کے آسمان پر چمکتے ستاروں کے نام جو انسانی معاشرے میں پیار محبت، سچائی، اخلاص اور حق کا پرچار کرتے ہیں، اُن عظیم والدین کے نام جنھوں نے ان سب قابلِ فخر بیٹوں اور بیٹیوں کی مثالی تربیت کی۔ اُن سب کو میری طرف سے نیا سال مبارک! آپ کا خیر اندیش، پروفیسر (ریٹائرڈ) رحمت علی المعروف بابا جی۔"

آخر میں نئے سال کے موقع پر اعتبار ساجد کا یہ شعر پیشِ خدمت ہے...

کسی کو سالِ نو کی کیا مبارکباد دی جائے
کلینڈر کے بدلنے سے مقدر کب بدلتا ہے

❑❑❑
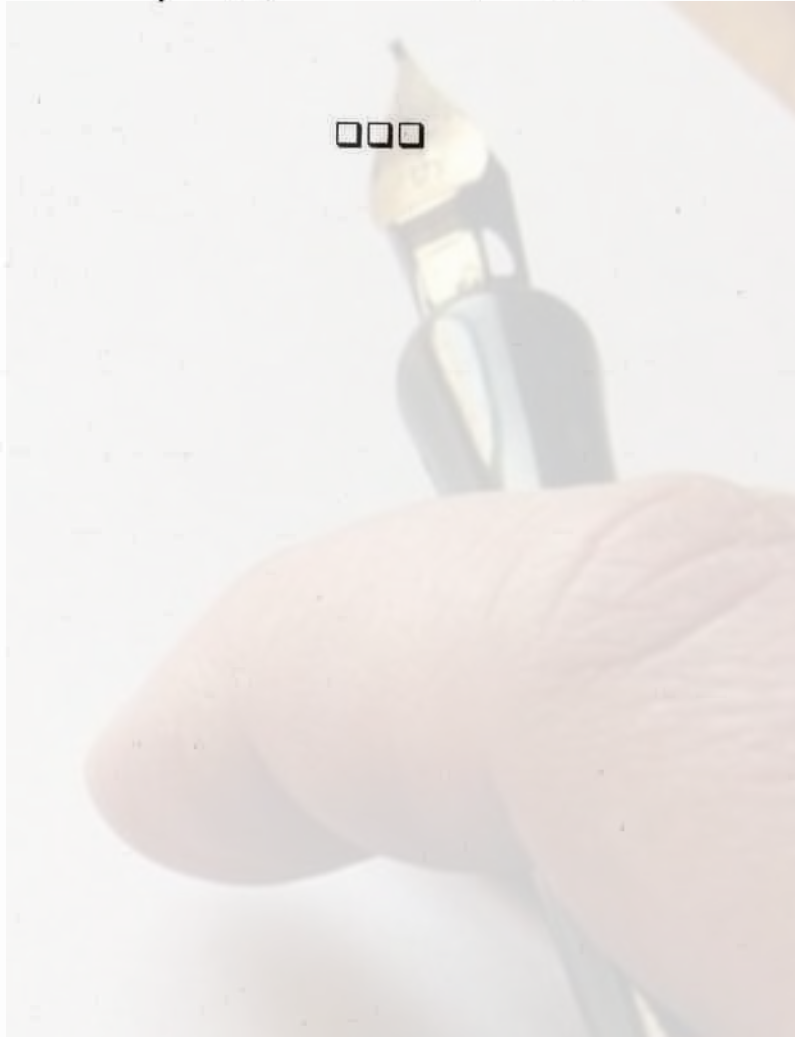
دیدۂ بینا کی جستجو

پاکستان دُنیا کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ اس کی بنیاد ہی اسلامی نظریے پر رکھی گئی اور شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے برِصغیر میں جس اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا، اس کا بنیادی نکتہ ہی دو قومی نظریہ تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ وہ مشہور نعرہ تھا جس نے دو قومی نظریے کو مزید اجاگر کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد مسلمان انتہا پسند تنگ نظر ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اکثریت کی بنیاد پر اگر حکومت کی تشکیل ہو گی تو مسلمان ایک اقلیت بن کر متعصب سوچ کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور مسلمانوں کا الگ مذہبی تشخص اور سلامتی شدید خطرے سے دو چار ہو جائے گی۔ مسلمانوں کا اپنے عقائد، عبادات اور اسلامی طرزِ زندگی کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا جس کی ایک جھلک 1937ء کی کانگریسی وزارتوں میں واضح طور پر نظر آ گئی تھی، لہٰذا ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کا سب سے نمایاں سبب اسلامی نظریہ ہی تھا۔

پاکستان کا وجود میں آ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو اللہ نے ہمیں یہ عظیم ریاست عطا فرمائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عطائے ربانی تھی۔ ہمارا

ایمان کی حد تک یقین ہے کہ جب تک یہ جہان ہے، یہ مملکتِ خداداد قائم و دائم رہے گی۔ اسلامی نظریہ اور تعلیمات اس بات کی متقاضی ہیں کہ ہمارے تمام اقوال و اعمال اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوں، اس مقصد کے حصول کے لیے قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک اسلامی تعلیمات کو آئینِ پاکستان میں بنیادی اہمیت اور حیثیت رہی ہے۔ قرار دادِ مقاصد ہو یا بعد میں آنے والے دساتیر، اسلام سب کا بنیادی ستون رہا ہے۔ پاکستان میں کوئی بھی قانون اسلام کی بنیادی روح سے متصادم نہیں بن سکتا۔ ریاستِ پاکستان اپنے شہریوں کو جدید اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیم مہیا کرنے کی پابند ہے۔ اسلامی فلاحی ریاست کا تصور بھی یہی ہے کہ تعلیمی نظام جدید اور مستقبل کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔

پاکستان کے تعلیمی نظام میں اسلامی نظریات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قومی نصاب میں طلبہ کی تعلیم و تربیت میں اسلامی پہلو اجاگر کرنے کے لیے قرآن و سنت کی تعلیمات کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بدقسمتی سے سابقہ ادوار میں طبقاتی تقسیم میں اضافہ ہوا اور تعلیمی ادارے بھی اس تقسیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ معاشرتی ناہمواری اپنے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو بھی متاثر کرتی ہے۔ پاکستان کا تعلیمی نظام بھی شدید انحطاط کا شکار ہوا جس کی وجہ سے ہر طرح کی اخلاقی اور معاشرتی بے راہ روی نے جنم لیا، سیاسی، معاشی اور سماجی ڈھانچہ اپنی بنیادیں کھوکھلی کر بیٹھا۔ تیزی سے بدلتے سماجی دھارے، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے سماج کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اخلاقی اقدار پامال ہو گئیں اور رزقِ حلال کا تصور بھی دھندلا گیا۔ ضرورت تھی اور ہے کہ الجھی ڈور کا سرا تلاش کیا جائے، اسے کیسے اور کہاں سے پکڑا جائے تاکہ درج بالا تمام مسائل کا حل ممکن ہو سکے، اس بارے میں سوچا جائے۔

موجودہ حکومت نے اس مشکل کام کو اپنے ذمے لیا ہے اور اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کے لیے واحد قومی نصاب کو پنجاب میں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا مقصد قرآن و سنت کی تعلیم، مساوی مواقع فراہم کرنا، بین الاقوامی ترجیحات کا تعین، معیاری تعلیم، ریسرچ انکوائری

پروجیکٹس اور بین الصوبائی یکجہتی ہے۔ بلاشبہ قرآنِ مجید کی لازمی تعلیم، ناظرہ اور ترجمہ وتفسیر، دراصل وزیراعظم کے پاکستان کو ریاستِ مدینہ کے سنہری اصولوں پر چلانے کے حوالے سے ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآنِ پاک تمام علوم وفنون کی تعلیمات کی روشنی کا منبع و ماخذ ہے، لہٰذا پنجاب کے تمام سرکاری و پرائیویٹ اداروں میں قرآنِ مجید کی تدریس ٹائم ٹیبل کا حصہ بن چکی ہے۔ آئین کے آرٹیکل 31 اور پنجاب حکومت کے لازمی تعلیم 2018ء کے ایکٹ کے مطابق پہلی سے پانچویں جماعت تک کے طلبہ و طالبات کے لیے ناظرہ اور چھٹی سے بارہویں کے لیے ترجمہ وتفسیر سے قرآنِ مجید پڑھنا نصاب کا لازم جزو، بطورِ مضمون نافذ ہو چکا ہے۔ اسی مضمون میں سالانہ امتحان 50 نمبر کا ہوگا جس کو پاس کرنا لازمی ہوگا۔

اس سے تعلیمی اداروں میں طہارت و پاکیزگی کا ماحول، بچوں کی ذہنی و جسمانی صحت و صفائی کی عادات، روحانی واخلاقی اقدار کی ترویج کے مقاصد کے ساتھ ساتھ انسان کی وجۂ تخلیق کا فہم بھی پیدا ہوگا۔ معاشرتی، سیاسی، سماجی، عائلی مسائل کی سمجھ بوجھ اور حقوق وفرائض کی ادائیگی کا طریقہ بھی سکھایا جائے گا، جس سے نوجوان نسل میں اسلامی احکامات کو سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوں گی۔ بلاشبہ اسلام سلامتی کا دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے، یہ قیامت تک کے لیے رہنمائی ہے لہٰذا قرآنی تعلیمات کا شغف بین الاقوامی قوتوں کے مسلمانوں کے خلاف منفی اثرات سے بچنے میں بھی معاون ہوگا۔ اخلاقی تربیت طلبہ کو منفی رویوں اور رجحانات سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اس کے نتیجے میں سطحی سوچ سے نکل کر گہرے فہم و ادراک والی نسل معاشرتی، سماجی اور معاشی وتہذیبی خلا کو پُر کرے گی۔ دراصل پاکیزہ تربیت ہی ملکی بقا وسلامتی کی ضامن ثابت ہوگی۔ وطن کی سیاسی، فکری اور نظریاتی اساس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ چند سوالات رٹ کر نمبر لینے کی دوڑ سے باہر نکل کر فکر وفلسفہ، حکمت و دانش کو ترویج دی جائے۔ اسلام اور قرآن وسنت کی تعلیمات وقت کی ضرورت بھی ہیں اور ہماری بقا کا ذریعہ بھی۔

خوش آئند پہلو یہ ہے کہ تھرڈ پارٹی مانیٹرنگ کے لیے لاہور ہائیکورٹ کی ہدایت پر پنجاب کے 36 اضلاع میں سول ججوں اور ایڈیشنل سیشن ججوں نے 100 فیصد سرکاری و نجی تعلیمی اداروں میں جا کر تصدیق کی ہے اور اس اہم اقدام کا عملی نفاذ یقینی بنایا ہے۔ اس فیصلے نے محکمہ تعلیم اور دیگر اداروں کی اہم مقصد کے حصول میں معاونت کی جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ آئے روز حکومتی سطح پر متعدد فیصلے لیے جاتے ہیں، پالیسیاں وضع کی جاتی ہیں، قوانین بنائے جاتے ہیں اور کئی اصولی فیصلے طاقت کے ایوانوں میں زیرِ بحث آتے ہیں مگر ان میں سے اکثر فائلوں کی زینت بن کر انھی صفحات میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس قرآنی تعلیمات پر مبنی اس لازمی مضمون کو تعلیمی اداروں میں صحیح معنوں میں رائج کرنے میں جس قدر سنجیدگی دکھائی جا رہی ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ یہ عمل بلاشبہ ہماری نوجوان نسل کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی پختگی میں اہم سنگِ میل ثابت ہوگا اور یہی نوجوان کل کو جب مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بطور ذمہ دار شہری اپنے حصے کی شمع روشن کریں گے تو وطنِ عزیز پاکستان میں چہار سو روشنی ہی روشنی ہو گی۔ یوں اس عملی اقدام کے سبب ہماری آنے والی نسلیں مستفیض ہوتی نظر آ رہی ہیں اور ہمارے ملک کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں نظر آنا ایک نیک شگون ہے۔

تاہم یہاں پر ایک اہم سوال جنم لیتا ہے کہ بے شک ہمارے دینِ اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات قرآنِ مجید میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے اور ہم سب کا یہ ایمانِ کامل ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہی ہماری اصل کامیابی کا راز مضمر ہے مگر آج تک اتنے اہم پہلو اور اس کے نفاذ کے لیے کیونکر عملی قدم نہیں اٹھایا گیا؟ یہ سوال بہت زیادہ اہمیت کا حامل بھی ہے اور قابلِ تشویش بھی، مگر ایسے دوررس نتائج کے حامل فیصلے لینے اور ان کو عملی حقیقت بنانے کے لیے ایک دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر ناپید ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے کلام میں اسی دیدۂ بینا کی جستجو ملتی ہے۔

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

□□□
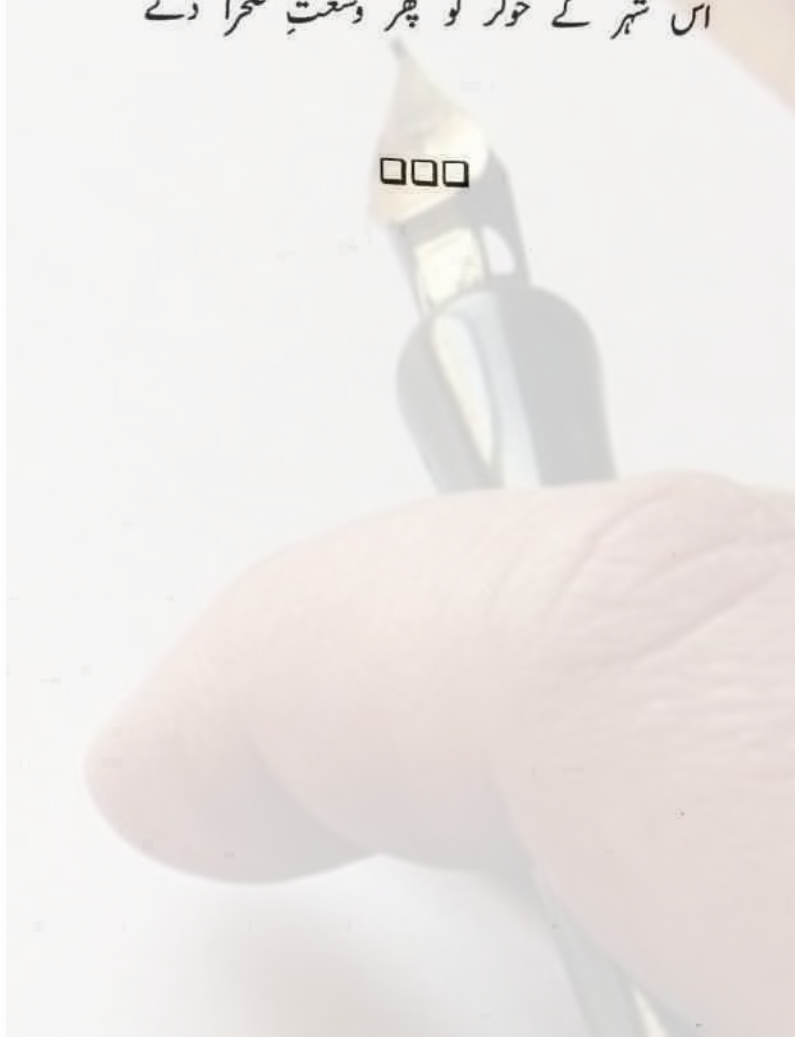
غریب الوطنی کے دکھ

ایوب خان دورِ حکومت میں منگلا ڈیم کی تعمیر کا فیصلہ ہوا اور ضلع میر پور اور جہلم کے سنگم پر اس سلسلے میں زمین کے حصول کا کام شروع ہوا۔ متاثرین کو معاوضے کے طور پر برطانوی حکومت سے کامیاب مذاکرات کر کے برطانیہ بھیجنے پر اتفاق ہو گیا اور یوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ برطانیہ منتقل ہو گئے۔ یہ ساٹھ کی دہائی کے آخری حصے کی بات ہے، پھر میر پور، جہلم، گجرات اور منڈی بہاء الدین کے علاقوں سے جوق در جوق لوگ برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، سپین، بلجیم اور ناروے کا رخ کرنے لگے اور یوں اس بارانی علاقے کے غریب اور پسماندہ لوگوں پر قسمت کی دیوی ایسے مہربان ہوئی کہ چند سالوں میں جہاں بے بسی اور بے کسی کے ڈیرے تھے، وہاں خوشحالی، امارت اور آسودگی کے بسیرے ہونے لگے۔ غیر ملکی کرنسی سے یہاں پر بڑے بڑے محلات، دلآویز رہائش گاہیں اور ڈیرے آباد ہوئے، بڑی بڑی گاڑیاں خریدیں گئیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا رواج عام ہوا۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو نے بطور وزیراعظم خلیجی ممالک کے ساتھ اپنے گہرے مراسم کو خوب استعمال کیا اور پاکستانیوں کے لیے ان ممالک میں روزگار کے بے پناہ مواقع پیدا کیے اور یوں ہزاروں

پاکستانی اُنیس سوستر کی دہائی میں سعودی عرب، ابوظہبی، دبئی اور شارجہ میں جا کر معاشی طور پر آسودہ حال ہو گئے۔ اسی طرح برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں آباد پاکستانیوں نے خوب دل لگا کر محنت کی اور زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں اپنے نام کرنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے مالی طور پر استحکام حاصل کیا گیا اور پھر وہاں کی عملی سیاست میں قدم جمائے گئے جس کے نتیجے میں آج ہمیں سینکڑوں پاکستانی ان ممالک کی مقامی کونسلز سے لے کر وہاں کی پارلیمنٹ تک نظر آتے ہیں۔ کاروباری معاملات میں بھی ان کی کامیابی قابلِ رشک ہے، اپنی مسلسل محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر انھوں نے دیارِ غیر میں بھی اپنا منفرد مقام بنایا، آج ان کی اگلی بلکہ تیسری نسل بھی جوان ہو چکی ہے اور اس نے وہاں تعلیم حاصل کر کے اپنے لیے قابلِ عزت روزگار کے اَن گنت مواقع پیدا کر لیے ہیں۔ یہ بھی اپنی کمائی میں سے ایک خطیر رقم پاکستان میں اپنے عزیز و اقارب کو سال بھر بھجواتی رہتی ہے، یوں سالانہ تارکینِ وطن پاکستانی بیس ارب ڈالر سے زائد رقم پاکستان بھجواتے ہیں اور اس طرح ہماری معیشت کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہ سب کچھ مگر سونے کی طشتری میں رکھ کر انھیں پیش نہیں کیا گیا۔ اس خوشحالی اور مالی آسودگی کے پیچھے ان غریب الوطن پاکستانیوں نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ سب سے بڑی قربانی تو اپنے وطن پاکستان سے دوری کی شکل میں دینا پڑی اور یوں اپنی جڑوں سے کٹ کر کے دیارِ غیر میں اپنے پیاروں سے دور رہنے پر مجبور ہوئے جن کو وہ آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے اوجھل نہیں کر سکتے تھے مگر رزق کی تلاش اور اپنے خوابوں کی تعبیر میں وہ ایک لمبے سفر کے مسافر ٹھہرے۔ یوں وہ اپنے بیوی، بچوں، والدین اور دوست احباب کو چھوڑ کر پردیس جا کر ایسے معاشروں میں آباد ہوئے جہاں کی زبان، تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت سے وہ بالکل نابلد تھے، پھر بھی اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے سنہرے دنوں کی تلاش میں ایسے مگن ہوئے کہ ایک نئی دُنیا آباد کر لی، مالی استحکام بھی حاصل ہوا مگر اپنوں

سے دوری کا گھاؤ انھیں مسلسل اندر سے کھاتا رہا۔ اُن کی غیر موجودگی میں بچے جوان ہو گئے، والدین ماہ وسال کے سیلِ رواں میں بہتے بہتے راہِ اجل کے مسافر بنے تو ڈالر اور پاؤنڈ کمانے والا بیٹا نہ اپنے بچوں کے بچپن میں ان کو لاڈ پیار دے سکا اور نہ ہی والدین کے آخری ایام میں ان کے ساتھ وقت گزار سکا۔ بدقسمتی سے اُن کا آخری سفر شروع ہوا تو اس کم نصیب کو جنازے کو کندھا دینے کی سعادت بھی نہ مل سکی۔ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں اور نہ ہی یہ قیمت آسانی سے ادا ہو سکتی ہے، اس کے لیے بڑے حوصلے، بے پناہ ہمت اور فقید المثال جذبۂ قربانی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ غربت اور بھوک کی مجبوری انسان سے کیا کیا کراتی ہے، یہ صرف تارکینِ وطن سمجھ سکتے ہیں اور غریب الوطنی کے دکھوں کا اندازہ بھی صرف وہی لگا سکتے ہیں۔

ان جذباتی اور نفسیاتی قربانیوں سے آگے بھی معاملات دکھ بھری داستان پر مبنی ہیں۔ عمر بھر کی کمائی بھیجنے والے اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹ گئے جب انھیں پتا چلا کہ وہ رقوم جو پاکستان میں وہ اپنے بھائیوں اور دیگر قریبی غریب رشتہ داروں کو زمین اور جائیداد خریدنے کے لیے بھجواتے رہے، وہ یہاں پر مقیم رشتہ داروں نے اپنے نام پر خرید لیے اور جب عمر کے آخری حصے میں وہ وطن واپس لوٹے یا بچوں کی شادی کے سلسلے میں اپنے دیس آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کا یہاں کچھ بھی نہیں۔ اپنے بھی پرائے ہو چکے اور ساری زندگی کی کمائی بھی لٹ چکی۔ پھر بات جان سے مارنے کی دھمکیوں تک جا پہنچی اور انھیں من گھڑت مقدمات میں ایسا الجھایا گیا کہ جان کے لالے پڑ گئے تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ نیم پاگل سے ہو کر دیارِ غیر واپس پہنچ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اپنوں کے شر سے بچ بھی جائیں تو قبضہ مافیا کے ہاتھوں اپنی عمر بھر کی کمائی سے خریدی ہوئی جائیداد گنوا بیٹھتے ہیں۔ مقدمہ بازی اور قانونی موشگافیوں میں الجھا کر انھیں ذلیل اور رسوا کیا جاتا ہے تا کہ وہ وطن واپس آنے کا آئندہ کبھی نہ سوچیں۔ یہ رسوائیوں کے دکھ بھرے سلسلے دراز بھی ہیں اور اَن گنت بھی۔

ان سب مسائل اور حوادثِ زمانہ کے باوجود ملک میں روزگار کے محدود مواقع، بدامنی، مہنگائی اور غربت سے مجبور ہزاروں پاکستانی بیرونِ ملک جا کر اپنی قسمت بدلنے کا ارادہ کرتے ہیں اور ہر سال لاکھوں پاکستانی دیارِ غیر کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لندن، پیرس، سڈنی اور نیو یارک کی چکا چوند روشنیاں، مادی ترقی اور مالی خوشحالی کے خواب نما مظاہر سے متاثر ہو کر ہزاروں پاکستانی انسانی سمگلروں کے جھانسے میں آ کر اپنی رہی سہی جائیداد اور جمع پونجی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ انھیں سبز باغ دکھا کر جعلی ویزے، غیر تسلی بخش سفری دستاویزات اور غیر قانونی راستوں سے پاکستان سے باہر بھجوانے کا لالچ دیا جاتا ہے۔ کبھی وہ کنٹینرز میں دم گھٹنے سے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں تو کہیں ان کی کشتی سمندر کی بے رحم لہروں کا شکار ہو جاتی ہے اور ان کی لاشیں تک نہیں مل پاتیں۔ کبھی یونان کا بارڈر کراس کرتے ہوئے انھیں گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے تو کبھی کسی نامعلوم مقام پر پکڑ کر انھیں سالہا سال تک جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں سے ان کے گھر والوں کو بھی کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کچھ بھلا کوئی شوق سے تھوڑی کرتا ہے؟ اس کے پیچھے ان بدقسمت غریب الوطن پاکستانیوں کی غربت، لاچارگی، بیروزگاری، مفلسی، پسماندگی اور بے کسی شامل ہوتی ہے جو انھیں اپنے حالات بدلنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو ایک روشن اور تابناک مستقبل دینے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر دیارِ غیر کے مسافر بن کر نکلتے ہیں اور اکثر یہ سفر ان کا آخری سفر ثابت ہوتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر غریب الوطنی کے دکھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو کسی بھی ایئرپورٹ پر بین الاقوامی آمد اور روانگی کے مناظر ضرور دیکھنے چاہئیں کہ کس طرح اپنے پیاروں کی آمد پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جاتی ہیں، گلے میں ہار ڈالے جاتے ہیں اور دوسری طرف جانے والوں کی روانگی پر بیوی بچے نمناک آنکھوں سے الوداع کہہ رہے ہوتے ہیں تو والدین افسردگی کی تصویر بنے خاموشی سے اس کی عافیت کی دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں۔ کورونا کی خوفناک وبا نے غریب الوطنی کے دکھوں میں سب سے بڑا دکھ یہ شامل کر دیا ہے کہ دیارِ غیر میں

مرنے والوں کا جسدِ خاکی بھی واپس نہیں آتا اور یوں وہ ہمیشہ کے لیے اپنے جان سے پیاروں سے روٹھ جاتے ہیں، سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور گہرے سے گہرے تعلقات چھوٹ جاتے ہیں۔

❑❑❑
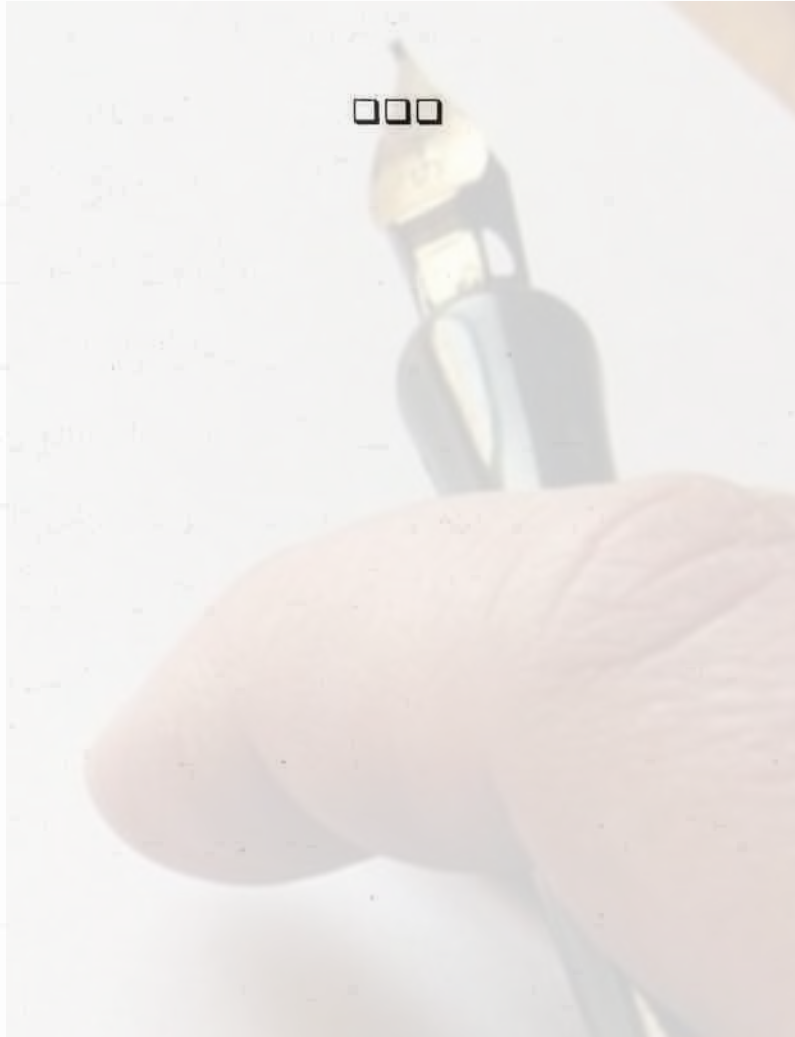
چارسُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

یہ یکم جولائی 2020ء کی ایک خوبصورت صبح تھی، ننھا عیاد گاڑی میں اپنے نانا کے ہمراہ سیر کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے نانا بشیر احمد خان سری نگر کے علاقے سوپور کے رہائشی تھے جو اپنے ننھے نواسے کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج اسے اس کی من پسند چاکلیٹ دلائیں گے، کہ اچانک بھارتی فوج کے چند اہلکاروں نے بشیر احمد خان کی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ بشیر احمد کو لگا کہ شناختی کارڈ وغیرہ طلب کریں گے اور دیکھ کر جانے دیں، للہذا انھوں نے عیاد کو گاڑی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود گاڑی سے باہر نکل آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان اہلکاروں کو شناختی کارڈ دکھا کر کوئی بات کرتے، ایک درندہ صفت بھارتی فوجی نے ان پر فائر کھول دیا۔ وہ تڑپ کر زمین پر گر پڑے اور زخمی آنکھوں سے اپنے قاتل کی سمت دیکھا جو بے رحمی سے ان کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ ہی لمحے بعد بشیر احمد خان اپنے ناکردہ جرم کی سزا پا کر موت کی آغوش میں سما چکے تھے۔ ننھا عیاد جو گاڑی میں اکیلا تھا، وہ یہ منظر دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بے یقینی سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نانا کی لاش کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے لگا کہ نانا فوجی کی ٹھاہ ٹھاہ سے گر گئے ہیں اور ابھی کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ادھر ظالم بھارتی

فوجی ننھے بچے کی ذہنی حالت سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے حس وحرکت کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ننھا عیاد آگے بڑھا اور نانا کا خون آلود چہرہ، جو سڑک سے لگا ہوا تھا اور یہاں سے بہتا ہوا خون ایک لکیر بناتا ہوا اُدھر تک پھیل چکا تھا، سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا، پھر اس کوشش میں ناکامی کے بعد وہ نانا کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔اس دوران ایک اہلکار کو تصویر بنانے کی سوجھی، اور یہ تصویر بعد میں سوشل میڈیا پر ٹاپ ٹرینڈ بن گئی۔

عیاد نے تین سال کی عمر میں اپنے نانا کو بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوتے دیکھا، بالکل اسی طرح جیسے 2015ء میں برہان مظفر وانی نے اپنے محبوب بھائی خالد حسین (جو ایم ایس کے طالب علم تھے) کو بھارتی درندہ صفت آرمی کے ظلم کا شکار ہو کر اپنی زندگی ہارتے دیکھا تو اس کا دل بھارت کے لیے نفرت کے شعلوں سے بھڑک اٹھا۔ یہ وہی بھائی تھا جس کے ہمراہ ایک سفر کے دوران انھیں چند بھارتی فوجی اہلکاروں کی طرف سے روک کر تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب برہان وانی میٹرک کا ایک ہونہار طالب علم تھا جس کی زندگی کا واحد مقصد اعلیٰ تعلیم کا حصول اور شاندار مستقبل تھا،لیکن وہ بھی ستمبر 2010ء کی ایک شام تھی جب برہان مظفر اور اس کے بھائی کو روک کر پہلے ان سے چائے لا کر دینے کا کہا گیا، کچھ دیر بعد سگریٹ کی فرمائش ہوئی اور پھر دونوں بھائیوں کو بے دردی سے تشدد کا نشانہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔اس واقعے نے برہان کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے اور اس نے اپنے علاقے میں موجود ایک مجاہد وسیم شاہ سے تعلقات بڑھا لیے اور پھر آنے والے وقتوں میں حزب المجاہدین کا کمانڈر بن کر ابھرا، جو نہ صرف تمام کشمیریوں کے دل کی آواز تھا بلکہ بھارتی فوج کے لیے خوف کی علامت بھی بن چکا تھا۔

دیکھا جائے تو محض 1989ء سے لے کر اب تک ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو بھارتی درندہ نما فوجیوں کی جانب سے ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ بھارت کی مثال اس کسان کی سی ہے جس نے نفرت کا بیج بو کر فصلوں کو خون سے سیراب کیا ہو۔اب اس زمین سے اُگنے والی فصل کا ایک دانہ بھی اس کسان کے پیٹ میں گیا تو اس کی رگوں

میں زہر بھر دے گا۔ کشمیر پر ہونے والے مظالم کی داستان ہم سنتے سناتے تھک چکے ہیں لیکن کشمیری عجیب قوم ہیں جو جرأت و ہمت کی ایسی مٹی سے گندھے ہیں کہ وہ اپنے اصولی مؤقف اور عظیم جدو جہد سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ بھارت نے درندگی اور سفا کی کا ہر حربہ آزمالیا، نوجوانوں اور بچیوں کے اغوا سے لے کر نوجوان لڑکوں سے جیلیں بھرنے تک اور پیلٹ گن سے کشمیریوں کی آنکھوں کا نور بجھانے سے لے کر، کرفیو لگا کر معصوم کشمیریوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کرنے تک وہ بربریت کی ہر حد پار کر چکا ہے لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکا کہ 1989ء کی جدو جہد میں جو تھوڑا سا خوف باقی تھا، آرمی کو سامنے پا کر والدین بچوں کو سمجھا بجھا کر الجھنے سے روک دیتے لیکن 8 جولائی 2016ء کو برہان مظفر وانی کی شہادت کے بعد سے وادی میں شروع ہونے والے احتجاج نے ایک عجیب رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اب کشمیریوں کے دل سے موت اور آنکھوں سے دشمن کا خوف ختم ہو چکا ہے۔ کشمیر کا چہرہ خون سے دھو کر مودی سرکار یہ بھولے بیٹھی ہے کہ ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ظلم وستم سے کسی قوم کی نسل کشی کی جاسکتی ہے مگر نظریہ کا خاتمہ ممکن نہیں۔ بشیر احمد خان سمیت زندگی سے محروم کیے جانے والے لاکھوں کشمیریوں کی نسلیں جب جوانی اور شعور کی حدود میں داخل ہوں گی تو ان کی نفسیات موجودہ کشمیری نسل سے کئی ہزار گنا زیادہ شدت سے آزادی کی طلب سے لبریز ہو گی اور یہ ایک بپھرے ہوئے دریا کی طرح بھارت کے باوردی بھیڑیوں کو اپنی موجوں کے ساتھ بہا لے جائے گی۔ عنقریب بھارت اپنی سفاکانہ پالیسیوں کی بدولت کشمیر سمیت دو درجن سے زائد چلنے والی علیحدگی پسند تحریکوں کے ذریعے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔

میں مضمون لکھتے لکھتے اپنے بوجھل دل کی مضطرب دھڑکنوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا کہ پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی آن پہنچے اور آتے ہی جیدی میاں کو چپ چاپ بیٹھنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر میری آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کہنے لگے، مجھے پتہ ہے تم یومِ کشمیر کے حوالے سے مضمون لکھ رہے ہو۔ پھر اپنی درد بھری آواز میں نوجوان شاعر حسن افضال صدیقی کی

یہ خوبصورت نظم باترنم سنانے لگے جو کشمیریوں کے دلوں کی آواز بھی ہے اور کشمیر کا نوحہ بھی۔ مجھ میں مزید لکھنے کی ہمت نہیں رہی، نظم پیشِ خدمت ہے...

ارضِ کشمیر پر ظلم کی انتہا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

روز شب ظلم، شام و سحر ظلم ہے
بچوں، بوڑھوں، خواتین پر ظلم ہے
لفظ محدود ہیں، اس قدر ظلم ہے
قاتلوں کے مقابل ہے صبر و رضا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

وردی پہنے درندوں کی ہیں ٹولیاں
حسبِ معمول ہیں خون کی ہولیاں
جسم چھلنی، برستی ہوئی گولیاں
گود اجڑی، ویران ہیں جھولیاں
ابنِ قاسم کو دیتی ہیں بہنیں صدا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

بھارتی بربریت ستائے ہوئے
غاصبانہ تسلط جمائے ہوئے
پوری وادی کو مقتل بنائے ہوئے
نوجوانوں کی لاشیں گرائے ہوئے
چشم پوشی ہے اک مجرمانہ خطا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

مائیں جنتی ہیں بیٹے کفن کے لیے
وار دی نسل ساری وطن کے لیے
خون حاضر بہارِ چمن کے لیے
گردنیں سر ہیں دار و رسن کے لیے
ظالموں تم پہ ٹوٹے گا قہرِ خدا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

مولا کشمیر بھارت سے آزاد کر
یہ بہشتِ زمیں پھر سے آباد کر
اپنے مظلوم بندوں کی امداد کر
ٹوٹے زنجیرِ صیاد برباد کر
چشمِ پُرنم ہے افضال کی ہے دعا
چار سُو شامِ غم، کُو بہ کُو کربلا

□□□

تلاش

اس عالمِ آب وگل میں ہر فرد کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بھوکا کھانے کی تلاش میں ہے تو مریض صحت کے لیے بےچین ہے، قیدی رہائی کا متلاشی ہے تو پولیس والا اشتہاری کی کھوج میں سرگرداں ہے، بچھڑنے والے کی تلاش میں شہر شہر، گاؤں گاؤں، گلی گلی منادی کی جارہی ہے تو بچھڑنے والا اپنوں کی تلاش میں بےقرار تڑپ رہا ہے۔ مزدور کام کی تلاش میں ہے تو آجر مزدور ڈھونڈتا پھرتا ہے، محتاج سخی کی کھوج میں ہے تو غنی مستحق لوگوں کی تلاش میں ہے۔ بھٹکے ہوئے راستہ ڈھونڈ رہے ہیں تو راستے کے مسافر اپنی منزل کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں، طالب علم اچھے استاد ڈھونڈنے نکلے ہیں تو اساتذہ باادب اور سلجھے ہوئے شاگرد ڈھونڈ رہے ہیں۔ محبت والے محبوب کی کھوج میں ہیں تو چاہے جانے کی لذت سے عاری اپنے محب کے متلاشی ہیں۔ اہلِ نظر فیض بانٹنے کے لیے خوش نصیب اہلِ دل ڈھونڈ رہے ہیں تو روحانیت کی منزل کے مسافر کسی اہلِ نظر کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ قسمت کے مارے بدنصیب اچھے دنوں کی تلاش میں ہیں تو خزاں رُت میں اداس پنچھی آمدِ بہار کے منتظر ہیں۔ یہ تلاش ایک سفر ہی تو ہے اور سب انسان اس سفر پہ نکلے ہوئے ہیں، راستے مختلف، منزلیں جدا جدا، رختِ سفر اپنا اپنا مگر تلاش ہے کہ ہمہ وقت

جاری و ساری ہے۔ ٹھٹھرتی سخت سردی میں ننگے کانپتے بے کس لوگوں کو تن ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کی تلاش ہے تو بے نوا سڑک کنارے کھلے آسمان کے نیچے سونے والوں کو جھونپڑی کی طلب ہے۔ جھونپڑی والے کسی پکی چھت کے متمنی ہیں تو چھوٹے گھر والے بڑے گھر کی آرزو اپنے دل میں بسائے بیٹھے ہیں۔ سنگل سٹوری والا ڈبل کرنے کی آس لگائے بیٹھا ہے تو پرانے شہر میں آباد شخص نئے شہر کی گیٹڈ کمیونٹی کا حصہ بننے کے لیے بے تاب ہے۔ پیدل چلتا ہوا سائیکل والے پہ رشک کر رہا ہے تو سائیکل والا موٹر سائیکل والے کو اپنا ہیرو سمجھتا ہے۔ موٹر سائیکل والا اب کار والے سے مرعوب نظر آتا ہے۔ چھوٹی کار والا ماڈل تبدیل کرنے کے چکر میں ہے اور بڑی کاروں والے بے چارے ذاتی جہاز والوں سے چھپ کر بیٹھے اپنی نیندیں حرام کر رہے ہیں۔ جہاز والے دولت اور طاقت ہونے کے باوجود عزت ڈھونڈ رہے ہیں، عزت مل گئی ہے تو شہرت کی تلاش شروع ہو چکی ہے اور سب کچھ مل گیا ہے تو سکون کی تلاش جاری ہے جو یکسر ناپید ہے۔

مادہ پرستی، لوٹ کھسوٹ اور مالی پریشانیوں میں الجھے والدین کو ان کے بچے ڈھونڈ رہے ہیں جن کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں اور وہ والدین اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو گھر میں رہتے ہوئے بھی موبائل اور لیپ ٹاپ سکرین کے ساتھ ہمہ وقت چمٹے رہتے ہیں۔ چند ساعتیں بھی اپنے والدین کے پاس بیٹھ کر نہیں گزار سکتے۔ بھائی بھائی کو ڈھونڈتا پھرتا ہے تو بیٹی ماں کی تلاش میں ہے، بیٹا اپنے باپ کا شانہ ڈھونڈ رہا ہے جہاں وہ سر رکھ کر اپنے لاڈ پیار کا اظہار کرے تو تھکا ہارا باپ دن بھر کی محنت مشقت سے نڈھال گھر آ کر اپنے بچوں کی تلاش میں ہے جو اس کے کاندھے دبائیں اور اس کی تھکاوٹ اتارنے کا سبب بن جائیں۔ جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے پریشان ماں کو خدا خوفی سے سرشار ایسے بیٹے کے والدین درکار ہیں جو دو جوڑوں میں لپیٹ کر اسے بیاہ لے جائیں اور ساری عمر اسے اپنے گھر میں پلکوں پر بٹھا کر آسودہ زندگی کی ضمانت دیں۔ دوسری طرف وہی ماں اپنے بیٹے کے لیے حُسن کی دیوی ڈھونڈ رہی ہے جس کے آسودہ حال والدین اپنی بیٹی کو دو کنال کا گھر، بڑی گاڑی، نقدی، زیورات کے علاوہ بینک بیلنس

سے بھی مالا مال کر دیں۔ تلاش جاری ہے ابھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ رشتے ناتے اب مالی آسودگی کے ساتھ مشروط ہو گئے ہیں، محبت، اخلاص اور سچائی کے لیے تلاشِ گمشدہ کے اشتہار جگہ جگہ لگے نظر آتے ہیں مگر یہ سب ناپید ہو گئے، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

اخبارات کے مطالعے میں کسی ایسی شہ سرخی کی تلاش ہے جس میں امید ہو، خیر ہو، خوشحالی کی نوید ہو یا پاکستان کے روشن مستقبل کی پیش بندی کی خبر ہو، سو سے زائد ٹیلی وژن چینلز کی کسی ایسی ہیڈ لائن یا بریکنگ نیوز کی تلاش میں ہیں جس میں سنسنی نہ ہو، خوف یا موت کا ذکر نہ ہو، حادثہ نہ ہو، لاشیں نہ ہوں۔ کوئی ایسا ٹاک شو جس میں شریکِ گفتگو مہمانوں کی دھلائی نہ کی جا رہی ہو، کوئی پروگرام جو گھر میں بچوں کے ساتھ انجوائے کیا جا سکے یا ایسا اشتہار جس میں کسی دوشیزہ کو ڈریم گرل نہ بنا کر دکھایا گیا ہو، تلاش جاری ہے مگر کامیابی نظر نہیں آتی۔

دورانِ سفر سڑک پر اس ٹرک ڈرائیور کی تلاش ہے جس سے اس کے صنم نے وفا کی ہو یا پھر اس صنم بے وفا کی، جس کے غم میں وہ شاعر بن گیا اور جس کا اظہار وہ ٹرک کے عقب میں انتہائی کرب ناک شاعری میں کرتا ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے اس کے اشعار محض قافیہ ردیف کے ملاپ تک محدود ہوتے ہیں، اوزان ایسے کہ اوسان خطا کر دیتے ہیں مگر اس مظلوم ٹرک ڈرائیور کے ساتھ جو محبت کے نام پر کھلواڑ ہوتا ہے اس کا تذکرہ بدرجہ اتم ملتا ہے۔ ''اگر دُنیا میں ہوتی تو ملتی وفا'' بہت اعلیٰ مصرع ہے۔ اسی طرح کا یہ شعر اس کی زندگی کے سفر کا عکاس ہے...

دیکھ استاد قسمت کا چکر
صبح کراچی، شام سکھر

یہی حال رکشہ ڈرائیور کا ہے۔ اکثر رکشوں کے پیچھے درج عبارتیں اور اشعار زندگی سے گلے شکوے کا بے لاگ اظہار ہیں اور یہ شعر تو تخلیقی کمال کا مظہر ہے...

جس نے ماں کو ستایا
اس نے رکشہ ہی چلایا

مگر اس سے کہیں زیادہ پختہ ادب ہمیں بسوں کے پیچھے درج عبارات میں ملتا ہے اور میں ایک مدّت سے اس ادیب کی تلاش میں ہوں جس سے میں نے اردو ادب میں تمثیل نگاری، تشبیہ اور استعارے کا استعمال سیکھا مگر مجھے وہ تخلیقی فنکار آج تک مل نہیں سکا۔ ہر بس وقت کے ہاتھوں کئی بار ''دلہن'' بنتی ہے، زمین پر چلنے کے باوجود وہ طیارے کے نام سے منسوب ہوتی ہے اور ڈرائیور والا دروازہ ''پائلٹ گیٹ'' کا نام پاتا ہے۔ یہ سب اردو ادب کی گراں قدر خدمات ہیں جن کا برملا اعتراف کرنا لازم ہے۔

میں مضمون کی آخری سطور لکھ رہا تھا کہ اچانک پروفیسر رحمت علی المعروف ''بابا جی'' اور اُن کے ہونہار شاگرد ''جیدی میاں'' پہنچ گئے۔ استفسار پر میں نے مضمون کا عنوان بتایا تو بابا جی کے پرنُور چہرے پر جلال کے آثار نمایاں ہوئے اور گرج دار لہجے میں مخاطب ہوئے، ''اسد میاں! میں ایسے تونگر اور سخی کی تلاش میں ہوں جس کی سخاوت نے اسے تنگ دست کر دیا ہو یا ایسا عاجز شخص مل سکے جس کی عاجزی نے اسے اللہ اور اس کی مخلوق کے سامنے بےتوقیر کیا ہو۔ میں اس شخص کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں جس نے سچے دل سے توبہ کی ہو، رات کے پچھلے پہر میں اٹھ کر اللہ کے حضور سجدوں میں سر جھکایا ہو اور اپنی جبینِ نیاز سے اس کی واحدانیت کا برملا اقرار کیا ہو تو اس کی دعا رد کی گئی ہو۔ مجھے آج تک وہ فرمانبردار بیٹا نہیں مل سکا جس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کی ہو اور تابع فرمانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہو اور پھر اس کی اپنی اولاد نے اس سے پیار نہ کیا ہو۔ وہ خوش نصیب شخص نہیں ملا جس نے اپنی اولاد پر حرام کا لقمہ حرام قرار دیا ہو اور وہ بخت آور نہ ہوئے ہوں۔'' بابا جی کا چہرہ لال ہو چکا تھا اور ان کی آواز رِندگئی۔ جیدی میاں کی آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ میں نے پوچھا تو جیدی میاں نے کمال کا جملہ بولا اور میں لاجواب ہو گیا۔ کہنے لگا ''یہ

اشکِ ندامت ہیں اور اقرار ہیں اس کوتاہی کا کہ میں بابا جی کی شاگردی اور محبت کے باوجود علم و دانش کے سمندر سے عقل و حکمت کے وہ موتی تلاش نہیں کر سکا جو ہمارے لیے سرمایہ حیات سے کم نہیں۔'' علامہ اقبال کے یہ دو اشعار اس المیے کی خوب وضاحت کرتے ہیں...

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

❑❑❑

چلتے رہنا شرط ہے

پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہے اور یہاں شروع سے ہی قومی اور ملی تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیمی نظام متعارف کروایا گیا اور سرکاری و نجی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقوام کی ترقی کا انحصار تعلیم و ترقی سے وابستہ ہے۔ مطالعہ و مشاہدہ اس امر کا غماز ہے کہ گزشتہ ادوار میں بھی تعلیمی اداروں کا قیام، نصاب سازی اور اساتذہ کی تربیت اولین ترجیح رہی ہے اور 1970ء سے 2017ء تک سات تعلیمی پالیسیاں متعارف کرائی جا چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور یہ بات ہم شروع سے ہی سنتے چلے آرہے ہیں۔ اگرچہ انسان اور حیوان میں کچھ جبلتیں مشترک ہیں مگر انسان کو ایک چیز دوسروں سے ممتاز بناتی ہے اور وہ شعور، عقل و دانش اور علم و ہنر اور اس کی فہم و فراست ہے۔ یعنی جاننا ضروری ہے کہ کیا سیکھنے سے انسان مہذب کہلائے گا اور سیکھنے سکھانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ جہاں تک سیکھنے سکھانے کی بات ہے تو بچہ پیدائش سے پہلے رحمِ مادر میں ہی سمجھ بوجھ اور احساسات رکھتا ہے، آوازوں کی پہچان کرسکتا ہے، ماں باپ کی آوازوں کی الگ پہچان رکھتا ہے۔ گویا والدین اور ماحول بچے کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بچے کے پہلے ہزار دن

بہت اہم ہوتے ہیں۔ یہ پیدائش سے لے کر تقریباً تین سال بنتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے جب بچے کی فطرت تشکیل پا رہی ہوتی ہے۔ پانچ سال تک بچہ بول چال اور رشتوں کی پہچان کرنا سیکھتا ہے اور وہ تقریباً دو ہزار سے تئیس سو الفاظ کو سمجھ اور بول سکتا ہے۔ یہاں یہ بات تو ظاہر ہے کہ بچے کے سیکھنے کا عمل گھر میں والدین اور خاندان سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح تعلیم وتدریس کی ذمہ داری پوری دنیا میں انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ہر ریاست کا بنیادی فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو تعلیم کی سہولت مہیا کرے اور ہر تعلیمی پالیسی کے مقاصد کا تعین کرتے وقت قومی ترجیحات اور بین الاقوامی تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے، اس کی ضرورت و اہمیت کے ساتھ ساتھ قومی یا بین الاقوامی معاشرے پر اس کے اثرات کیا ہوں گے، اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اس کی افادیت، موجودہ پیچیدہ معاشرتی رویوں کی درستی میں کس قدر کردار ادا کر سکے گی، اس کا فریم ورک کن بنیادوں پر بنایا گیا ہے، کیا اس میں اتنی سکت ہے کہ ساری خرابی کو نئی سمت اور ہمہ جہت تعلیم وتربیت کے رہنما اصول مہیا کر سکے؟

یہ جان کر بہت اطمینان ہوا کہ ہمارے پالیسی ساز ادارے اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ خرابی کہاں ہے، سرا کہاں سے پکڑنا ہے؟ دراصل تعلیم ہی تبدیلی کا اصل ذریعہ اور بنیاد ہے۔ طلبہ کو درست سمت پر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری قوم کو ایک راستہ، سمت اور جہت دی جائے۔ مقاصد بہت اعلیٰ ہیں لیکن گزشتہ چار دہائیوں کے دوران دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان کو سمجھنے، پرکھنے کی صلاحیت ہمارے معاشرے نے پیدا نہیں کی اور اس امر کی پروا بھی نہیں کی کہ ہمارے اردگرد جو حالات و واقعات رونما ہو رہے ہیں، ہم ان سے مسلسل متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارا چھوٹا سا عمل کس ردِعمل کا پیش خیمہ ہوگا۔ قارئین کی دلچسپی اور اس نہایت اہم اور حساس قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے لازم ہے کہ ہم اس پر قومی ہم آہنگی کے لیے اٹھائے گئے اہم اقدام میں پنجاب حکومت کی مدد کریں۔ اس کی تفصیل میں جا کر اہلِ نظر، اہلِ بصیرت ماہرینِ تعلیم اور سٹیک ہولڈرز مختلف فورم پر سیمینار منعقد کریں تا کہ اس کی خامیوں کی

درستی ہو سکے۔ تمام متعلقہ اداروں اور سٹیک ہولڈرز کی قبولیت دل و جان سے یقینی بنائی جائے۔ یہی وقت ہے کیونکہ ابتدائی مرحلے میں نرسری سے پانچویں تک کا یکساں نصاب متعارف کروایا جا چکا ہے جو موجودہ تعلیمی سال سے لاگو ہو چکا ہے۔ نئے نصاب کے مطابق پرائمری جماعت تک کی کتب کسی حد تک ابتدائی نوعیت کی ہیں، امتحانی شیڈول اور ضروری گائیڈ لائنز مہیا کی جا چکی ہیں۔ اساتذہ کی تربیت اور نصابی سکیم بھی دی جا چکی ہے اور پنجاب کے سرکاری سکولوں پر لاگو ہو چکی ہے۔ اہم بات نجی اور بین الاقوامی نصاب پر چلنے والے سکولوں کی ہے جس پر انواع و اقسام کی بولیاں سننے کو ملی ہیں۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کا نصاب ہے جو ہر مکتبِ فکر نے مسلکی انداز سے مرتب کیا ہے۔ کیا اس طرح کے نظامِ تعلیم اور نصاب کو یکسانیت کے راستے پر ڈالنا ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ فیصلہ نہیں؟ تاہم ملی یکجہتی اور یگانگت کے لیے ایک یکساں نظامِ تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ درحقیقت ہمیں تبدیلی کی ضرورت ہے اور تبدیلی ہمیشہ اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ ہم اپنے اپنے معمولات میں سہولت اور آسانی محسوس کرتے ہیں اور خود کو بدلنے پر تیار نہیں، حالانکہ تبدیلی چیلنج ہوتی ہے۔ نیا رستہ، نئے فکر کے انداز، تحقیق، جستجو اور درپیش مشکلات ہمیں روکتی ہیں۔

تمام بچوں کو مساوی تعلیمی موقع مہیا کرنا، معاشرتی تنظیم، قومی ہم آہنگی اور سماجی یکجہتی کو ملحوظِ خاطر رکھنا، مختلف مکاتبِ فکر کی سوچوں کو ایک قومی دھارے میں لا کر تعلیم میں عدم تفاوت کی بنیاد رکھنا، معاشرہ کے تمام طبقوں کی مساوی ترقی، تعلیم میں معیار، بچوں کی قومی اور بین الاقوامی امنگوں کے رجحانات کی روشنی میں ہمہ جہت نشوونما کو یقینی بنانا ہماری قومی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔ اگر ہم مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہی ہمارے اندر اندرونی اور بیرونی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیتیں بیدار ہو سکیں گی۔

دنیا تعلیمی نظام کی بین الاقوامی افادیت کو لے کر چل رہی ہے مگر وطنِ عزیز میں معاملہ اس کے الٹ ہے۔ موجودہ زمانہ نمبروں کی دوڑ سے آگے کا زمانہ ہے۔ یہ سکلز اور گلوبل سٹیزن شپ کا

زمانہ ہے۔ آج کا طالب علم انٹرنیشنل کمیونٹی کا ممبر ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل، اس کی مہارتیں، خواہشات اور اس کی ضرورتیں بھی انٹرنیشنل بن چکی ہیں۔ ہمیں اس چیز کا ادراک نہیں۔ آج جو بچے تیسری جماعت کے طالب علم ہیں آئندہ برسوں میں کس طرح کی دنیا میں جی رہے ہوں گے؟ اکثریت کو اس کا تصور بھی نہیں کہ اگر یہی فرسودہ، گلاسڑا بے جان اور اقدار سے خالی نظام مختلف اندازِ فکر وعمل اور نظریات میں بٹا رہا تو قوموں کی برادری میں ہمیں اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

تعلیمی انحطاط کا تو ہم پہلے سے ہی شکار ہیں اور یونیسف کے اعداد وشمار کے مطابق ترقی پذیر ممالک کے بچے یا تو اپنی تعلیمی مدت پوری نہیں کر پاتے اور تعلیمی سفر مکمل کیے بغیر تعلیمی نظام سے باہر ہو جاتے ہیں اور اگر تعلیمی سال پورے کرتے ہیں تو بھی معیار انتہائی پست ہوتا ہے۔ دنیا دو انتہاؤں میں بٹ چکی ہے۔ ترقی یافتہ اور جدید دنیا اپنے رویوں میں توازن اور قومی یکجہتی کے سنہری اصولوں کے باعث دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کر رہی ہے۔ دوسری طرف ترقی پذیر ممالک ہیں، جہاں بچوں کی ایک کثیر تعداد سکولوں سے باہر ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں لگ بھگ دو کروڑ بچے سکول سے باہر ہیں۔ یکساں نصابِ تعلیم ترقی کے بھی مساوی مواقع مہیا کرے گا جس سے مختلف مکاتبِ فکر اور سوچ رکھنے والے افراد اور گروہوں کو گروہی، علاقائی، رنگ ونسل، سیاسی اور مذہبی نظریات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی نوجوان نسل کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیم سے آراستہ کرنے میں مدد ملے گی تاکہ وہ اپنے خاندان اور ملک وملت کے لیے مفید شہری ثابت ہوں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سائنسی علوم میں تحقیق وجستجو کو فوقیت دی جائے اور مستقبل کی ضروریات اور ترجیحات کا از سرِ نو تعین کیا جائے۔ بچوں کو تنقیدی انداز سے سوچنے اور فیصلے لینے کی تربیت اور اجازت دی جائے۔ دیوار سے اس پار کیا ہے، اسے جاننے کی صلاحیت اجاگر کی جائے۔ یکساں قومی نصاب اسی منزل کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ گویا سفر کی ابتدا ہو چکی ہے، کام تو شروع ہوا، مسئلے کا احساس تو ہوا۔ بات چل نکلی ہے تو کامیابی بھی ضرور ہوگی۔ چین کے بانی رہنما ماؤزے

تنگ نے کہا تھا کہ ایک ہزار میل پر مشتمل دوڑ بھی پہلے قدم سے شروع ہوتی ہے۔ کسی بھی منزل کی طرف بڑھنے والا پہلا قدم جب اٹھالیا جائے تو رفتہ رفتہ سفر کٹ ہی جاتا ہے اور نشانِ منزل واضح ہونے لگتے ہیں، چلتے رہنا شرط ہے۔

❑❑❑
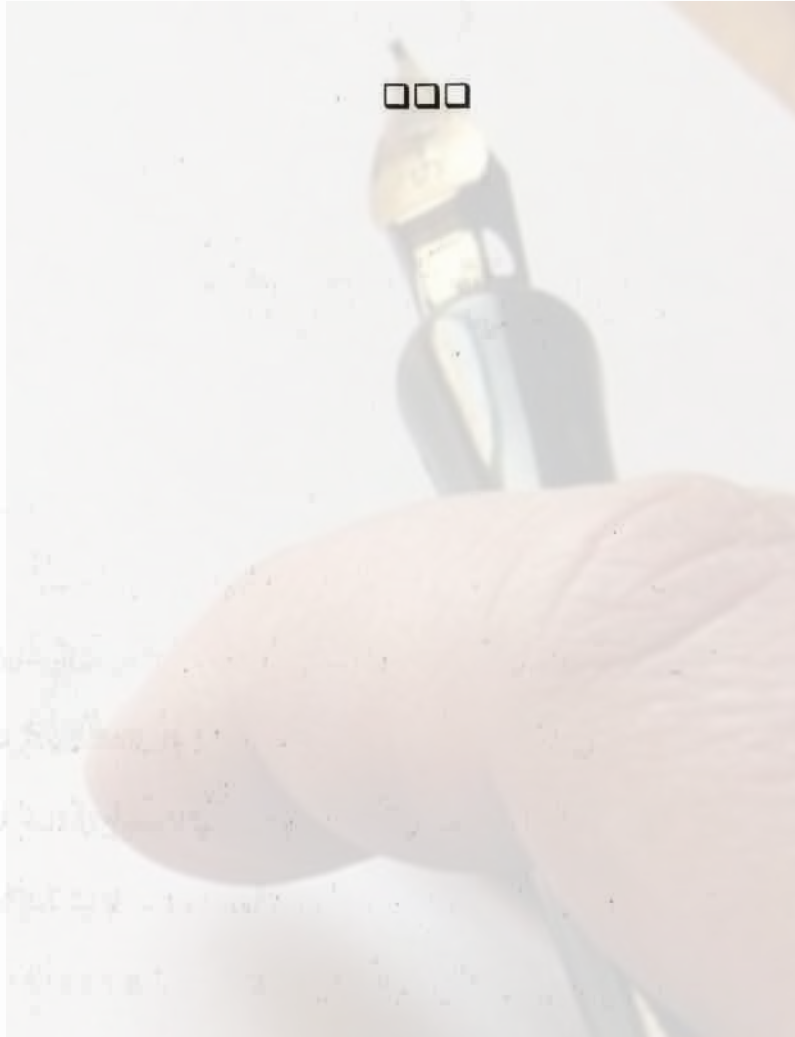
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا

آلِ رسول اور اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم کی نسبت اُن کے خون میں شامل ہوئی اور سادات گھرانے میں آنکھ کھولی۔ گھر والوں نے حیدرِ کرار، فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامِ نامی سے نسبت جوڑی تو وہی شجاعت، وجاہت اور ہیبت گھٹی میں شامل ہوگئی۔ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کربلا میں دی جانے والی عظیم قربانی اور باطل کے جبر و استبداد کے سامنے کلمۂ حق پر صبر و رضا کے ساتھ ڈٹ جانے کی خُو اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا۔ یہی لازوال میراث 92 سال تک اس مردِ قلندر کی عظمتِ کردار کی گواہی دیتی رہی اور اس عظیم کشمیری سیاسی رہنما کی متاعِ حیات ٹھہری جسے دُنیا بھر کے لوگ سید علی شاہ گیلانی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ چند روز قبل، یکم ستمبر کو بھارتی جارحیت اور ظلم و ستم کے خلاف لڑتے لڑتے بالآخر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اپنے عظمتِ کردار اور علم و فضل کے خزانے سمیت منوں مٹی تلے جا سوئے۔

29 ستمبر 1929ء کو مقبوضہ کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ کے قصبے سوپور کے ایک گاؤں ڈورہ میں

پیدا ہونے والے اس مردِ مجاہد نے اپنی ابتدائی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی اور عملی سیاست کا آغاز کر دیا۔ کشمیریوں کے حقوق کی آواز بلند کی، تقسیمِ ہند کے وقت کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کی جانب سے عیاری، مکاری اور چالاکی پر مبنی بھارت کے ساتھ ہونے والے الحاق کو مسترد کیا اور اقوامِ متحدہ کی قرارداد کی روشنی میں کشمیریوں کے لیے حقِ خود ارادیت کا مطالبہ بانگِ دہل دہرانا شروع کیا تو بھارت سرکار نے 1962ء میں دس سال کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا۔ قید و بند میں ان پر مظالم کی انتہا کر دی گئی تا کہ اس مردِ حُر کے جوش و جذبے کو ٹھنڈا کیا جا سکے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

جیل سے رہائی کے بعد سید علی گیلانی کے جوشِ خطابت میں روانی بڑھ گئی۔ الفاظ کے چناؤ میں مزید نکھار آ گیا اور لہجے میں ترشی اور کاٹ کا عنصر نمایاں ہوا تو اُن کی مقبولیت میں بھی گراں قدر اضافہ ہونے لگا۔ اپنے آبائی حلقے سوپور سے وہ تین بار منتخب ہو کر مقبوضہ وادی کی پارلیمنٹ میں اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے رہے اور بھارتی حکومت کو نہ صرف اقوامِ متحدہ کے ساتھ کیے گئے وعدے یاد دلاتے رہے بلکہ انھیں کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کو تسلیم کرنے اور استصوابِ رائے کا مطالبہ دہراتے بھی نظر آئے۔ وہ لگ بھگ پانچ دہائیوں تک کشمیر کی سیاست پر چھائے رہے اور 1993ء میں مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر مبنی آل پارٹیز حریت کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو جلد ہی اُس کے سربراہ منتخب ہو گئے۔ یہ ذمہ داری انھوں نے گزشتہ سال جون تک بطریقِ احسن ایسی نبھائی کہ اپنے جوشِ خطابت اور علم و فضل کی طاقت سے ہمیشہ بھارت سرکار کے لیے خوف کا استعارہ بنے رہے۔ وہ حکومتی جارحیت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے رہے اور ہمیشہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اُن کا نام کشمیریوں کی مزاحمت کی علامت بن گیا اور اُن کی تقریریں اور تحریریں کشمیری نوجوانوں کو بھارتی مظالم کے خلاف لشکرِ حسین رضی اللہ عنہ کی بے باکی اور حریت پر مائل کرتی رہیں۔ گیلانی صاحب تنِ تنہا کشمیریوں کی آواز بن کر اُن کے حقوق کی جنگ لڑتے رہے

اور بھارتی مظالم، کرفیو اور قید و بند کی اندھیری راتوں سے گھبرانے کے بجائے ہمیشہ امید و آرزو کے چراغ جلاتے رہے۔ جب کشمیریوں کی ساری قیادت حوصلہ ہار جاتی، وہ تب بھی نئے جذبے، نئی امنگ اور ترنگ کے ساتھ کشمیری نوجوانوں کو پکارتے اور اپنے جوشِ خطابت سے اُن کے لہو گرماتے نظر آتے تھے۔ اُن کی آواز کی گونج وادیٔ کشمیر کے دونوں اطراف میں سنائی دیتی اور اس کی بازگشت دہلی کے طاقت کے ایوانوں کو لرزا دیتی۔

گیلانی صاحب عمر بھر پاکستان سے جرمِ عشق میں مبتلا رہے اور اسے کمال مہارت، متانت اور سچائی کے ساتھ اوجِ ثریا کی بلندیوں تک پہنچایا۔ کارزارِ سیاست سے عشق کیا تو کشمیر دشمنوں کے لیے خوف کی علامت بن گئے اور کشمیریوں کے سب سے محبوب اور مقبول لیڈر کے طور پر تادمِ حیات چھائے رہے۔ حق گوئی، راست بازی اور اصولوں پر مبنی اُن کی سیاسی جدوجہد سیاہ فام افریقی رہنما نیلسن منڈیلا کی چھبیس سالہ قید و بند سے بھی زیادہ مشکلات اور آزمائشوں سے بھرپور رہی مگر وہ ظالم بھارتی درندوں کے سامنے علمِ حسینؓ تھامے سینہ سپر رہے اور جرأت و بہادری کی فقید المثال داستان رقم کرتے رہے۔

سیاست کے بعد انھیں علم و آگہی سے گہرا شغف تھا، اور تمام عمر فکری ریاضت میں مشغول رہے۔ انھیں قرآنِ مجید، تاریخِ اسلام، سیاسی تاریخ، اردو زبان اور فارسی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ گفتگو میں روانی اور الفاظ کے ساتھ جادو جگانے کا فن بھی ان کے گہرے مطالعے اور فکری تحقیق کا عملی مظہر تھا۔ انھوں نے ساری زندگی کلامِ اقبال کو اپنی فکری پختگی اور خطابت کی طاقت کے لیے بطورِ ہتھیار استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی زبان میں تین شعری مجموعوں کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں کتب تصنیف کیں جن میں ایامِ اسیری پر مبنی ''رودادِ قفس'' نمایاں ہے۔ کشمیر اور پاکستان کے ساتھ ان کا عشق اُن کا سب سے بڑا جرم تھا، جس کی پاداش میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں عمر بھر جھیلنا پڑیں۔ انھیں عشق کے اس امتحان سے کئی بار گزرنا پڑا مگر ہر بار وہ سرخرو ہو کر نکلے اور ان کا عشق فتح یاب ہوا۔ گولیوں کی

بوچھاڑ اور بارود کی چارسو پھیلی بُو بھی ان کے پائے استقلال اور استقامت میں لغزش کا سبب نہ بن سکی۔ وہ باطل طاقتوں کے نرغے میں ''ہم پاکستانی ہیں، پاکستان ہمارا ہے'، کا نعرۂ حق بلند کرتے رہے۔ عمر بھر رسمِ شبیری ادا کرنے والے سید علی گیلانی کہتے جاتے، ''میرا نام علی ہے اور میں دہشت گرد نہیں ہوں، میں کشمیر میں پاکستان کا پرچم ہوں، ہاں! وہی کشمیر جو پاکستان کی شہ رگ ہے۔''

سید علی شاہ گیلانی آگے بڑھتے رہے اور عمرِ رواں تیزی سے اس جہاندیدہ شیر کو جسمانی طور پر کمزور کرتی گئی۔ گزشتہ سال جون میں انھوں نے خرابیٔ صحت کے سبب آل پارٹیز حریت کانفرنس کی سربراہی سے رضا کارانہ دستبرداری کا اعلان کیا اور اپنے نائب محمد اشرف صحرائی کو قیادت سونپ دی، جو ماہِ مئی میں بھارتی قید میں کورونا کے سبب وفات پا گئے۔ سید علی گیلانی آخری لمحے تک کشمیریوں کی آواز بنے رہے اور پاکستان ہی کو کشمیریوں کا اصل وطن اور حقیقی ٹھکانہ قرار دیتے تھے۔ بھارتی دہشت گردی کے خلاف وہ دُنیا بھر میں اپنی تحریر و تقریر سے آواز بلند کرتے رہے۔ انھیں اپنے ''جرمِ عشق'' پر ہمیشہ ناز رہا اور اس عشق کے سب مراحل میں وہ ہمیشہ اکیلے اور یکتا آگے بڑھتے، لڑتے اور دشمن سے پنجہ آزمائی کرتے نظر آتے۔ اسلام، قرآن، علم، سیاست، کشمیر اور پاکستان اُن کے عشق کے مختلف پرتو ہیں۔ وہ اپنے سیاسی نظریے، کشمیر اور پاکستان سے والہانہ محبت اور عقیدت سے جڑے رہے۔ یکم ستمبر کو جب ان کی سانسوں کی لڑی ٹوٹی تو انھیں پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر تدفین کے لیے تیار کیا گیا مگر یہ مرا ہوا شیر بھی بھارتی جارحیت کا شکار ہو گیا۔ اس مردِ قلندر کا جسدِ خاکی چھین لیا گیا اور رات کی تاریکی میں وصیت کے برعکس، گھر کے قریب ہی انھیں دفنا دیا گیا۔ اُن کی قبرستانِ شہدا میں دفنائے جانے کی خواہش بھی پوری نہ کی جا سکی۔ وہ مردِ مجاہد زندگی بھر دشمنوں کے لیے خوف کی علامت رہا اور مر کر بھی ان کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا۔ فیض احمد فیضؔ نے شاید یہ اشعار برسوں پہلے اسی سچے عاشق اور پکے پاکستانی کے حوالے سے لکھے تھے...

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

❑❑❑
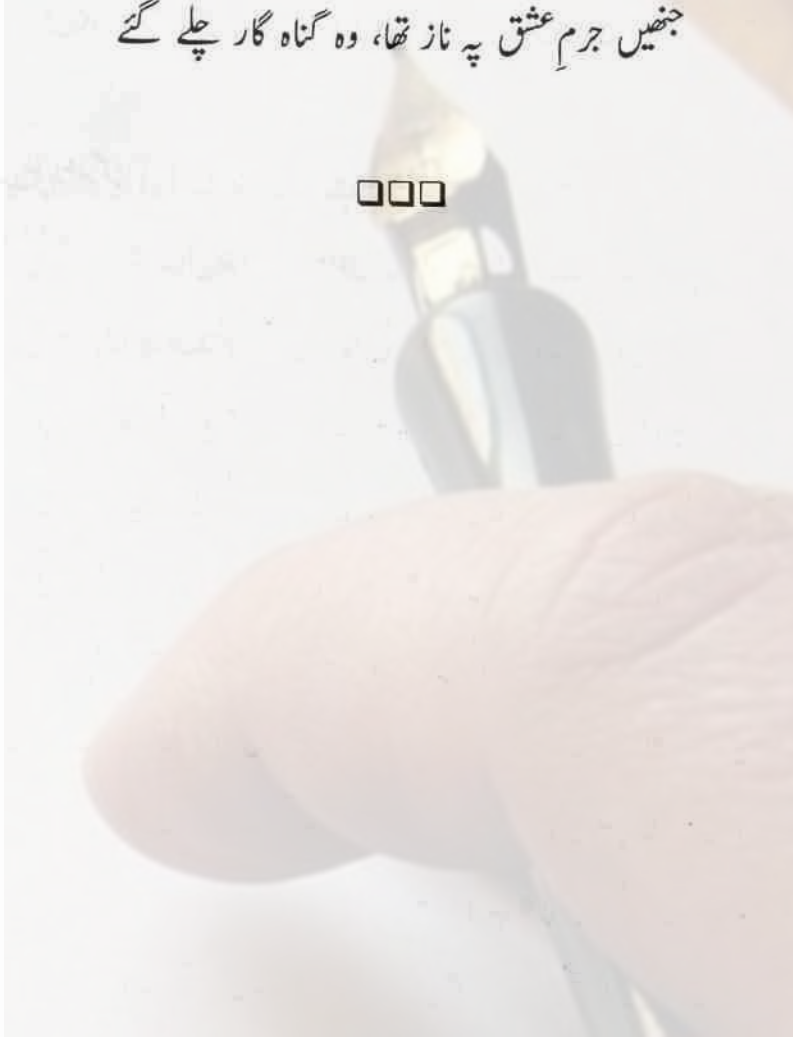
دعا، رضا، عطا

''سر میرا نالائق ترین کلاس فیلو ذیشان مجھ سے آگے نکل گیا۔ یقین کیجیے اس میں رتی برابر بھی خود اعتمادی نہ تھی۔ اساتذہ کلاس میں کوئی سوال پوچھ لیتے تو ہکلاتے ہوئے سوال دہرانے کی درخواست کر کے ہمیشہ اپنی تذلیل کرواتا، جس دن اس کی پریزنٹیشن ہوتی کلاس میں اچھا خاصا لطیفہ بن جایا کرتا، کیونکہ ہم سب جانتے تھے کہ آواز کے ساتھ ساتھ ڈائس کے پیچھے اس کی ٹانگیں بھی بری طرح کانپ رہی ہوتیں۔'' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد میں زیرِ تعلیم ایم بی اے فائنل ایئر کا طالب علم ارسلان میرے سامنے بیٹھا سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلہ میں رہنمائی کے لیے موجود تھا اور مٹھیاں بھینچے اپنا المیہ بیان کر رہا تھا اور میں زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ ''سر آپ مسکرا رہے ہیں؟'' اس نے دُنیا جہان کا رنج لہجے میں سمو کر بے یقینی سے سوال کیا۔ نہیں! میں محض مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہوں، کیونکہ یہ صرف تمھارا المیہ نہیں، بلکہ ہزاروں نوجوان اسی کشمکش کا شکار ہیں کہ آخر دن رات کی انتھک محنت، دل میں ذوقِ جستجو، منزل تک پہنچنے کی خُو اور پھر خوابوں کی تکمیل کی شدید آرزُو کے باوجود بھی انھیں کامیابی کیوں نہیں ملتی اور ناکامی ان کی طرف ایسے بھاگتی ہے، جیسے بچھڑے ہوئے بچے کو برسوں بعد سامنے پا کر ماں اس کی طرف لپکتی ہے اور

پھر چھوڑنے کا نام نہیں لیتی ہے۔

یہاں پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحیثیتِ مسلمان ہمارا مقصد صرف اس دُنیا کی کامیابی نہیں، بلکہ آخرت کی فلاح بھی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو اس دُنیا میں کامیابی کے لیے کوئی محنت طلب کام صرف اس لیے بھی نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک یہ دُنیا محض ایک عارضی ٹھکانہ ہے۔ انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہمارے دینِ حق میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین اور دُنیا کو ساتھ رکھنا پڑتا ہے اور دونوں جہانوں کی فلاح و کامیابی یقینی بنانے کے لیے اس جہانِ کارزار سے اپنے کردار کی پختگی اور سچائی سے بخوبی گزرنا پڑتا ہے۔ صرف مسجد میں رہنے سے جنت نہیں ملتی، اگر دُنیا کی زندگی اتنی بے مقصد ہوتی تو یہاں لوگوں کی پوری زندگی ریاضت میں صرف نہ ہوتی۔ آخرت میں جواب دہی کا سوچ کر نفسیاتی خواہشات کو کچلنے کا تصور جنم نہ لیتا۔ دراصل کامیابی نام ہی آزمائش کی بھٹی میں سے گزر کر منزل کو پالینے کا ہے۔ بقول واصف علی واصفؔ...

چلے ہو ساتھ تو ہمت نہ ہارنا واصفؔ
کہ منزلوں کا تصور میرے سفر میں نہیں

''تو سر پھر ہم پوری محنت اور ذہانت کے باوجود ناکام کیوں ہوتے ہیں؟'، اس نے اپنی پریشانی میں ایک اور سوال داغ دیا۔ ارسلان میاں! کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پہچانیں، اپنی ذات کو پہچانیں! تب جا کر آپ پر آپ کا مقصدِ حیات آشکارا ہوگا۔ دراصل اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانا ہی اولین شرط ہے۔ اس کے بعد پھر دعا، رضا اور عطا کے تین اہم مراحل سے گزر کر دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی یقینی بن جاتی ہے۔ میں نے زندگی میں کامیابی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور یہ شرف مجھے اس لیے حاصل ہوا کہ میں نے اپنی ناکامیوں سے سیکھا اور یوں کامیابی کی رمز رمز سے واقف ہوا، تو سوچا آج اسی حوالے سے قلم اٹھاؤں۔ بات گو ذرا سی ہے، بات عمر بھر کی ہے۔

کامیابی کا راز اتنا ہی آسان فہم ہے جتنا کہ دوسری جماعت کی ریاضی کے سوالات، لیکن اسے سمجھنے کے لیے شعور کی آنکھ کا کھلا ہونا اور دل کا نرم ہونا ضروری ہے۔ دل کی نرمی کی شرط اس لیے رکھی، کیونکہ شعور کے باوجود بھی ہم بہت سی اہم باتیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حقیقی کامیابی کے لیے پہلا عمل دعا ہے، وہ دعا جو کوئی ایسا شخص آپ کے لیے کرے، جسے آپ نے بغیر کسی طمع یا لالچ اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر خالص اللہ کی رضا کے لیے کوئی فائدہ پہنچایا ہو۔ وہ بے نوا شخص اس دُنیا میں آپ کو آپ کی نیکی کا بدلہ نہیں دے سکتا، تو ایسی حالت میں وہ آپ کو صدقِ دل سے دعا دیتا ہے۔ یقین کیجیے اس کے منہ سے جو بھی دعائیہ کلمات نکلتے ہیں، وہ عرش والا کبھی رد نہیں کرتا اور اکثر جو آپ کے نالائق کلاس فیلوز آپ سے آگے نکل جاتے ہیں، یہ عین ممکن ہے کہ وہ دعائیں سمیٹنے میں آپ سے زیادہ خوش نصیب ہوں، لہٰذا دعائیں لیتے رہا کریں۔ گھر میں یہ سلسلہ ماں باپ کی دعا سے شروع ہوتا ہے، پھر اللہ والوں کی دعائیں ہیں۔ دعا کے موتی غم کے ماروں کی دلجوئی اور اشک شوئی میں ملتے ہیں۔ آوازِ خلق نقارۂ خدا بن جاتی ہے اور ربِ کریم عرشِ بریں پر آپ کی زندگی میں آسانیاں اور آسودگی کا بندوبست فرما دیتے ہیں، اگر آپ دعاؤں کے حصول میں کامیاب ہو جائیں تو دعائیں سبب بنتی ہیں رضائے الٰہی کا۔ رضائے الٰہی آپ پر رضائے مصطفیٰ ﷺ کے خزانے کھول دیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں، لیکن سب سے آسان راستہ مخلوق خدا سے ہو کر جاتا ہے اور جب مخلوقِ خدا، رب کے سامنے آپ کے واسطے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دے تو اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کی رضا آپ کے نصیب میں لکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ اور اس کے محبوب ﷺ آپ سے راضی ہو جائیں تو مخلوقِ خدا بھی راضی ہو جاتی ہے۔ ان دو مرحلوں سے گزر کر آپ آخری مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں، جسے عطا کہتے ہیں؛ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس عطا کا آپ کی محنت یا ذہانت سے کوئی تعلق نہیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ اللہ ان کو بھی عطا کر دیتا ہے، جنھوں نے سکول کی شکل تک نہیں دیکھی

ہوتی۔ بلھے شاہ، بابا فرید، سلطان باہو اور خواجہ فرید کبھی کسی سکول نہیں گئے، مگر لوگ ان ہستیوں پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، یہ عطا ہی تو ہے، پھر آپ وہ سب حاصل کر لیتے ہیں، جس کے لیے آپ نے خواب دیکھے ہوتے ہیں۔ عہدہ، دولت، شہرت، اولادِ صالح غرض یہ کہ دُنیا کی کسی بھی نعمت کی خواہش آپ کے دل میں جنم لے تو وہ آپ کو عطا کر دی جاتی ہے۔ آپ دُنیا کی نظر میں ایک کامیاب انسان ٹھہرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے پسندیدہ بندوں میں بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں دُنیا اور آخرت کی بھلائی اور کامیابی آپ کا مقدر بن جاتی ہیں۔

اور ہاں جب اللہ تعالیٰ آپ کو عزت دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اس کائنات کی ہر شے آپ کو منزل کی طرف دھکیلنے لگتی ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر آپ کا اچھا نہیں سوچتے وہ بھی آپ کو نفع پہنچانے میں لگ جاتے ہیں۔ ارسلان میاں! یاد رکھنا، جب ہم محنت کے باوجود مسلسل ناکام ہو رہے ہوں اور کامیابی ہمارے لیے ایک ٹیڑھی لکیر بن جائے تو سب سے پہلے ناکامی کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے اور جب آپ اس حوالے سے سوچیں گے تو آپ یقیناً جان لیں گے کہ آپ پیدائشی سبز قدم ہرگز نہیں اور یہ جو قسمت سے بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں، ان کا سبب کچھ اور ہے۔ آپ اپنی وضع بدلیں، قسمت خود ہی بدل جائے گی، پھر آپ کے نالائق کلاس فیلوز کبھی بھی آپ سے آگے نہیں نکل پائیں گے اور نہ ہی ان کے آگے نکل جانے کا المیہ کبھی آپ کے لیے سوہانِ روح ہوگا۔

□□□

فصلِ گُل کے باغباں!

''میں سر کا خطاب اس وقت تک قبول نہیں کر سکتا جب تک میرے استاد سید میر حسن کو شمس العلما کا خطاب نہ دے دیا جائے۔'' ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا دوٹوک الفاظ میں کہا گیا یہ جملہ انگریز گورنر کو حیران کر گیا۔ ''لیکن مسٹر اقبال! آپ ایک عظیم شاعر ہیں، فلسفی اور دانشور ہونے کے ساتھ کئی شاہکار کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کو یہ خطاب آپ کی علمی و ادبی کاوشوں کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا ہے، آپ کے استاد نے کیا تخلیق کیا ہے؟'' انگریز گورنر کی بات سن کر علامہ اقبال کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ ابھری اور پھر اقبال نے وہ تاریخی جملہ کہا جسے ہر تعلیمی ادارے کے مرکزی دروازے پر درج ہونا چاہیے، ''میر حسن کی تخلیق اقبال ہے۔'' علامہ محمد اقبال کا جواب سن کر انگریز گورنر اس قدر متاثر ہوا کہ نہ صرف وہ سید میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دینے پہ رضا مند ہو گیا بلکہ علامہ اقبال کی خواہش پہ تقریب میر حسن کے شہر سیالکوٹ میں منعقد کی گئی تا کہ عظیم استاد کو خطاب کی وصولی کے لیے سرکاری دفتر نہ آنا پڑے اور انھیں بہترین طریقے سے خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔

چند ماہ قبل پنجاب کی ایک تعلیمی درسگاہ میں پروفیسر عارف علامہ اقبال کی سوانحِ عمری اور

شاعری پر لیکچر دے رہے تھے تو انھیں احساس ہوا کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا طالبعلم بالکل متوجہ نہیں، ''سٹینڈ اَپ'' پروفیسر عارف نے باتوں میں مشغول نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ نوجوان نے پروفیسر صاحب کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ ''میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔'' پروفیسر صاحب اس بار قدرے اونچی آواز میں گویا ہوئے لیکن طالب علم سنی اَن سنی کر گیا۔ پروفیسر صاحب نے چیخ کر کہا ''گیٹ آؤٹ آف مائی کلاس'' شاید وہ طالب علم اسی جملے کے انتظار میں تھا لہٰذا یہ سنتے ہی وہ کلاس سے باہر چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد نوٹس بورڈ پر آویزاں فائنل رزلٹ لسٹ میں اس نوجوان طالبعلم کے رول نمبر کے سامنے جلی حروف میں درج تھا ''فیل''، اس سے اگلی ہی شام وہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ کے ماتھے پر ایسی سیاہ لکیر ہے جسے وقت بھی نہیں مٹا پائے گا۔ پروفیسر عارف اپنے ہی سٹوڈنٹ کے ہاتھوں زخمی ہو کر ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

ہمارے ہاں استاد کی بے حرمتی کا یہ پہلا واقعہ نہیں۔ آئے روز اخبارات اور ٹی وی چینلز پر اساتذہ پر تشدد کی خبریں گردش کرتی رہتی ہیں۔ چونکہ ''مار نہیں پیار'' کے متبادل کے طور پر ہم ''استاد قوم کا معمار'' جیسا کوئی فلسفہ پیش نہیں کر سکے لہٰذا معاشرے میں استاد کی بے توقیری تیزی سے بڑھی ہے اور یوں اس مقدس پیشے کا وقار بری طرح مجروح ہوا ہے۔ طلبہ کے ذہنوں میں یہ بٹھایا جا چکا ہے کہ ان کی بھاری بھرکم فیسوں سے ہی ان کے اساتذہ کا رزق وابستہ ہے لہٰذا استاد کو انھیں ڈانٹنے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ بدقسمتی سے استاد کی نافرمانی ایک فیشن بن چکا ہے اور استاد کی ڈانٹ کے جواب میں مسکرانا ایک مشغلہ۔ گزشتہ دو ماہ سے سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کے مخصوص حصے پر استاد کو ایک بھیانک بھیڑیے کے روپ میں دکھایا جا رہا ہے جو طلبہ کا جنسی استحصال کر رہا ہے اس حوالے سے لاہور کے ایک نجی سکول کا حوالہ پیش کر کے اساتذہ کو نہ صرف سرِعام گالیاں دی جا رہی ہیں بلکہ اسے سولی پر لٹکانے کی خواہش کا اظہار بھی مسلسل کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر ہمیں ایک واضح مؤقف اپنانے کی ضرورت ہے کہ جو اساتذہ ایسی غلیظ حرکات کے مرتکب ہوں، ان کو اِس

مقدس پیشے کے ساتھ منسلک رہنے کا کوئی حق نہیں اور ان کو قرار واقعی سزا دی جانی چاہیے۔ یہ بھی درست ہے کہ کچھ لوگ حادثاتی طور پر درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ تو ہو جاتے ہیں مگر وہ اس عظیم منصب کے تقدس اور تقاضوں سے بے بہرہ ہوتے ہوئے شدید نااہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی کالی بھیڑیں استاد جیسی مقدس ہستی کا تقدس پامال کرتی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس زمین پر طلبہ کے ہاتھوں زخمی ہونے والے استاد کا لہو گرے وہاں گلِ لالہ نمودار نہیں ہوتے بلکہ جہالت نمو پاتی ہے، ظلمت کے اندھیرے ابھرتے ہیں، بربریت وسفاکیت پھوٹتی ہے۔ ایسی زمین مکمل طور پر بانجھ ہونے لگتی ہے اور اس کی کوکھ سے قدآور شخصیات پیدا ہونا بند ہو جاتی ہیں۔ جو قوم استاد کو عزت نہیں دے سکتی وہ اقوامِ عالم میں بے وقعت ہو جاتی ہے۔ جو معاشرہ استاد کی بے توقیری کرے وہاں عدل وانصاف ناپید ہو جاتا ہے اور ظلم صاحبِ اولاد ہونے لگتا ہے۔

باادب بانصیب، بےادب بےنصیب! کلاس روم میں لیکچر کے دوران ہینڈ فری لگا کر میوزک سننے والے اکثر اعلیٰ ڈگری کے ہوتے ہوئے بھی نوکری کے حصول کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے پاس ڈگری کے کاغذ کا ایک ٹکرا ضرور ہوتا ہے مگر اُن کی شخصیت وکردار میں تعلیم وتربیت کا شدید فقدان ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک آفاقی حقیقت ہے کہ استاد کے احترام میں جھکنے والوں نے ہمیشہ رفعتیں پائی ہیں۔ استاد کے رتبے کو پہچاننے والے ہی عزت کی اعلیٰ مسند پر بٹھائے جاتے ہیں اور وہ زمانے میں روشنی بن کر پھیل جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے عظیم استاد حماد بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی طرف پاؤں پھیلا کر نہ سوتے حالانکہ استاد اور ان کے گھر کے بیچ سات گلیوں کا فاصلہ تھا۔ استاد کا مقام جاننا ہے تو خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹوں سے پوچھیں جو اپنے استادِ محترم کے جوتے اٹھا کر ان کے قدموں میں رکھنے کے لیے آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ جب خلیفۂ وقت کو اس کا علم ہوا تو معزز استاد کو دربار میں کھانے کی دعوت پر بلایا۔ ''استادِ محترم آپ کے خیال میں فی الوقت سب سے زیادہ قابلِ تکریم شخصیت کون ہے؟'' استاد نے قدرے سنبھل کر جواب دیا، ''یقیناً خلیفۃ المسلمین!'' یہ جواب سن کر خلیفہ مسکرانے لگا اور

پھر ایک ایسا جملہ کہا جو استاد کے عظیم مقام و مرتبہ پر مہر ثبت کرتا ہے۔ ''ہرگز نہیں! استادِ محترم! فی الوقت سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ ہستی ہے جس کے جوتے سیدھے کرنا خلیفۂ وقت کے بیٹے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور وہ ہستی آپ ہیں۔''

اکیسویں صدی کی گوگل جنریشن کے ڈیجیٹل طلبہ اساتذہ کے حقیقی مقام سے اس لیے بھی ناواقف ہیں کہ ان کی علم تک رسائی کے لیے بہت سی موبائل ایپلیکیشنز موجود ہیں۔ وہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے پوری آزادی سے اپنی من پسند چیزیں سیکھ تو سکتے ہیں مگر اس عمل میں وہ تربیت اور تہذیب سے کوسوں دور بھی رہتے ہیں۔ دوسری طرف مادہ پرستی کے اس دور میں بعض اساتذہ بھی اپنے حقیقی منصب کو بھول بیٹھے ہیں۔ یوں تعلیم و تربیت کا یہ مقدس پیشہ ایک کاروبار بن کے رہ گیا ہے۔ اب درس و تدریس کے دو ہی مقاصد نظر آتے ہیں، ڈگری اور فیس۔ اساتذہ کو فیس سے غرض تو طلبہ کو محض ڈگری کی فکر! یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ڈگری ہولڈرز کی تعداد لاکھوں میں ہے مگر اس بدنصیب ہجوم کی اکثریت تعلیم سے عاری، تربیت سے محروم اور تہذیب سے میلوں دور ہے۔ حقیقی علم کی دولت اور مثالی کردار سے صرف چند خوش نصیب ہی مالا مال ہوتے ہیں اور کامیابی بھی اُنہی کا مقدر بنتی ہے۔

استاد کے منصب کا تقدس اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ خاتم النّبیین نے فرمایا ''بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا۔'' بابِ شہرِ علم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''جس نے مجھے ایک لفظ بھی سکھایا وہ میرا آقا ہے۔'' لہٰذا یہاں پر انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ جب بھی ہم درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ چند غلیظ کردار کے حامل افراد پر تنقید کریں تو ہمیں استاد کے عظیم منصب کی بے توقیری ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ تنقید صرف مخصوص افراد کے مخصوص عمل پر ہونی چاہیے، اس عظیم پیشے پر تبرّیٰ نہیں کیا جانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے توقیری کے اس غیر محتاط عمل میں ہم اپنا قومی وقار مجروح کر بیٹھیں اور ہمارے قابلِ تکریم اساتذہ، جن کے منہ سے نکلے چند الفاظ لوگوں کی زندگیاں بدل سکتے ہیں اور قوم کو ایک روشن

مستقبل کی نوید دے سکتے ہیں، اپنے اس عظیم منصب سے دستبردار ہو جائیں۔ ان عظیم ہستیوں کی خدمات کے صلے میں احترام دینا بطور معاشرہ ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے۔ آیئے! ان عظیم باغبانوں کے ساتھ مل کر اپنی ارضِ پاک پر ایسی فصلِ گل کی آبیاری کریں جسے اندیشۂ زوال نہ ہو۔

□□□
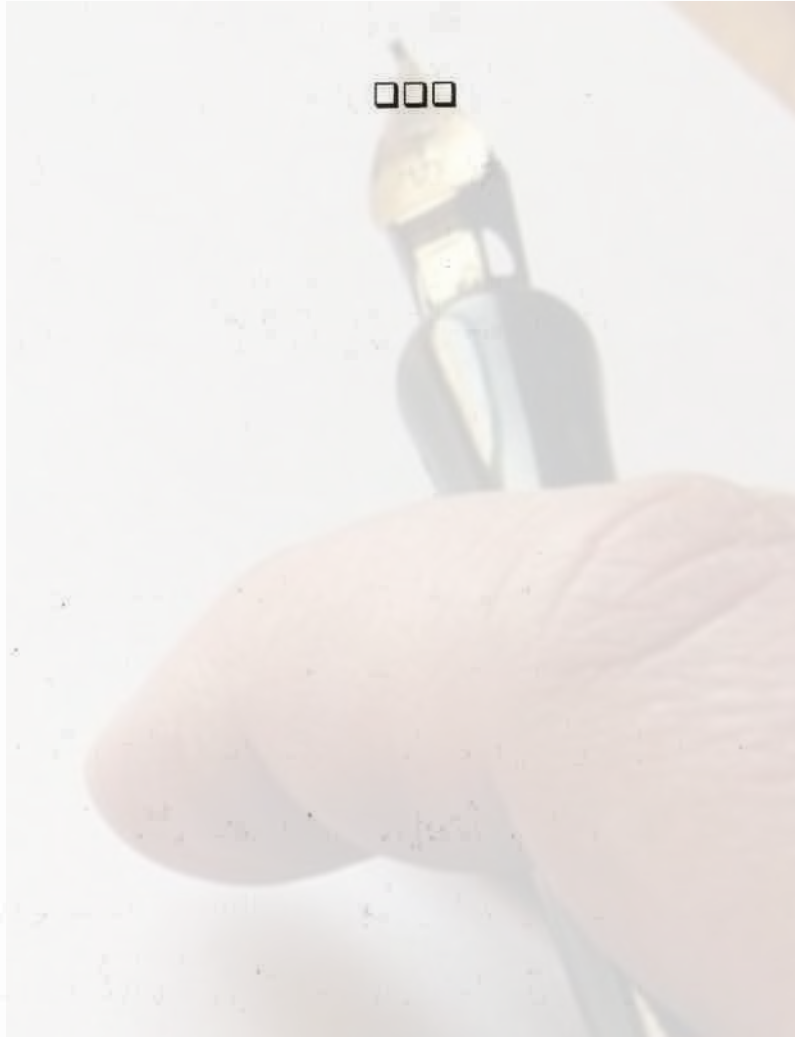
مہنگا ترین چائے کا کپ

یہ کہانی ہے رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ میں زیرِ تعلیم متحدہ ہندوستان کے دو گہرے دوستوں کی۔ ایک کا تعلق ہندو خاندان سے جبکہ دوسرا مسلمان گھرانے کا ہونہار سپوت تھا۔ یہ دونوں لڑکپن سے ہی بڑے بڑے خواب دیکھنے کے عادی اور غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ ہندو گھرانے سے تعلق رکھنے والا لڑکا حد سے زیادہ خوش فہم واقع ہوا تھا اور وہ اکثر اپنی اس عادت کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھایا کرتا جبکہ اُس کا مسلمان دوست اُسے اکثر سمجھاتا کہ ضرورت سے زیادہ خوش فہمی اچھی چیز نہیں، یہ انسان کو تباہ کر دیتی ہے لیکن وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پہ بدستور قائم رہا۔ پھر برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ہوئی اور وسطِ اگست 1947ء میں پاکستان ایک علیحدہ مملکت کے طور پر دُنیا کے نقشے پر ابھرا۔ یہ دونوں دوست اپنی اَن تھک محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنی اپنی مسلح افواج کے اعلیٰ ترین عہدے تک جا پہنچے۔ یہ خوش فہم نوجوان بھارتی چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر براجمان ہوا تو اس کا دوست پاکستان میں فیلڈ مارشل کے رینک سجانے میں کامیاب ہوا۔ بدقسمتی

سے اعلیٰ ترین منصب کے ملنے کے بعد اس ہندو دوست کی خوش فہمیوں پر یقین کی مہر لگ چکی تھی لہٰذا اس نے اپنا یہ مشغلہ جاری رکھتے ہوئے پاکستان کے شہر لاہور کے جم خانہ کلب میں چائے پینے کی خوش فہمی پال لی۔

ایک دن بھارتی آرمی چیف جنرل جے این چودھری نے اس بیوقوفانہ خواہش کا اظہار اپنے دوست فیلڈ مارشل ایوب خان سے کیا جو اُسے اِس احمقانہ منصوبے کے نقصانات بتا کر باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی ساری دلیلیں بے سود ثابت ہوئیں۔ پھر 6 ستمبر 1965ء کی رات ہمارے تاریک ذہن اور پست سوچ کے حامل بےاصول اور بیوقوف دشمن بھارت نے پوری تیاری کے ساتھ پاکستان پر لاہور کی جانب سے حملہ کر دیا۔ وہ اِس جنگ کی منصوبہ بندی ایک طویل عرصے سے کر رہا تھا۔ 1947ء کے بعد سے ہی بھارت اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر برصغیر پاک و ہند کی غیر منصفانہ علاقائی، صنعتی، سرکاری، فوجی اور کاروباری تقسیم کر کے جو گھناؤنا کھیل کھیلا تھا اس کی بدولت پاکستان نامی یہ نوزائیدہ ریاست محض چند ہی ماہ قائم رہ سکے گی اور کچھ ہی عرصے میں واپس ہندوستان سے آن ملے گی لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا اور پاکستان محدود وسائل کے باوجود ترقی کرتے ہوئے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ جب بھارت کو اپنا متحدہ ہندوستان والا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہ دیا تو اس نے پوری طاقت سے پاکستان پر چڑھائی کر دی اور سمندری، فضائی اور زمینی راستوں سے پاکستان کی طرف بڑھنے لگا۔

دشمن کی سب سے بڑی بیوقوفی اور خوش فہمی یہ تھی کہ اسے نہ تو اپنی کمزوریوں کا علم تھا نہ ہمارے جذبۂ ایمانی کا اندازہ۔ اُسے لگا کہ وہ ایک بدمست ہاتھی کی طرح دندناتا ہوا آئے گا اور پاکستان کو ایک تر نوالے کی مانند نگلنے میں بہ آسانی کامیاب ہو جائے گا لیکن پاکستان کے اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان ریڈیو کے ذریعے عوام سے مخاطب ہوئے ''میرے عزیز ہم وطنو! السلام علیکم! دس کروڑ پاکستانیوں کی آزمائش کا وقت آ چکا ہے۔ آج صبح سویرے ہندوستانی فوج

نے پاکستان کے علاقے پر لاہور کی طرف سے حملہ کیا اور بھارتی ہوائی بیڑے نے وزیر آباد میں کھڑی ایک مسافر گاڑی کو اپنے بزدلانہ حملے کا نشانہ بنایا۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دل کی دھڑکن میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی صدا گونج رہی ہے، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دشمن کی توپیں ہمیشہ کے لیے خاموش نہ ہو جائیں۔''

بھارت نے جنگ کا آغاز تو کر دیا لیکن پاک فوج کے جوابی حملوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ بھارتی فوج کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ بی آر بی نہر کے اُس پار اُسے میجر عزیز بھٹی جیسے مردِ آہن کا سامنا کرنا پڑے گا جو محض 120 جوانوں کے ساتھ اُس کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے۔ بھارتی فضائیہ نے یہ کب سوچا تھا کہ سرگودھا کی فضاؤں میں اس کا سامنا ایم ایم عالم جیسے علامہ اقبال کے شاہینوں سے ہوگا جو ایک منٹ کے قلیل وقت میں اس کے پانچ جنگی طیارے تباہ کر کے عالمی ریکارڈ بناتے ہوئے اُسے نشانِ عبرت بنا دیں گے۔ دوارکا آپریشن کے دوران بھارت کے بحری بیڑے سمندر کے نیلگوں پانیوں میں جس قدر بے آبرو ہوئے وہ بھی ہزیمت کی ایک الگ داستاں ہے۔ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے لیکن کیسے، یہ اُس وقت پتا چلا جب بھارتی جنرل اپنی آرمرڈ ڈویژن جسے وہ ''فخرِ ہند'' کا خطاب دے چکا تھا، کی پوری قوت کے ساتھ سیالکوٹ پر حملہ آور ہوا۔ دشمن اس خوش فہمی میں تھا کہ وہ گوجرانوالہ سے ہوتا ہوا لاہور کے عقب میں جی ٹی روڈ پر پہنچ کر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے گا لیکن شومئ قسمت کہ ''فخرِ ہند'' کا سامنا ہماری ایک آرمرڈ یونٹ 25 کیولری سے ہوا جس نے تین دن تک ''فخرِ ہند'' کی پوری آرمرڈ ڈویژن کو چونڈہ سیکٹر سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ آج بھی پاک فوج کے قبضے میں لیا جانے والا وہی بھارتی ٹینک جو کبھی ''فخرِ ہند'' تھا، اب ''ذلتِ ہند'' بن کر آرمی میوزیم میں آنے والے سیاحوں کو اپنی عبرتناک شکست کی داستاں سنا رہا ہے۔ چونڈہ سیکٹر عملی طور پر بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔

بھارتی میجر جنرل نرنجن پرساد کی وہ بوکھلاہٹ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے جس کا شکار ہو کر وہ

اپنی سرکاری جیپ چھوڑ کر بھاگ گیا، جس میں اُس کی ذاتی ڈائری سمیت کئی اہم بھارتی دستاویزات بھی موجود تھیں اور جسے آٹھ ستمبر کے روز 18 بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے واہگہ سیکٹر میں بی آر بی نہر پار کر کے اپنے قبضے میں لیا۔ جنرل نرنجن کی بزدلی کی داستان بھارتی وزیر دفاع وائے بی چون (Y.B.CHAVAN) خود اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ سترہ روز جاری رہنے والی اس جنگ کی گرد بیٹھی تو بھارت کا رعب، دبدبہ اور غرور بھی جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا اور بھارت اپنے سینکڑوں ٹینکوں، درجنوں لڑاکا طیاروں اور کئی بحری بیڑوں سمیت پانچ ہزار سے زائد فوجیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ قصور سے لے کر اکھنور تک، ہریارا سے لے کر کھیم کرن تک، واہگہ سے لے کر جام نگر تک، چونڈا سے لے کر ہلواڑ تک اور بی آر بی نہر سے لے کر دوارکا کے قلعے تک ہر سمت پاک فوج کی کامیابیوں کے نشان ثبت تھے اور سبز ہلالی پاکستانی پرچم کا وقار مزید بلند ہو چکا تھا۔ وائے بی چون اس شکست کا برملا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ”محاذوں پر 6 ستمبر کا دن ہمارے لیے بہت کٹھن تھا، ہم پر حد درجہ خوفناک جوابی حملے کیے گئے۔ چیف آف آرمی سٹاف خود بھی بے یقینی کا شکار تھے۔“

سچ کہتے ہیں تاریخ خود کو دہراتی ہے اور جو قومیں تاریخ سے سبق نہیں سیکھتیں، ذلت ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ بھارت کا شمار بھی انھی قوموں میں ہوتا ہے جو تاریخ سے سبق نہیں سیکھتیں۔ 26 فروری 2019ء کی رات بھارت نے ایک بار پھر تاریکی میں پاکستانی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی اور ایک نام نہاد کارروائی میں بالاکوٹ کے چند درختوں کو نقصان پہنچا کر چلتا بنا۔ اگلے ہی روز پاک فضائیہ کے جوابی حملے نے اسے ایک بار پھر چھٹی کا دودھ یاد کرا دیا اور اُس کا طیارہ مِگ 21 مار گرایا اور اُس کے پائلٹ ابھینندن کو زندہ گرفتار کر لیا۔ ایک بار پھر پاک فوج نے دشمن کو یہ بتا دیا کہ اگر آپ کو لاہور کے جم خانہ میں چائے پینے کا اتنا ہی شوق ہے تو اس کے لیے آپ کو بھی ابھینندن کی طرح اپنے طیارے کی قربانی دے کر بطور قیدی ہمارا مہمان بننا پڑے گا۔ ابھینندن کی خوف سے منجمد ہوتی ہوئی دھڑکنوں کو رواں رکھنے کے لیے پاک فوج نے اُسے چائے کی گرما گرم

پیالی پیش کر کے فیلڈ مارشل ایوب خان کے ہم جماعت بھارتی جنرل جے این چودھری کی دیرینہ ادھوری خواہش پوری کر دی جس کی حسرتِ ناکام وہ دل میں لیے راکھ کی ڈھیری میں بدل گیا۔ یوں بھارتی پائلٹ ابھینندن کو دُنیا کا مہنگا ترین چائے کا کپ پینے کا اعزاز حاصل ہوا جس پر وہ خود اور پوری بھارتی قوم شرمندہ ہے۔

❑❑❑
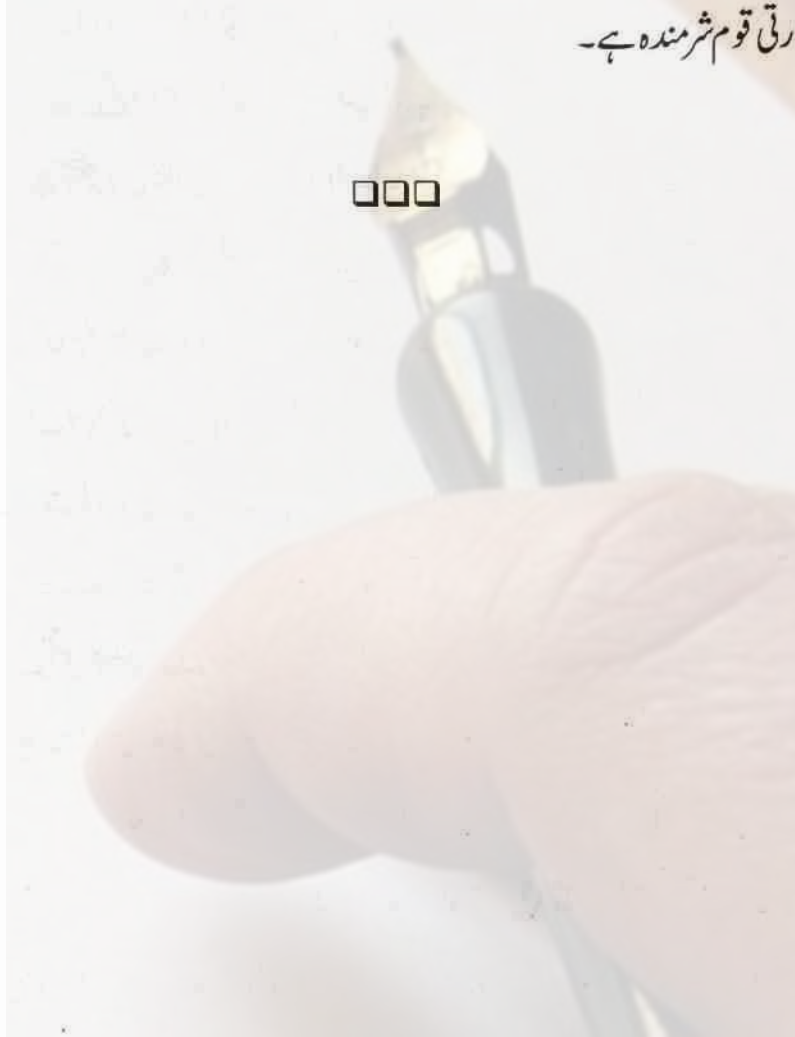
خود اعتمادی کی دولت

1858ء وہ دور تھا جب ایک ہزار سے زائد ایجادات کا موجد، نوبیل انعام یافتہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسدان تھامس ایلوا ایڈیسن ایک گیارہ سالہ نالائق طالبعلم تھا۔ یہ لڑکا اپنے ہم عمر بچوں سے ہر لحاظ سے پیچھے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تیز بخار نے اس کی سماعت کو شدید متاثر کیا تھا اور اب وہ نیم بہرے پن کا شکار ہو چکا تھا۔ دوسرے لوگ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، اس سے بے نیاز وہ بچہ اپنی ہی دُنیا میں مگن رہتا۔ اس کا دماغ عجیب وغریب چیزیں سوچتا رہتا۔ اِنہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک شام تھامس ایڈیسن اپنے خیالوں میں گم ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اس کی نظر ایک چڑیا پر پڑی جو درخت کی جڑ کے پاس موجود ننھے منے کیڑوں کو کھا رہی تھی۔ ایڈیسن یہ منظر انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ایک سوچ لپکی کہ شاید چڑیا کی اڑان کا تعلق حشرات الارض سے ہے۔ اگر انسان بھی یہ کھانا شروع کر دے تو عین ممکن ہے وہ بھی اڑنے لگے۔ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اُس نے ان کیڑوں کو ایک بوتل میں بھر لیا اور ان کا سفوف تیار کر کے اپنے ایک دوست کو پلا دیا لیکن اس تجربے کے نتائج بے حد بھیانک نکلے اور اس کا دوست شدید بیمار ہو گیا۔ اس طرح ایڈیسن کو نا صرف بے بھاؤ

کی پڑیں بلکہ وہ ایک ناقابلِ اعتماد شخصیت بھی ٹھہرادیا گیا جس نے اسے مزید ناکارہ بنادیا۔

کچھ عرصہ بعد وہ جس سکول میں زیرِ تعلیم تھا، وہاں کے پرنسپل نے اُسے ایک سربمہر لفافہ تھمایا اور کہا کہ یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔ گھر پہنچ کر اس نے وہ خط ماں کے ہاتھ میں تھمایا اور متجسس نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ ماں نے خط پڑھنا شروع کیا تو اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ پھر اس نے تھامس کو بتایا کہ اس خط میں لکھا ہے کہ تمھارا بیٹا تھامس ایک جینیئس ہے، یہ سکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور یہاں اتنے اچھے استاد نہیں جو اسے پڑھا سکیں، لہٰذا آپ اسے خود ہی پڑھائیں۔ تھامس نے پہلی بار اپنے متعلق ایسے تعریفی کلمات سنے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی قوت اور خود اعتمادی محسوس کر رہا تھا۔ پھر تھامس کی ماں نے آسانیوں سے منزل کا راستہ پوچھے بغیر اپنے بیٹے کے لیے خود موتی چننا شروع کیے اور یوں محض ایک ذرے سے کائنات کی تفسیر اگلوانے میں کامیاب ہو کر قطرے کی وسعتوں میں اپنے بیٹے کے لیے علم کا سمندر تلاش کر کے اس کی رگ و جاں میں سمونے میں کامیاب ہوگئی۔ بقول شاعر...

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور راستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر پتھر جو نوکیلے تھے

گھریلو حالات بہت اچھے نہیں تھے، اسی لیے اس باہمت لڑکے نے محض بارہ سال کی عمر میں ٹرین میں کتابیں بیچ کر اپنے آٹھ بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے میں ماں باپ کی مدد شروع کر دی۔ یوں بچپن سے ہی مختلف حادثات کا شکار یہ بچہ زینہ زینہ ترقی کی منازل طے کرنے لگا اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب گھر پر تعلیم حاصل کرنے والے اس لڑکے نے سائنس کی دُنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اس نے آٹومیٹک ٹیلی گراف کے لیے ٹرانسمیٹر ریسیور ایجاد کیا، میگافون، ساؤنڈ ریکارڈر، سنیما مشین اور فونوگرام (جس نے آگے چل کر گراموفون کی شکل اختیار کر لی) کے علاوہ سینکڑوں ایجادات کا سہرا اپنے سر پہ سجایا۔ سب سے بڑھ کر جو تحفہ اس نے مصنوعی روشنی یعنی بلب کی شکل میں

دُنیا کو دیا اس احسان کے نیچے دُنیا کے تمام حسین و دلکش شہر آج بھی دبے ہوئے ہیں۔ بلب کی ایجاد کے سلسلے میں ایڈیسن نے ایک ہزار کے قریب تجربات کیے جن میں نوسو ننانوے بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن جب بھی اس کا کوئی تجربہ ناکام ہوتا اس کے ذہن میں ماں کے کہے وہ الفاظ گردش کرنے لگتے کہ ''تمھارا بیٹا جینیئس ہے۔'' یہ الفاظ جادوئی پڑیا کی طرح اسے پھر سے تازہ دم کر دیتے اور وہ بلند آواز میں خود کلامی کرنے لگتا۔ ''تھامس! تم ایک جینیئس ہو، اگر کائنات کی قسمت میں روشنی ہے تو اس کے موجد تم ہو گے، صرف تم!'' اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک شام واقعی بلب جل اٹھا۔ اگلے روز اس نے چند دیگر لوگوں کی موجودگی میں یہ بلب اپنے ملازم کو دیا کہ اسے لگا کر ٹیسٹ کرے۔ وہ ملازم اس قدر ہچکچاہٹ کا شکار ہوا کہ گھبراہٹ میں بلب اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ وہاں موجود تمام لوگ سکتے میں آ گئے لیکن ایڈیسن نے ملازم کی سرزنش کرنے کے بجائے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد دوبارہ بلب تیار کر کے پھر اُسی ملازم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ''اسے لگاؤ اور ٹیسٹ کرو۔'' اس بار ملازم نے انتہائی خود اعتمادی سے بلب لگایا اور پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ جب ایڈیسن سے پوچھا گیا کہ کل جس نے بلب توڑ دیا، آج پھر اسی کو دینے کا کیا جواز تھا؟ تو اس نے کہا ''مجھے محسوس ہوا کہ اگر آج میں نے اس کو دوبارہ بلب نہ دیا تو اس کے اندر خود اعتمادی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گی اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔''

اپنی 84 سالہ طویل عمر میں تھامس ایڈیسن نے جہدِ مسلسل سے ایجادات کا انبار لگا کر خود کو نہ صرف انیسویں صدی کے بہترین سائنس دان کے طور پر منوایا بلکہ نوعِ انسانی میں سب سے زیادہ انفرادی ایجادات کے موجد کے طور پر بھی سامنے آیا۔ جب تھامس ایڈیسن کی شہرت آسمان کو چھو رہی تھی، ایک شام وہ اپنے گھر کی پرانی الماری میں سے کچھ کاغذات تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک بوسیدہ کاغذ پر پڑی، یہ وہی خط تھا جو بچپن میں اس نے اپنی والدہ کو سکول کی طرف سے لا کر دیا تھا۔ اب اس کی والدہ کو گزرے عرصہ ہو چلا تھا، اس نے خط کھولا، اس میں لکھا تھا ''آپ کا بیٹا انتہائی غبی (کند ذہن) اور ذہنی طور پر ناکارہ ہے، ہم اسے اب مزید سکول میں نہیں

رکھ سکتے، آپ اسے خود گھر میں پڑھائیں۔'' خط کی اصل عبارت پڑھ کر ایڈیسن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، وہ جی بھر کر رویا۔ اس رات ایڈیسن نے اپنی ڈائری میں یہ شاندار جملہ لکھا ''تھامس ایلوا ایڈیسن ایک ذہنی طور پر ناکارہ بچہ تھا مگر اس کی عظیم ماں نے اسے ایک جینیئس بنا دیا۔''

ہمیشہ کی طرح گزشتہ ہفتہ بھی طلبہ کے لیے دُنیاوی یومِ حشر تھا، پے در پے امتحانی نتائج نے طلبہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس بار بھی کم نمبر آنے پر کتنے ہی طالبعلم اپنے والدین کے غم و غصے کی تاب نہ لاتے ہوئے خودکشی کی آخری حد تک جا پہنچے۔ یاد رکھیں! خوداعتمادی کی دولت سے مالا مال تھامس ایڈیسن نے کرشمے کر دکھائے اور سکول سے نکالے جانے کے باوجود اُس کی ماں نے اسے اپنے سینے سے لگایا، بے پناہ پیار دیا، خوب پڑھایا اور محنت کر کے ایک بظاہر نالائق اور ناکارہ طالبعلم کو علم کے سمندر میں سے موتی چننا سکھائے، اسے خوداعتمادی کی دولت اور بے پناہ محبت کی طاقت سے اپنے عہد کا ایک عظیم سائنسدان بنا دیا۔ بطورِ والدین اس کہانی میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق اور کئی اہم سوال ہیں۔ کیا ہم میں اتنا صبر اور حوصلہ ہے کہ اگر ہمارے بچے کا کوئی رزلٹ اچھا نہ آئے تو ہم غصے سے سیخ پا ہو کر اُسے ذہنی، جسمانی اور جذباتی اذیت سے دوچار نہ کریں؟ اسے ضدی، نالائق، ناکارہ، کُند ذہن اور نکما جیسے القابات سے نہ نوازیں؟ یہ اٹل حقیقت ہے کہ ایک چھوٹی سی ناکامی پر ہمارے سخت ردِعمل سے بچے پر ہمیشہ کے لیے ایک ناکام شخص کا لیبل لگ جاتا ہے اور وہ زندگی بھر ناکامیوں، محرومیوں اور نفسیاتی الجھنوں کے گرداب میں پھنسا رہتا ہے۔ منفی ردِعمل سے وہ اپنی ذات میں مخفی گوہرِ نایاب ہرگز دریافت نہیں کر پاتا۔ لہٰذا بطور والدین ہمیں بھی تھامس ایڈیسن کی ماں سے سیکھنا چاہیے اور اپنے بچوں کو خوداعتمادی کی دولت سے مالا مال کر کے انھیں ایک جینیئس بنانے میں اپنا کردار بطریقِ احسن ادا کرنا چاہیے کیونکہ عظیم مائیں ہی عظیم قوم بناتی ہیں۔

□□□

اصل وی وی آئی پی کون؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برطانوی سامراج نے برِصغیر پاک وہند میں پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں قدم رکھا اور پھر آہستہ آہستہ تجارت کے ذریعے سیاست کے ایوانوں میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کر دیئے اور بالآخر 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانیہ کی ملکہ کوئین وکٹوریہ نے لارڈ وارن ہیسٹنگز کو اپنا پہلا گورنر جنرل نامزد کر کے برصغیر میں اپنی شہنشاہیت اور استعمار کو باقاعدہ رائج کر دیا۔ یوں یہ خطۂ ارضی، اس کے تمام وسائل اور مقامی باشندے گورنر جنرل یا وائسرائے کے کنٹرول میں دے دیئے گئے۔ اس سامراجی نظام کے فروغ، دوام اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اس کے واحد نمائندے گورنر جنرل کی شان وشوکت، جاہ وجلال، رعب ودبدبہ، غیظ وغضب اور طاقت کی نمائش کرنا لازمی ٹھہرا تا کہ وہ مطلق العنان طاقتور تاجِ برطانیہ کی حکومت یہاں قائم کر سکے اور کسی کو اس کے سامنے انکار، اختلاف یا بغاوت کا موقع نہ مل پائے۔ اگر ایسا امکان بھی پیدا ہو تو اس کا سر کچل دیا جائے۔ اس سارے عمل میں مقامی پولیس، انتظامیہ اور دیگر اداروں کو خطیر رقوم، تنخواہیں، مراعات، عالیشان بنگلے، پرشکوہ رہائش گاہیں، اعزازات، سرکاری پروٹوکول اور جاہ وحشم سے نوازا گیا تا کہ نہ صرف سرکاری افسران کا رعب ودبدبہ عوام میں مقبول

ہوجائے بلکہ تاجِ برطانیہ کے ساتھ غیر مشروط وفاداری اور تابعداری کو بھی ممکن بنایا جا سکے۔ یوں سرکاری افسران میں تکبر، رعونت اور مقامی لوگوں سے نفرت کے جذبات ایک فطری عمل بن گیا، اس طرح مقامی باشندے اپنے برطانوی آقاؤں کے سامنے محض کیڑے مکوڑے بنا دیئے گئے۔ 1947ء میں برطانوی سامراج کا سورج برصغیر میں غروب ہوا اور بھارت اور پاکستان کے روپ میں دو آزاد ممالک دُنیا کے نقشے پر ابھرے۔ بدقسمتی سے پاکستان کو آئینی، قانونی اور انتظامی ڈھانچہ برطانیہ سے ورثے میں ملا اور ایک آزاد ملک بننے کے باوجود یہاں پر طاقت اور اختیارات کی اندرونی کشمکش شروع ہوگئی۔ پھر یہ جنگ سیاست کے ایوانوں تک جا پہنچی۔ ابتدائی سالوں میں کئی حکومتیں بنیں اور ختم ہوئیں، وزرائے اعظم آتے اور جاتے رہے اور سیاسی عدم استحکام مسلسل پاکستان کا پیچھا کرتا رہا۔ اس چوہتر سالہ قومی تاریخ میں سول سروسز کو پاکستان کے آئین کے مطابق عوام دوست اور ذمہ دار بنانے کے لیے متعدد بار اصلاحات کے عمل سے گزارا گیا مگر بدقسمتی سے بیوروکریسی کی اکثریت خود کو بدلنے کے لیے تیار نظر نہیں آئی۔ یہاں پر ایک اہم اور دلچسپ حقیقت کا ذکر انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور وہ ہے تاجِ برطانیہ اور اس کے حکمرانوں کا اپنے ملک کے عوام کے ساتھ تعلق اور طرزِ حکمرانی جو آقا اور غلام کے بجائے عوام دوست تھا اور عوام کے سامنے مکمل طور پر جواب دہ بھی۔ وہاں پر حاکم اور رعایا والا معاملہ نہ تھا بلکہ سرکاری افسران اور عہدیداران اپنی عوام کی خدمت کو اپنی اولین ترجیح سمجھتے تھے اور انھیں سہولتیں اور بنیادی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے بےلوث خدمات سرانجام دینے کو اپنے لیے سندِ افتخار سمجھتے تھے مگر بدقسمتی سے غلام ریاستوں کے عوام کے ساتھ تاجِ برطانیہ کا طرزِ حکمرانی عدل وانصاف اور مساوات سمیت تمام انسانی حقوق کی نفی سے عبارت رہا۔ اس سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ پاکستانی حکمران آزادی کے بعد بھی اپنے عوام کو حقیقی انصاف، مساوات اور انسانی حقوق کی فراہمی یقینی نہ بنا سکے بلکہ گورے صاحب بہادر کی جگہ ''براؤن صاحبان'، اپنے ہی لوگوں کو غلام بنانے اور اُن کا استحصال کرنے میں جُت گئے اور یوں حکومت اور عوام کے درمیان عدم اعتمادی کی خلیج بڑھنے لگی اور عوام کا حکومتی

مشینری سے اعتماد اٹھنے لگا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

مگر ایسا بھی نہیں کہ پاکستان کے انتظامی اور سماجی اداروں میں سبھی کرپٹ، بدعنوان یا بددیانت تھے۔ جہاں سول بیوروکریسی میں کرپشن پروان چڑھی، بدعنوانی عام ہوئی اور عدم انصاف کی مثالیں فروغ پائیں، وہیں پر اس نظام میں موجود کرپٹ عناصر کے خلاف نفرت بھی دیکھنے میں آئی اور اس کے ردِعمل میں انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس کے ایسے درخشندہ ستارے بھی پاکستانی اُفق پر پوری آب وتاب سے چمکے جنھوں نے پیشہ ورانہ دیانت داری، منصبی ذمہ داری اور انسان دوستی کی فقید المثال داستانیں رقم کیں اور پاکستان کو اقوامِ عالم میں ایک باعزت مقام دلانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے ارضِ وطن کا نام روشن کیا اور اس مٹی کی وفا میں وہ قرض بھی چکا دیئے جو شاید واجب ہی نہ تھے۔ ان وفا شعار، دیانتدار اور ذمہ دار بیوروکریٹس نے اپنی ذات سے بہت آگے جا کر پاکستانی عوام کی خدمات کو اپنے لیے سندِ اعزاز سمجھا۔ انھی سجیلے جوانوں اور قابلِ فخر بیٹوں میں سے ایک عظیم سپوت ناصر خان دُرانی تھے جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ اُٹھا ہے۔

وہ تقریباً پینتیس سال سے زائد عرصہ تک پولیس سروس آف پاکستان کے ماتھے کا جھومر رہے۔ انھوں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے 1982ء میں بطور اے ایس پی اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور روزِ اول سے ہی میرٹ، حق گوئی، راست بازی، دیانت داری اور عوام دوستی کا پیکر بن کر دوسروں کے لیے قابلِ رشک اور قابلِ تقلید نمونہ بن گئے۔ جھنگ اور سیالکوٹ سمیت پنجاب کے آٹھ مشکل اضلاع میں پولیس کی کمانڈ سنبھالی اور مجرموں کی سرکوبی اور جرائم کا قلع قمع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ ہمیشہ مظلوم، غریب اور بے بس عوام کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کو مذہبی فریضے جتنی اہمیت دیتے تھے اور بڑے سے بڑے سیاسی دباؤ کو بالائے طاق رکھ کر عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتے تھے۔ 1998ء میں پنجاب کے تھانہ کلچر کو تبدیل کرنے اور اسے عوام دوست بنانے کے لیے جب 300 پڑھے لکھے انسپکٹرز کو پنجاب پبلک سروس کمیشن کے

ذریعے بھرتی کا عمل مکمل ہوا اور اُن کی جدید خطوط پر پولیس کالج سہالہ میں تربیت کا مرحلہ آیا تو اس کورس کے نگران کے طور پر جناب ناصر خان درانی کے نام پر ہی اتفاق کیا گیا جنھوں نے پوری تندہی اور پیشہ ورانہ مہارت سے ان افسران کی مثالی تعلیم و تربیت کی۔ بطور ایس ایس پی اسلام آباد اور ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ پنجاب بھی آپ نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ 2013ء میں جب خیبر پختونخوا میں پی ٹی آئی کی حکومت وجود میں آئی تو صوبے میں دہشت گردی کے خاتمے اور صوبائی پولیس کو صحیح معنوں میں عوام دوست بنانے کے لیے ایک مرتبہ پھر جناب ناصر درانی ہی کا انتخاب کیا گیا اور آپ نے تین سال سے زائد عرصہ میں خیبر پختونخوا کی پولیس میں اَن گنت اصلاحات کیں، اس کے اندر موجود کالی بھیڑوں کو سخت سزائیں دے کر عبرت کا نشان بنایا اور یوں صوبائی پولیس ایک رول ماڈل بن کر ابھری جس کی پیشہ ورانہ خدمات اور عوام دوستی کی مثالیں عام ہوئیں۔ دُرانی صاحب نے اپنے سارے کیریئر میں غریب، بے بس اور مظلوم افراد سے بے پناہ محبت کی اور اُن کے لیے ہر ظالم، سفاک اور طاقتور کا مقابلہ کیا۔

گزشتہ دنوں وہ مہلک وبا کورونا کی تیسری لہر کا شکار ہو کر دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو سوشل میڈیا پر اُن کی بطور آئی جی الوداعی تقریر کا ایک حصہ وائرل ہوا جس میں وہ اپنے افسران اور ملازمین کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ مظلوم اور بے کس کا ساتھ دینا چاہیے اور وی آئی پی کے خوف اور دباؤ سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وی آئی پی تو محض اُن کا تبادلہ کرے گا یا کروا دے گا جبکہ اصل وی وی آئی پی وہ مظلوم اور بظاہر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے سائل کے روپ میں سامنے آتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کا کارڈ ہوتا ہے اور اس کا رابطہ ”گرین لائن“ سے براہِ راست ربِ کائنات سے جڑا ہوتا ہے اور اگر اس نے ہماری شکایت ربِ دو جہاں سے کر دی تو ہمارے پلے کچھ بھی نہیں رہنا۔ پاکستان میں سرکاری پروٹوکول کے مطابق چند اعلیٰ ترین عہدیداران ہی وی وی آئی پی ہیں مگر دُرانی صاحب نے بڑی عمدگی سے اصل وی وی آئی پی سے متعارف کرایا۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی اس عظیم شخصیت کے زیرِ تربیت رہا اور اب اُن کے بتائے

ہوئے سنہری اصولوں کی عملداری کا سفر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ناصر خان دُرانی (مرحوم) کو اپنے جوارِ رحمت میں خاص مقام عطا فرمائے اور ان کے خاندان اور چاہنے والوں کو صبرِ جمیل کی نعمت سے سرفراز کرے، آمین!

❏❏❏
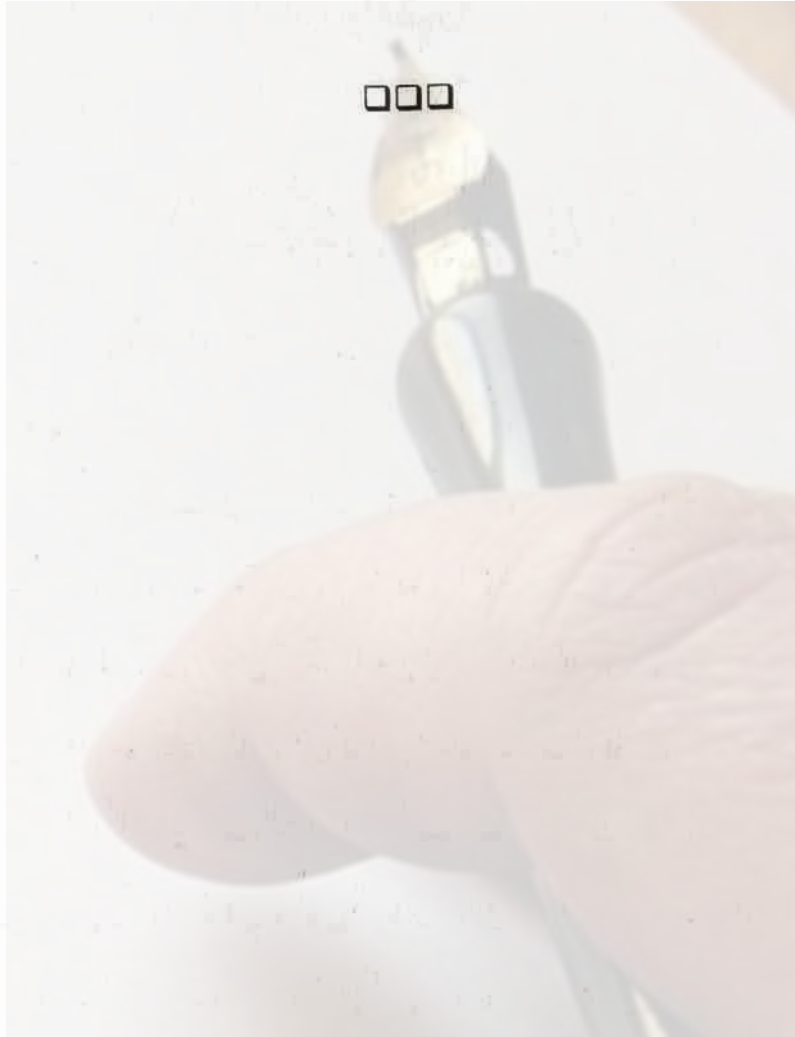
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم!

تھامس کارلائل نے سچ کہا تھا کہ تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح عمری ہے۔ تاریخ کے صفحات ہمیشہ ہیروز کے کارہائے نمایاں کو اپنی زینت بنانا پسند کرتے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبہ جات میں خداداد صلاحیتوں سے مالا مال منفرد کرداروں کی بدولت ارتقا، ترقی اور وسعت کے دروازے کھلتے ہیں۔ شعبۂ طب سے لے کر جراحی تک، سیاست سے لے کر تجارت تک، سائنس، تحقیق اور ترویج سے لے کر فنونِ لطیفہ تک، تعلیم و تدریس سے لے کر کھیل کے میدانوں تک ہمیں یہ مشاہیر دوسروں سے نمایاں نظر آتے ہیں اور لوحِ قرطاس پر ان کا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ان کے کارنامے انسانیت کے لیے آسانیوں کی نئی راہیں متعین کرتا ہیں۔ اندھیروں میں روشنی کے مینار یہ لوگ امید، آرزو اور خوشی کا استعارہ بن جاتے ہیں اور اپنی زندگی دوسروں کے نام وقف کر کے اپنا وقت، صلاحیتیں اور تمام تر توانائیاں بروئے کار لا کر حالات کا رخ موڑ دیتے ہیں، یہ ترقی و خوشحالی کی نئی سمت متعین کرتے ہیں اور یوں دوسروں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال بن جاتے ہیں۔ یہ ہیروز کئی مرتبہ تنازعات کی گھاٹیوں سے گزرتے ہیں، دشنام طرازی کے تیران کا سینہ چھلنی کرتے ہیں اور زبان درازی کے پے در پے وار ان کی روح پر گہرے گھاؤ لگاتے ہیں مگر ان کی

عظمت کا ستارہ اوجِ ثریا کے اس پار چمکتا رہتا ہے۔ یہ مرتے نہیں بلکہ موت سے بھی ان کو دوام نصیب ہوتا ہے اور تاریخ انھیں اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کر دیتی ہے۔

پاکستان کا وہ قابلِ تحسین بیٹا جس نے یورپ کی چکا چوند روشنیاں چھوڑ کر اپنی ارضِ مقدس کے اندھیروں کے خاتمے کا عزمِ صمیم کیا، جس نے اغیار کی ملازمت کو ٹھوکر مار کر اپنے دیس کی خدمت کو ترجیح دی، جس نے پھولوں کی سرزمین ہالینڈ کی آسائشوں کو چھوڑ کر کہوٹہ کی سنگلاخ وادی میں کانٹوں سے دوستی کر لی، جس نے اپنی ذاتی آسودگی اور خوشحالی کے سنہرے خواب پاکستان کے دفاع کی مضبوطی پر قربان کر دیئے اور پاکستان میں یورینیم کی افزودگی پر مبنی ایٹمی ریسرچ کی بنیاد ڈالی اور اس وقت کے وزیر اعظم کو خط لکھ کر اپنی خدمات کی پیشکش کی۔ وطن واپس آ کر اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے شب و روز محنت و مشقت کر کے بالآخر دس سال کی قلیل مدت میں پاکستان کو ایٹمی قوت بنا ڈالا۔ وفا کا پیکر اور قومی غیرت سے سرشار یہ عظیم سپوت مشرقی پاکستان کے سانحہ پر بہت رنجیدہ ہوا۔ ملکی سالمیت پر سنگین حملوں نے اس غیور بیٹے کے دل پر گھاؤ لگائے، پھر جب 1974ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکے کیے تو ہالینڈ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے والے ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دشمن کی ریشہ دوانیوں اور مکاریوں کے سامنے خود سینہ سپر ہونے کا فیصلہ کر لیا اور وطن واپسی کا ارادہ باندھ لیا۔ اس عظیم ایٹمی سائنسدان نے ملک کو ایٹمی قوت بنا کر اتنا بڑا احسان کیا کہ پوری پاکستانی قوم نے اسے محسنِ پاکستان کے خطاب سے نواز دیا۔ یہ احسان قیامت تک ہم تمام پاکستانی مل کر بھی شاید نہ اتار سکیں اور نہ اس کا بدلہ دے پائیں۔ ایسے غیور بیٹے صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور کئی کئی نسلیں ان کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری کا ماتم کرتی ہے، تب کہیں جا کر چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ 1948ء، 1965ء اور 1971ء میں جنگیں مسلط کرنے کے بعد ہمارے ہمسایہ ملک نے پاکستان پر جب چوتھی مرتبہ پھر چڑھ دوڑنے کا ارادہ کیا اور 1980ء کی دہائی میں ہماری سرحدوں پر اپنی فوجیں لا کھڑی کیں تو صدر ضیاء الحق بھارت میں

ہونے والا پاکستانی کرکٹ ٹیم کا ایک میچ دیکھنے اچانک سٹیڈیم جا پہنچے جس پر بھارتی وزیر اعظم کو بادلِ نخواستہ اس دورے کو نہ صرف قبول کرنا پڑا بلکہ چند گھنٹے سٹیڈیم میں اپنے مہمان کے ساتھ بھی گزارنا پڑے۔ واپسی پر جب بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے صدرِ پاکستان کی طرف مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو صدر ضیا نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں دبا کر ایک دبنگ اور دوٹوک پیغام دیا کہ جس ایٹمی طاقت کا تمھیں گھمنڈ ہے، وہ ہم نے بھی حاصل کر لی ہے اور اگر تم نے اگلے چند روز میں سرحدوں سے فوجیں نہ ہٹائیں تو بھارت کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ بھارتی وزیر اعظم یہ سن کر شدید پریشانی میں مبتلا ہو گئے اور فوراً اپنی فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد آج تک بھارت پاکستان پر چڑھائی کے اپنے ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس نے کبھی پاکستان کی دفاعی صلاحیت کو آزمانے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ عظیم وطن تاابد سلامتی و بقا کی ضامن اپنی ایٹمی طاقت پر نازاں رہے گا اور یوں ہماری آنے والی نسلیں بھی محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے احسانِ عظیم کی مقروض رہیں گی۔

میں ابھی یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ آفس کا دروازہ کھلا اور میرے محسن و مربی جناب پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی اپنے شاگردِ خاص جیدی میاں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ محسنِ پاکستان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے خصوصی طور پر اسلام آباد آئے تھے۔ جیدی میاں کی نظریں میرے مضمون پر پڑیں تو غصے سے لال پیلا ہونے لگا۔ وہ محسنِ پاکستان کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک اور الزامات پر گفتگو کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ ہم محسن کش قوم ہیں اور ہم نے ہمیشہ اپنے مشاہیر اور محسنوں کے ساتھ دشمنوں والا سلوک کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ملک کی محبت، خدمت اور وفا کے صلے میں ہم نے انھیں غدارِ وطن قرار دینے کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر ایک غیر ملکی طیارہ آ کھڑا ہوا اور ہمارے اُس وقت کے حکمران ان کو امریکا کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئے۔ مگر ایک غیور وزیر اعظم اور بلوچ سردار نے اپنی کابینہ کو

اعتماد میں لے کر اس ناپاک منصوبے کو خاک میں ملا دیا اور اپنے عہدے کی قربانی دینا اپنے لیے سعادت سمجھا۔ جیدی میاں رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا، مزید کہنے لگا کہ دو دہائیوں سے محسنِ پاکستان کو اپنے گھر تک محدود کر دیا گیا تھا، انھیں ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار رکھا گیا۔ بیرونِ ملک موجود ان کے اثاثہ جات سے متعلق بے بنیاد کہانیاں گھڑی گئیں حالانکہ اُن کا کل اثاثہ پاکستان اور پاکستان سے بے لوث محبت تھی۔

پھر باباجی گفتگو کو آگے بڑھانے لگے۔ فرمایا کہ محسنِ پاکستان پر الزامات محض ایک مطلق العنان حکمران نے لگائے اور اس کے چند درباریوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی مگر وہ اپنے مذموم مقاصد میں بری طرح ناکام ہوئے۔ فخرِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر کی وفات پر پوری قوم بلکہ تمام دُنیا کے مسلمانوں نے سوگ منایا، شہر شہر غائبانہ جنازے پڑھے، گھر گھر قرآن خوانی کی گئی اور دعائیں مانگی گئیں۔ پاکستانی پرچم سرنگوں رہا اور آپ کو پورے سرکاری پروٹوکول اور اعزازات کے ساتھ دفن کیا گیا۔ یہ سب مہرِ وفا کے اس پیکر کی پاکستانیوں کی دلوں میں موجزن لازوال محبت اور عقیدت کی گواہی ہے۔ باباجی نے گفتگو سمیٹتے ہوئے جیدی میاں کو حوصلہ دیا کہ آج جس طرح انھوں نے محسنِ پاکستان آخری آرام گاہ پر لوگوں کا جمِ غفیر دیکھا ہے اور لوگوں کو قبر سے لپٹ کر روتے پایا ہے، یہ اس عظیم سپوت کی عظمت کا کرشمہ ہے۔ یہ شعر یقیناً شاد عظیم آبادی نے محسنِ پاکستان کے لیے ہی لکھا ہوگا اور اگر ان کی قبر کے کتبے پر نقش کر دیا جائے تو نہایت موزوں ہوگا...

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

□□□

خدا ناراض ہے شاید!

گزشتہ دو سال سے پوری دُنیا کورونا وبا کے خوفناک حصار میں ہے، چاروں طرف موت کے ڈیرے اور خوف کے بسیرے ہیں۔ سائنسی ترقی، معاشی استحکام اور میڈیکل سائنس میں حاصل کی گئی بے پناہ کامیابیوں کے تمام دعوے ایک غیر مرئی جرثومے کے سامنے بے بس ثابت ہوئے ہیں۔ امریکا سمیت یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک بھی کورونا کے مقابلے میں ریت کی دیوار ثابت ہوئے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے اعداد وشمار کے مطابق اب تک دُنیا میں سولہ کروڑ چھپن لاکھ سے زائد افراد کورونا کا شکار ہوئے جن میں سے لگ بھگ چونتیس لاکھ چونتیس ہزار بدقسمت اس خونی وبا کے ہاتھوں لقمہ اجل بن گئے۔ آج کل اس کی نئی لہر نے کہرام بپا کر رکھا ہے اور آئے روز نئے کیسز میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد اپنی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔ بیش قیمت انسانی جانوں کے زیاں کے علاوہ عالمی معیشت بھی اس سے بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ لاکھوں لوگ اپنا روزگار کھو چکے، کاروبار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جبکہ صنعتی ترقی کا پہیہ رک چکا ہے۔ نقل وحمل، سیر وسیاحت، عالمی تجارت اور ان سے جڑے ہزاروں کاروبار شدید متاثر ہوئے ہیں۔ اب دُنیا میں غربت، افلاس، بیروزگاری اور مہنگائی تیزی سے بڑھنے لگی

ہے۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کے ذمہ داران پہلے ہی متنبہ کر چکے ہیں کہ کورونا کی وجہ سے عالمی معیشت میں پیدا ہونے والے بحران کے سبب غربت کی لکیر سے نیچے ایک ارب بیاسی کروڑ افراد کو رات کا کھانا میسر نہیں اور اس تعداد میں مزید اضافہ ہونے کے قوی خدشات موجود ہیں۔

وبا کے آغاز سے ہی اس کے بارے میں مختلف آرا اور متضاد نظریات وجود میں آئے۔ کسی نے اسے چین اور امریکا کے درمیان جاری سرد جنگ میں استعمال ہونے والے بائیولوجیکل ہتھیار سے موسوم کیا تو کچھ لوگ اسے دُنیا کی آبادی کو کنٹرول کرنے کی عالمی سازش قرار دینے لگے۔ بل گیٹس کے نام پر بہت بحث کی گئی اور اس ضمن میں اسے مرکزی کردار ٹھہرایا گیا۔ مذہبی طبقات کی جانب سے اسے خدائی آفت قرار دیا گیا جبکہ اس وبا کو انسان کی حرص و ہوس، مادہ پرستی، انسانی استحصال اور قدرتی وسائل کے اندھا دھند استعمال کے سبب ماحولیاتی تغیر کا شاخسانہ بھی سمجھا گیا۔ یہ بات درست ہے کہ 1990ء کی دہائی میں، سرد جنگ میں سوویت یونین کی شکست کے بعد، امریکا ہی دُنیا کی واحد سپر پاور بن کے ابھرا اور کمیونزم کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام ہی عالمی معیشت کا مرکزی نکتہ بن گیا مگر یہ حقیقت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ کس طرح جمہوریت کے نام پر تیسری دُنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ من پسند افراد کو اقتدار میں لا کر وہاں کے وسائل پر قبضہ جمایا گیا اور انسانی حقوق کی بالا دستی کے لبادے میں انسانیت کی تذلیل کی گئی۔ جنگ وجدل کا بازار گرم کر کے لاکھوں لوگوں کو ناحق قتل کیا گیا۔ براعظم افریقہ کے وسائل کی لوٹ مار کے لیے وہاں کی منتخب حکومتوں کو گرایا گیا اور اپنی مرضی کے حکمران مسلط کر کے بدعنوان اور کرپٹ عناصر کی سرپرستی کی گئی۔ غربت اور پسماندگی کو فروغ دے کر عام آدمی کی زندگی اجیرن بنائی گئی۔ مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کے نام پر خونریزی کی گئی، قتلِ عام ہوا اور عراق سے لے کر شام تک اور لیبیا سے لے کر مصر تک، مسلمانوں پر ظلم اور بربریت کے پہاڑ توڑے گئے۔ اکثر ممالک کی قیادت کو نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت کی سرپرستی کر کے کشمیریوں کو گزشتہ ساڑھے اکیس ماہ سے اپنے گھروں میں قید کر کے اسّی لاکھ آبادی

پر مشتمل اس خطے کو دُنیا کی سب سے بڑی جیل بنا دیا گیا ہے۔ یوں عالمی اداروں اور بین الاقوامی طاقت کے مراکز کی ناک کے نیچے ظلم وستم کی ایک شرمناک داستان رقم کی جا رہی ہے اور مودی سرکار ڈھٹائی کے ساتھ معصوم اور نہتے کشمیریوں پر درندگی کے نئے وار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اقوامِ متحدہ، یورپی یونین اور انسانی حقوق کے تمام ادارے خاموش تماشائی بن کر کشمیر جنت نظیر کو خون میں ڈوبتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ انسانیت کی تذلیل اور انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثال ہے مگر طاقت کے سب مراکز خاموش ہیں۔ یہی حال عالمی معیشت، تجارتی معاملات اور بین الاقوامی سطح پر لوٹ کھسوٹ پر مبنی عدم مساوات پر چلنے والے معاشی نظام کا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک عالمی استعمار اور معاشی استحصال کے جدید نمائندے ہیں اور ان کے ذریعے تیسری دُنیا کے غریب اور ترقی پذیر ممالک کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا جاتا ہے اور قرضوں کی آڑ میں ان پر سخت ترین شرائط عائد کر کے معاشی تباہی اور عوام کی بدحالی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مذکورہ دونوں عالمی ادارے دُنیا میں اپنا سکہ رائج کرنے اور معاشی استعمار کو فروغ دینے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

چند دہائیاں قبل تک عالمی وسائل اور دولت کے اسّی فیصد ذخائر پر بیس فیصد افراد کا قبضہ تھا مگر پھر مادہ پرستی، منافع خوری اور معاشی عدم مساوات کے طفیل امیر امیر تر ہوتا گیا اور غریب غربت کی لکیر سے بھی کافی نیچے پہنچ گیا لہٰذا اب محض ایک فیصد آبادی کے پاس دُنیا کے اسّی فیصد وسائل اور ذرائع آمدن ہیں جبکہ باقی ننانوے فیصد محض 20 فیصد وسائل کے حصول کے لیے ہمہ وقت حالتِ جنگ میں ہیں۔ اس طرح خدا کی زمین پر خدا ہی کے پیدا کردہ وسائل پر ایک اقلیت قابض بن کر اپنے خونیں پنجے گاڑ چکی ہے اور بے بسی، بے کسی اور افلاس جیسے عفریت دُنیا کے کروڑوں انسانوں کو بیماری، بے چارگی اور بیروزگاری کے نہ ٹوٹنے والے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ عالمی سطح پر جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام اور انسانی حقوق کے علمبردار ہی دراصل دُنیا میں امنِ عامہ کو تہ و بالا کرنے کے درپے ہیں۔ یہ خود انسانی حقوق کی دھجیاں بکھیرنے والے اور

انسانیت کی بدترین تذلیل کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں مادی ترقی، صنعتی انقلاب، سائنسی جدت اور معاشی ترقی کے تمام دعوؤں کے باوجود عام انسان دو وقت کی روٹی کے لیے ترس گیا ہے اور آج بھی قابلِ علاج بیماریوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جانے پر مجبور ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں موجود معاشی ناہمواریاں، عدم انصاف، بڑھتی ہوئی غربت، مہنگائی اور بیروزگاری بھی اس عالمی منظرنامے سے مختلف نہیں ہے۔ یہاں پر بھی اشرافیہ نظام کو اپنے شکنجے میں پوری طرح جکڑ چکی ہے اور آبادی کی ایک قلیل تعداد وسائل اور دولت پر اپنا پورا تصرف رکھتی ہے۔ طاقتور کے لیے پیمانے اور ہیں جبکہ عام آدمی معمولی سے جرم کی پاداش میں تمام زندگی کال کوٹھری میں گزارنے پر مجبور ہے۔ غربت اور افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے روز بدنصیب باپ اپنے بچوں کو کبھی کسی نہر میں پھینکتا نظر آتا ہے تو کبھی اپنے ہاتھوں اپنے جان سے پیاروں کو موت کی آغوش میں سُلا کر خودکشی کرتا ملتا ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں سے ان اندوہناک واقعات میں تیزی دیکھنے کو ملی ہے اور کورونا کے باعث روزگار محدود ہونے کے باعث مزید دلخراش واقعات بھی سامنے آنے کا خدشہ ہے۔

میں یہ سطور لکھ رہا تھا تو اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میرے محسن و مربی پروفیسر رحمت علی المعروف بابا جی نہایت دل گرفتہ انداز میں مخاطب ہوئے ''اسد میاں! میں نے اس دفعہ عید نہیں منائی کیونکہ دُنیا بھر میں کورونا موت بانٹ رہا ہے اور وطنِ عزیز میں بھی لگ بھگ بیس ہزار افراد عدم سدھار چکے ہیں، مزید پانچ ہزار زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں اور ہر روز تقریباً چار ہزار افراد اس موذی وبا کا شکار بن رہے ہیں۔ ہر طرف اداسی ہے، بے چینی ہے، خوف ہے۔ نفسیاتی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف کشمیر میں مودی سرکار کی دہشت گردی تو ادھر فلسطین پر اسرائیل کی لشکرکشی، درندگی اور نہتے نمازیوں پر پے درپے خونیں وار، کابل میں معصوم بچوں کا قتلِ عام اور پاکستان میں غربت اور بیروزگاری سے تنگ آ کر بچوں سمیت خودکشی کے کربناک واقعات کی موجودگی میں کیسے کوئی خوشی منائی جا سکتی ہے؟ ظلم و بربریت، ناانصافی، عدم مساوات اور

دہشت گردی دراصل ربِ کائنات کے غیظ وغضب کو للکارنے کے مترادف ہے اور یہ کورونا وبا مکافاتِ عمل کی ایک چھوٹی سی علامت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم سے خدا ناراض ہے شاید!'' اُن کی آواز بھرا گئی اور فون خاموش ہو گیا۔

❑❑❑
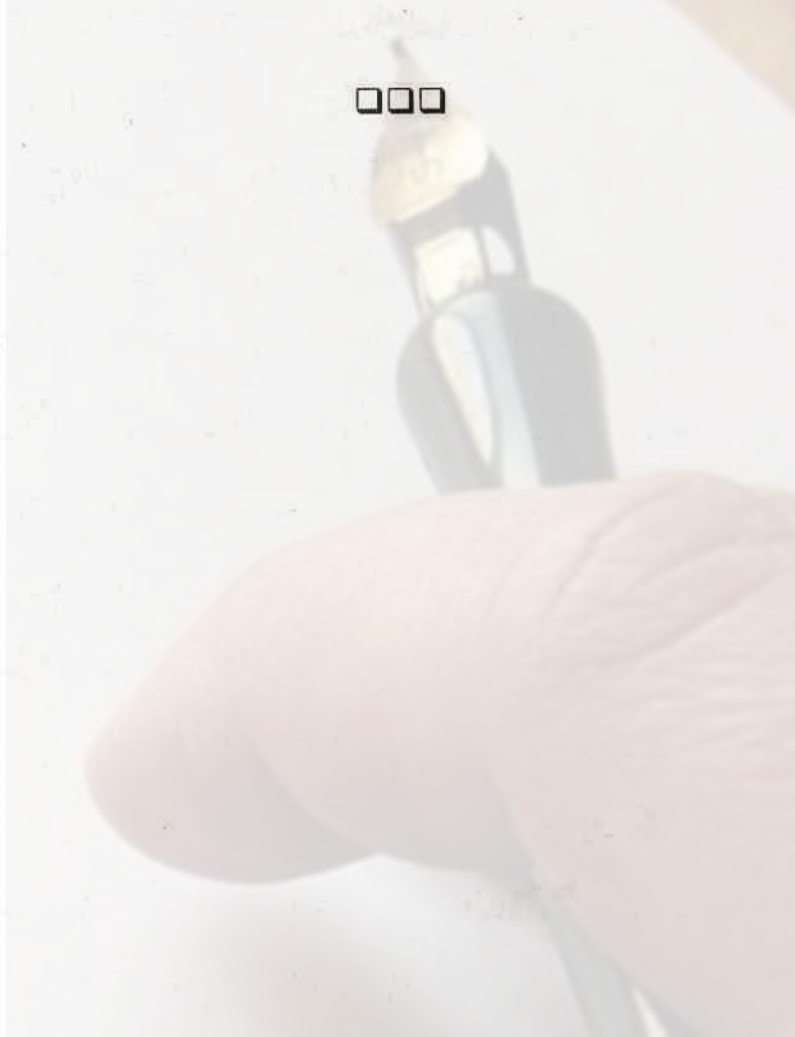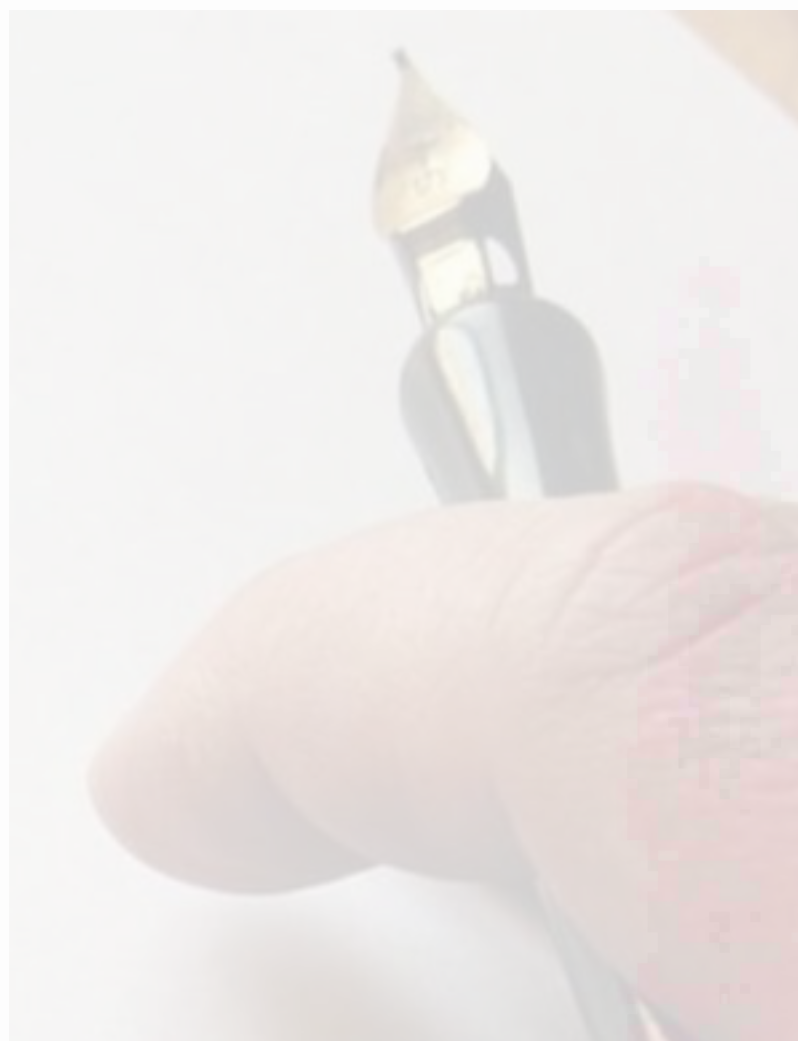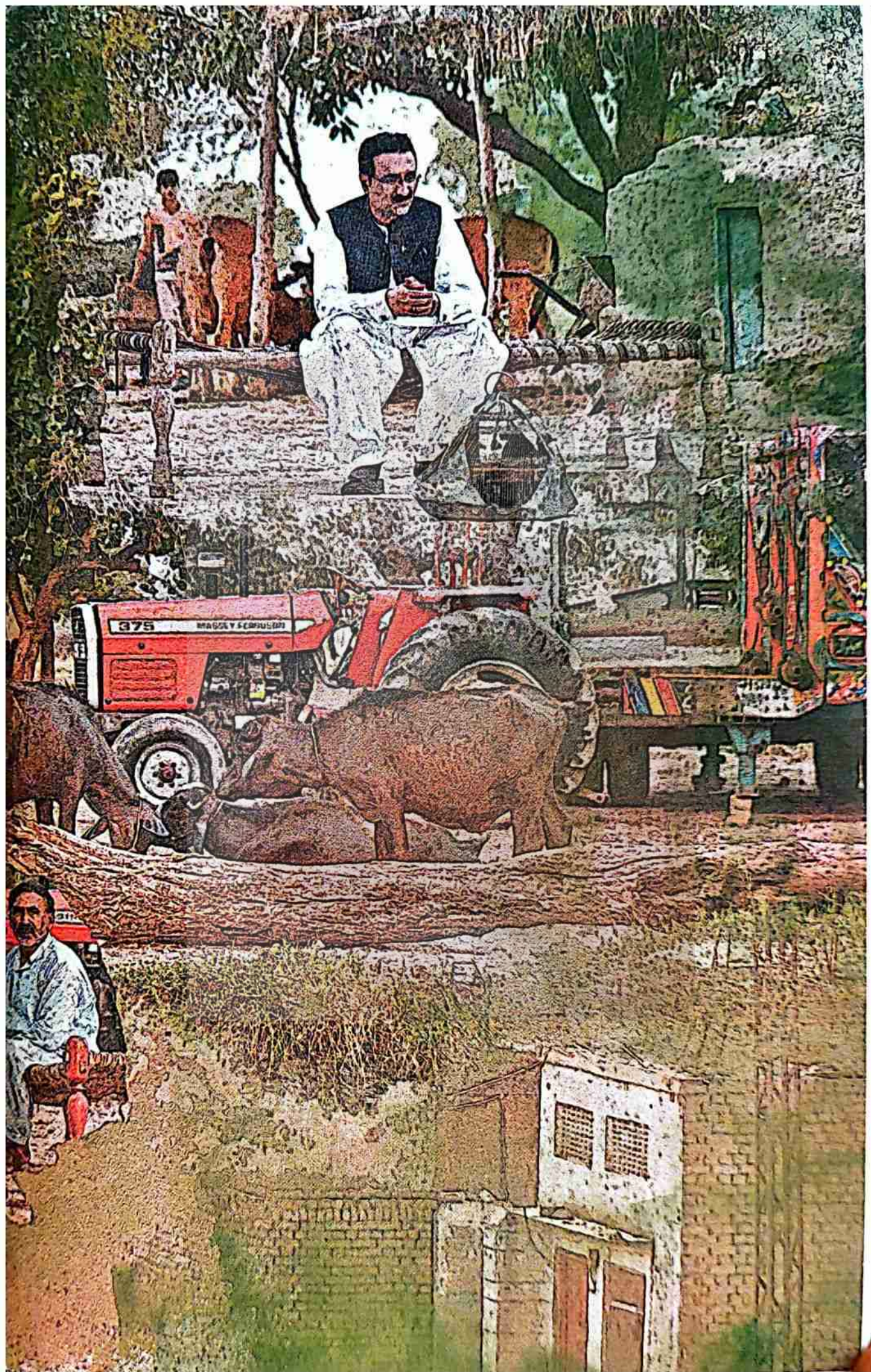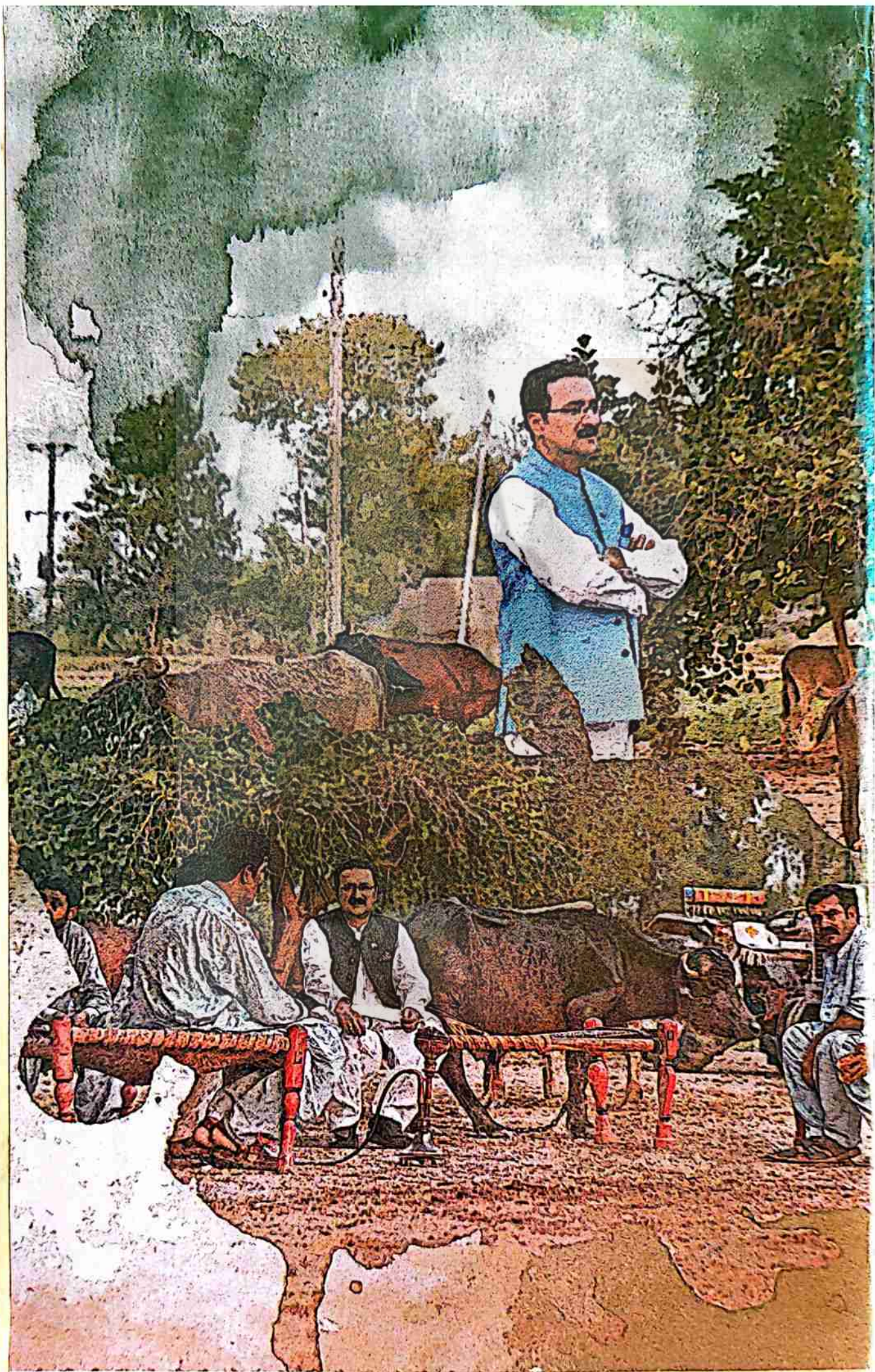
اسد طاہر جپہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے قلم کار بھی ہیں۔ گاؤں کے سکول میں ٹاٹ پہ بیٹھ کر پڑھے اور گورنمنٹ کالج سے ہوتے ہوئے سول سروس تک پہنچے اور اپنے والد کے خواب کو تعبیر دے دی۔ ان کے والدِ گرامی پروفیسر محمد انور خان اردو اور فارسی پہ دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے غالب اور اقبال سے ان کو اس طرح متعارف کرایا کہ ستاروں پہ کمند ڈالنے کی خواہش ان کے دل میں موجزن ہوگئی۔ وہ ہر نوجوان کے دل کو یہی لگن لگانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کے سب اہلِ وطن دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کریں۔ انھیں یقین ہے کہ نیا زمانہ اور نئے صبح و شام ہمارے انتظار میں ہیں، ضرورت بس کمرِ ہمت کسنے اور قدم بڑھانے کی ہے۔ ان کی آواز سنیے اور ان کے الفاظ پڑھیے، جو دل سے نکلتے ہیں اور دل میں اتر جاتے ہیں۔

مجیب الرحمٰن شامی

دیہاتی بابو پڑھ کر میں برسوں پیچھے چلا گیا ہوں، چشمِ تصور مجھے گاؤں میں لے گئی ہے۔ کیا زمانہ تھا، مینہ برستا تھا تو مٹی خوشبو دیتی تھی۔ یہ سہانی مہک سانسوں کے راستے جسموں میں اتر جاتی اور روحوں کو تازہ کر دیتی تھی۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ دیہی سکولوں میں جانے والے بچے بیٹھنے کے لیے گھر سے محض بوری لے کر جاتے تھے۔ پرائمری سکول کے بعد مڈل اور ہائی سکول کے لیے بچوں کو میلوں چلنا پڑتا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور کے دیہاتی سکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ پوری لگن سے پڑھاتے تھے، شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں تعلیم تجارت نہیں بنی تھی، اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے شاگرد نامور ہوں۔ افسوس کہ آج کل اس خوبصورت جذبے کی جگہ دولت کی رغبت نے لے لی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں دیہی پس منظر کے حامل افراد کی عادات واطوار اور رویے شہری لوگوں سے قدرے مختلف ہیں۔ دیہاتی بابوؤں کے رویوں میں خالصتاً محبت بولتی ہے۔
اسد طاہر جپہ کہنے کو بابو ہیں مگر ان کے اندر ایک خدا ترس انسان چھپا ہوا ہے۔ وہ بڑے عہدوں پر رہ کر بھی مٹی کی محبت نہیں بھولے، ان کی تحریروں میں بھی دھرتی کی محبت بولتی ہے۔ ''دیہاتی بابو'' کو جب آپ پڑھنا شروع کرتے ہیں تو دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور آخری صفحہ پڑھ لینے کے بعد آپ گہری سوچوں میں اتر جاتے ہیں اور سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

مظہر برلاس

اسد طاہر کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن ''جپّہ'' کے اضافے پر یہ نام کچھ عجیب سا لگتا ہے سو مجھے بھی لگا لیکن جب مسودہ پڑھنا شروع کیا تو وہ کسی ''جن جپھے'' سے کم نہ تھا جسے آپ جپّہ کا جپھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نہ لمبا لکھتا ہوں نہ لمبی بات کر سکتا ہوں۔ مختصر ترین عرض یہ کہ اسد طاہر جپّہ کی تحریروں پہ گہری نظر ڈالیں اور پھر مجھے بھی ضرور مطلع فرمائیں کہ کہیں آپ کو بھی جپّہ کی تحریر نے یونہی تو نہیں جکڑ پکڑ لیا جیسے مجھے، کہ بچپن میں پڑھا تھا.... Told sweet-Untold sweeter۔

حسن نثار

پاکستان میں سول اور ملٹری افسران اچھے اچھے ادیب بن کر ابھرے اور نام کمایا۔ کئی نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ اس خوبصورت فہرست میں اب نیا نام اسد طاہر جپہ کا ہے۔ انھیں پڑھ کر آپ کو ایک نیا پن، ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دھرتی سے جڑے انسان ہیں۔ ہر زمین زاد کی طرح ان کے اندر سے بھی اپنی مٹی سے محبت گہری ہے۔ کوئی بناوٹ نہیں، کوئی خبطِ عظمت نہیں، کوئی پروٹوکول نہیں۔ جیسے ہیں ویسے ہی خود کو پیش کیا۔ خود پر میک اپ نہیں کیا۔ سیلف میڈ لوگوں پر دو اثرات ہوتے ہیں۔ کامیابی ملنے کے بعد وہ ترش اور سخت دل ہو جاتے ہیں کہ جو زمانے نے ان کے ساتھ کیا وہ اب باقی لوگ بھی بھگتیں یا پھر بہت ہمدرد اور مہربان کہ جو دُکھ انھوں نے دیکھے وہ اور لوگ نہ دیکھیں۔ جپہ صاحب کو پڑھ کر لگتا ہے، وقت کے حادثات اور تھپیڑوں نے انھیں سنگ دل نہیں بلکہ ایک مہربان، انکسار پسند اور حساس انسان بنایا اور یہی ان کی ماں کی بے پناہ قربانیوں کا صلہ ہے۔ اسی کتاب میں ایک ماں کی مسلسل جدوجہد کی کہانی آپ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکے گی جو اپنی اوائل جوانی میں ہی اپنے بچوں کے ساتھ مل کر ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے اکیلی رہ گئی تھی۔ اب تک آپ نے سرکاری بابوز کی تحریروں کو پڑھا ہوگا، اب ''دیہاتی بابُو'' کو پڑھیں۔ ''قرض چار پھولوں کا'' پڑھ کر مجھے لگا میں اپنی کہانی پڑھ رہا ہوں اور یہ احساس گہرا ہوا کہ ہم دیہاتیوں کے دُکھ، سکھ اور جدوجہد کی کہانیاں ماؤں کی طرح سانجھی ہیں۔

رؤف کلاسرا

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0321-5440882
Jhelum, Pakistan